اسلام کی اجتہادی روایت کا ترجمان
سہ ماہی
اسلام آباد
اجتہاد
۲
دسمبر ۲۰۰۷
اسلامی نظریاتی کونسل
اسلام اور مغرب
علمی رجحانات • اہم تصانیف • ثقافتی پہلو • سیاسی تنازعات • یورو اسلام • فقہی مباحث
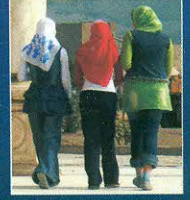
اسلام اور مغرب کے رابطوں میں نظریاتی اور جغرافیائی سرحدیں بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں۔ جہاں مغرب میں اسلام اپنے وجود کا احساس دلا رہا ہے وہاں اسلام بھی مغرب سے نامانوس نہیں۔ اس دور میں جہاں مغربی دانشوروں نے اسلام کو خطرہ قرار دیتے ہوئے، اسلام اور مغرب کے مابین تصادم کی چیخ و پکار سے، اسلام اور مغرب میں منافرت پھیلانے کی کوشش کی ہے وہاں بعض مسلمانوں نے بھی مغرب کے خلاف دہائی دے رکھی ہے۔ اس صورت حال نے اسلام اور مغرب کو ایک دوسرے کے خلاف صف آراء کر دیا ہے۔ ابلاغ کی دنیا میں آنے والے انقلاب نے مسلمانوں کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ اسلام کے فکری، دینی اور ثقافتی پیغام کو انسانیت کے مشترکہ سرمایہ کے طور پر پیش کریں اور مغرب جو روز بروز دین کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار سے بھی بیزار ہوتا نظر آ رہا ہے اسے اسلام کی انسانی اقدار کی دعوت دیں۔

شمارا : ۲ دسمبر ۲۰۰۷ء

ناشر

ریاض الرحمٰن، سیکرٹری اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد

ڈیزائن و پیشکش

شاہد اعوان industree
phulalian@gmail.com

زیر اہتمام

۴۶، اتاترک ایونیو، جی۔۵/۲، اسلام آباد
فون: ۰۵۱-۹۲۰۵۶۵۲ فیکس: ۰۵۱-۹۲۱۷۳۸۱
ای میل: contact@cii.gov.pk
ویب سائٹ: www.cii.gov.pk

تقدیم

ڈاکٹر محمد خالد مسعود

رسالہ اجتہاد کے پہلے شمارے کو جو پذیرائی ملی ہے، اس سے ہمارا یقین اور پختہ ہو گیا ہے کہ پاکستانی معاشرہ مذہبی تنگ نظری، فرقہ واریت، انتہا پسندی اور باہمی منافرت کے رویوں سے تنگ آچکا ہے۔ دینی مسائل پر کھل کر بات چیت کی ضرورت کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔ عوام شرعی اور دینی مسائل پر بحث میں شریک رہنا چاہتے ہیں۔ اسلامی قانون سازی کے عمل میں وسیع تر مشاورت کا احساس جاگ رہا ہے۔ فقہی مسائل میں اختلاف رائے ملک و دین کے لیے خطرہ نہیں بلکہ اتفاق رائے کے حصول کی جانب پہلا قدم سمجھا جا رہا ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی اس پالیسی کو بھی سراہا گیا ہے کہ وہ اپنی آراء و سفارشات کو نوکر شاہی کی صیغہ راز کی پالیسی ترک کر کے سرخ فیتوں میں بند فائلوں سے نکال کر ذرائع ابلاغ کی کھلی فضا میں لے آئی ہے۔ اسے ماہرین کی اجارہ داری سے نکال کر عام قارئین کی آراء کے لیے دستیاب کر دیا ہے۔ اس سے لوگوں میں یہ اعتماد پیدا ہوا ہے کہ اسلامی قانون آج کے انسان کے مسائل میں دلچسپی لیتا ہے اور ان مسائل کے حل میں عوام کی رائے کو اہمیت بھی دیتا ہے۔

کونسل کی آراء جس طرح موضوع بحث رہیں، وہ نہایت خوش آئند پیش رفت ہے۔ اخبارات میں، ٹیلی وژن پر، رسائل اور مختلف کتابوں میں کونسل کی سفارشات کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا۔ ان سے اتفاق بھی کیا گیا، اختلاف بھی۔ تنقید بھی ہوئی اور تعریف بھی۔ بعض اداروں، کالم نگاروں، مصنفین اور مقررین نے تند و تیز مذمتی لہجہ بھی اختیار کیا اور شدید اختلاف بھی کیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان کی خفگی بھی کونسل سے خیر خواہی اور دینی حمیت کے جذبے پر مبنی تھی۔ ہم ان سب کے شکر گذار ہیں کہ یوں ان مسائل پر عام گفتگو کا آغاز تو ہوا۔ سننے اور سنانے کی روایت پھر سے شروع تو ہوئی۔ ہمیں خوشی اس لیے بھی ہے کہ یہ اسلام کی ایک علمی اور دینی روایت کا احیا ہے کیونکہ دین نصیحت اور خیر خواہی کا نام ہے اور اختلاف قومی مفاہمت کی راہ ہموار کرتا ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کے سامنے جو بھی مسائل آتے ہیں، ان پر کھل کر بحث ہوتی ہے۔ اختلاف رائے بھی سامنے آتا ہے۔ تاہم کوشش ہوتی ہے کہ کونسل کی سفارش اتفاق رائے سے تشکیل پائے۔ الحمد للہ کونسل کی اکثر سفارشات اتفاق رائے پر مبنی ہیں۔ البتہ کوششوں کے باوجود بعض اوقات اتفاق رائے نہیں ہو پاتا تو کثرت رائے سے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ چند مواقع ایسے بھی آئے جہاں، بعض ارکان نے یہ سوال اٹھایا کہ قرآن و سنت کے حوالے سے فیصلے کثرت رائے کی بنا پر کیسے کیے جا سکتے ہیں؟ یہ خدشہ بہت اہم ہے لیکن یہ اس وقت جنم لیتا ہے جب یہ اصرار ہو کہ قرآن و سنت کی صرف ایک تعبیر ممکن ہے۔ فقہ اسلامی کی تاریخ میں اکثر مواقع پر علماء و فقہاء میں قرآن و سنت کی تعبیر میں اختلاف رہا ہے لیکن اس اختلاف کو امت کے لیے رحمت سمجھا گیا۔ فقہی مذاہب کا ظہور اسی اختلاف کا نتیجہ ہے۔ آج بھی دنیائے اسلام میں نو فقہی مذاہب موجود ہیں۔ ان کے بارے میں امت مسلمہ کا اجماع ہے کہ یہ سب مسلمان ہیں، ان میں سے کسی کو کافر نہیں کہا جا سکتا۔ حال ہی میں ایک بین الاسلامی کانفرنس میں جو ۴-۶ رمئی ۲۰۰۵ء کو عمان (اردن) میں منعقد ہوئی اور جس میں شیخ الازہر، آیت اللہ سیستانی، مفتی دیار مصر، مفتی عمان، مفتی اردن، مفتی مؤتمر اسلامی اور شیخ یوسف القرضاوی کے علاوہ عالم اسلام کے بہت سے مفتی شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کے مشترکہ اعلامیہ میں یہ کہا گیا کہ تمام مذاہب، حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، جعفری، زیدی، اباضی، ظاہری، سلفی، اشعری اور صوفی حق پر ہیں اور ان میں سے کسی کی تکفیر جائز نہیں۔ (اسلام اور دہشت گردی، مطبوعہ اسلامی نظریاتی کونسل، ۲۰۰۵ء، ص ۲۶)۔

تعبیر کے اس اختلاف کی بنیاد تمام مذاہب کا اس بات پر اجماع ہے کہ فقہ کے اولین مآخذ قرآن و سنت ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ اور دیگر اماموں کی واضح ہدایات موجود ہیں کہ اگر ان کی کوئی رائے قرآن و سنت کے خلاف ہو تو اسے رد کر دیا جائے۔ تاہم تقلید کے ادوار میں یہ ذہن بنتا گیا کہ قرآن کی کوئی آیت اگر فقہی رائے کے خلاف ہو تو آیت منسوخ ہو گی یا اس کی تاویل موجود ہو گی۔ سنت اور احادیث کے بارے میں بھی فقہی مذاہب میں اختلاف موجود رہا۔ احادیث کے اصول میں بھی اور احادیث کے قبول میں بھی۔ اسی اختلاف کے پیش نظر احادیث کی چھان پھٹک اور ان کے مجموعے تیار کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ یہ مجموعے بہت محنت اور عرق ریزی سے تیار کیے گئے تھے، لیکن ان سے احادیث کے بارے میں اختلاف کم تو ہوا مکمل طور پر ختم نہیں ہوا۔

اول تو شیعہ اور سنی مذاہب کے صحیح احادیث کے معیار اور مجموعوں میں فرق ہے۔ سنی مذاہب کے نزدیک صحیح احادیث کے چھ مجموعے ہیں۔ تاہم سنی بھی یہ مانتے ہیں کہ احادیث کے اور مجموعے بھی موجود ہیں، جو اس کڑے معیار پر مبنی نہیں ہیں، جو چھ مجموعوں میں اختیار کیا گیا ہے۔ اسی طرح احادیث کے مجموعے شیعہ محدثین نے بھی مرتب کیے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ان صحیح مجموعوں کے باوجود یہ ضروری نہیں کہ فقہی مذاہب نے صرف انہی احادیث پر انحصار کیا ہو جو ان مجموعوں میں درج ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان احادیث کے مجموعوں میں بھی اگر اختلاف ہے تو فروع میں ہے، اصول میں نہیں۔

المیہ یہ ہے کہ تقلید کے دور میں یہ ذہن بنتا گیا کہ اصول میں ہی نہیں فروع میں بھی فقہی مذاہب اور ان کی آراء ہی قرآن وسنت کے قبول کا معیار ہیں۔ قرآن وسنت کی تعبیر براہ راست نہیں بلکہ ان فقہی آراء کی بنیاد پر کی جانی ضروری ہے۔ ملت کی یک جہتی کے لیے ضروری سمجھا گیا کہ فقہی مذاہب سے اختلاف کو سختی سے روکا جائے تاکہ امت مسلمہ تفرقے کا شکار نہ ہو۔ چنانچہ فقہ اسلامی کے دوسرے دو اصولوں یعنی قیاس اور اجماع کو بھی اسی زاویے سے دیکھا جانے لگا۔ قیاس اور اجماع دونوں کو فقہی آراء میں محصور کر دیا گیا۔ اجماع ایک عملی اصول تھا اور ابتدأ میں اس سے کسی مسئلہ پر غور وخوض کے بعد اتفاق رائے مراد تھا۔ جیسا کہ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے مکتب فقہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پیش آمدہ مسائل کو امام کے شاگرد فقہاء کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ ان شرکاء کی تعداد چالیس کے قریب بتائی جاتی ہے اور ان کے اتفاق رائے کو تحریر میں لایا جاتا تھا۔ اب اجماع فقہی مذہب کا دوسرا نام بن گیا۔ اس خیال سے کہ فقہی مذاہب اتفاق رائے سے وجود میں آئے تھے اور ایک عرصہ سے لوگ ان کی پابندی کر رہے ہیں، فقہی مذاہب کو ہی اجماع قرار دے دیا گیا۔ حالانکہ فقہ کی کوئی بھی کتاب ایسی نہیں، جو مختلف مسائل میں امام مذہب اور اس کے شاگردوں کے مابین اختلاف رائے کا ذکر نہ کرتی ہو۔ پھر ایک دور یہ آیا کہ فقہاء کے اس اجماع کو اجماع امت کا نام بھی دے دیا گیا۔ حالانکہ اصول فقہ کی کتابوں میں اجماع صرف فقہاء اور علماء کے اتفاق کا نام نہیں۔ اس کی تعریف میں اہل الرائے اور اہل شوکت کا نام بھی آتا ہے۔ اجماع کا عملی پہلو یہ تھا کہ صحیح معنوں میں اجماع کبھی بھی مکمل اتفاق رائے کا نام کبھی نہیں رہا۔ کسی مسئلہ پر کسی نہ کسی فقیہ یا عالم کا اختلاف ضرور موجود رہا۔ چنانچہ اجماع درحقیقت اس کثرت رائے کا نام ہے، جسے قبول عام حاصل ہو جائے۔

اجماع کو ایک عمل اور ادارے کی شکل دینے کی بجائے فقہی مذاہب تک محدود کرنے کی بہت سی وجوہات تھیں۔ ان میں سے ایک یہ اندیشہ تھا کہ رائے کی آزادی اور اختلاف سے امت مسلمہ کا شیرازہ بکھر سکتا ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ برصغیر دوسرے مسلم علاقوں کی نسبت سیاسی، معاشی اور سماجی ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ رہا۔ تاتاریوں کی تاخت وتاراج سے سب سے زیادہ وہ علاقے متاثر ہوئے، جہاں حنفی مذاہب کے پیروکار بستے تھے تاہم برصغیر تاتاری اثرات سے محفوظ رہا۔ وسط ایشیا میں اور شام وعراق میں تاتاری حملوں کے بعد بہت سی تبدیلیاں آئیں، جن کے زیر اثر حنفی فقہ میں نئے رجحانات اور نئے مدارس کا ظہور ہوا۔ مشائخ بلخ وبخارا کا ذکر برصغیر کی فقہ کی کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ حنفی مشائخ بلخ وبخارا کی فقہی آراء مشائخ شام سے مختلف تھیں، کیونکہ دونوں علاقوں کے معروضی حالات میں اختلاف ہو گیا تھا۔ اسی طرح سلطنت عثمانیہ میں حنفی فقہاء جس طرح ریاست کے نظام کا حصہ بنے وہ صورت برصغیر میں ظہور پذیر نہیں ہو سکی۔ مغلیہ نظام سلطنت میں گاہے گاہے ہی فقہاء کو یہ حیثیت مل سکی۔ انتظامی، معاشرتی اور معاشی تبدیلیوں سے عام طور پر فقہاء کا براہ راست واسطہ نہیں رہا۔ ان تاریخی عوامل کا نتیجہ تھا کہ تقلیدی رویے برصغیر میں زیادہ پختہ رہے۔ چنانچہ یہاں فقہی مذاہب کو ہی اجماع امت کا قائم مقام سمجھا گیا اور علماء اجتہاد کی بجائے حفاظت دین کے قائل رہے۔

انیسویں صدی میں برطانوی استعمار کے دور میں بھی علماء نے حفاظت دین کو ضروری سمجھا، اس دفاعی رویے نے بھی تقلید مذہب میں عافیت سمجھی۔ تاہم بیسویں صدی میں دور جدید کے مسائل کا سامنا ہوا اور افتاء کے ادارے نے یہ ذمہ داریاں سنبھالیں تو یہ تقلیدی رویہ قائم نہ رہ سکا۔ اکثر مسائل اتنے نئے تھے کہ فقہی سرمایے میں رہنمائی نہ ملتی تھی اور تقلید ممکن نہیں تھی۔ برصغیر نے شاہ عبدالعزیز، نواب صدیق حسن خان، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا احمد رضا خان، مفتی کفایت اللہ، مولانا علی نقی نقوی عرف نقن میاں، مفتی میر عباس، مفتی احمد علی اور مولانا سید نذیر حسین جیسے نامور مفتی پیدا کیے۔ فتاویٰ کا ایک عظیم ادب تخلیق ہوا۔ افتاء کے اداروں کو فروغ ہوا، فتویٰ کا معاشرتی اور معاشی تبدیلیوں سے براہ راست تعلق تھا۔ اس دور میں کئی اہم باتیں سامنے آئیں۔ ایک تو سائنسی اور تکنیکی مسائل مین نئے علوم کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے فقہاء نے ان علوم کے ماہرین سے مشاورت کی روایت کا آغاز کیا۔ دوسرے فتاویٰ میں مختلف فقہی مذاہب کی آراء سے استفادے اور ان پر مبنی فیصلوں کا رواج ہوا۔ اس کی ایک عمدہ مثال مولانا اشرف علی تھانوی کا فتویٰ ''الحیلۃ الناجزۃ'' ہے، جس میں انہوں نے مالکی مذہب کی فقہی آراء کو اختیار کر کے برصغیر میں مسلم خواتین کے لیے عدالت کے ذریعے تنسیخ نکاح کے حق کی تائید کی۔ تیسرے ان فتاویٰ میں اب صرف فقہی مذہب کی مخصوص آراء ہی نقل نہیں کی جاتیں بلکہ براہ راست قرآن وسنت کے حوالے اور ان سے استنباط بھی کیا جاتا ہے۔ چوتھے، فتاویٰ نے اس ضرورت کے احساس کو اجاگر کیا کہ عام مسلمان کو بھی افتاء کے عمل میں شریک سمجھا جائے، اس لیے جدید فتاویٰ صرف ہاں یا نہیں میں جواب نہیں دیتے بلکہ پوری تفصیل سے مفتی کا موقف بیان کرتے ہیں تاکہ قاری صرف مفتی کے کہنے پر نہیں بلکہ پوری بصیرت کے ساتھ اس فتویٰ پر عمل کر سکے۔

دور جدید نے بہت سے نئے مسائل کو جنم دیا ہے اور بہت سے پرانے مسائل کو نئے سیاق وسباق میں پیش کیا ہے۔ اسلامی قانون کے نئے افق سامنے آرہے ہیں۔ ان میں سے ایک بہت اہم افق اسلام اور مغرب کا حوالہ ہے، جو اس تازہ شمارے کا

موضوع ہے۔ ایک لحاظ سے یہ حوالہ اس تبدیلی کا تسلسل ہے، جس کا آغاز دورِ استعمار میں ہوا اور اب یہ افق بہت وسیع ہو گیا ہے، کیونکہ اس سے مسلمانوں کے سیاسی، سماجی، معاشی، قانونی اور ثقافتی پہلو ہی متاثر نہیں ہوئے بلکہ اس نے اسلامی تہذیب وثقافت کو نئے علمی افق بھی مہیا کیے ہیں۔

اسلامی نظریاتی کونسل کو احساس ہے کہ امت مسلمہ پر، جسے قرآن نے تمام انسانیت پر گواہ بنا کر بھیجا ہے، یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ تقلید کی تنگ نظری ختم کر کے اجتہاد کا راستہ اختیار کرے اور یوں قرآن وسنت کی روشنی کو عام کرے اور اس مقام شہادت کا حق ادا کرے، جس پر اسے فائز کیا گیا ہے۔ اگر حفاظت دین کے تقلیدی اور قدامت پسندانہ رویے پر اصرار جاری رہا تو امت مسلمہ انتہا پسندی کا شکار ہو کر تنہا ہوتی چلی جائے گی اور انسانیت دین بیزاری کے راستے پر بہت دور نکل جائے گی۔

اس شمارے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اسلام اور مغرب کے مابین رابطوں کا جو نیا رخ سامنے آیا ہے، اسے بہتر طریقے سے سمجھا جا سکے تا کہ امت مسلمہ خصوصاً پاکستان اس میں اپنا صحیح کردار ادا کر سکے۔ اس نئے رابطہ میں اسلام اور مغرب کے الفاظ دین، ثقافت اور فکر کے نمائندہ ہیں اور صرف دین اور مذہب تک محدود نہیں۔ دوسرے اسلام اور مغرب کے رابطوں میں نظریاتی اور جغرافیائی سرحدیں بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں۔ جہاں مغرب میں اسلام اپنے وجود کا احساس دلا رہا ہے، وہاں اسلام بھی مغرب سے نامانوس نہیں۔ اس دور میں جہاں مغربی دانشوروں نے اسلام کو خطرہ قرار دیتے ہوئے، اسلام اور مغرب کے مابین تصادم کی چیخ وپکار سے، اسلام اور مغرب میں منافرت پھیلانے کی کوشش کی ہے، وہاں بعض مسلمانوں نے بھی مغرب کے خلاف دہائی دے رکھی ہے۔ اس صورت حال نے اسلام اور مغرب کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کر دیا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے، اس عالمی دور نے مسلمانوں کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ اسلام کے فکری، دینی اور ثقافتی پیغام کو انسانیت کے مشترکہ سرمایہ کے طور پر پیش کریں اور مغرب جو روز بروز دین کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار سے بھی بیزار ہوتا نظر آ رہا ہے، اسے اسلام کی انسانی اقدار کی دعوت دیں۔

اس دعوت کے لیے قدیم علم الکلام کام نہیں دے گا۔ قدیم علم الکلام بنیادی طور پر مناظرانہ اور اعتذاری ہے۔ اب ایک جدید علم الکلام کی ضرورت ہے، سرسید نے اس جدید علم الکلام کی ضرورت کی طرف توجہ دلائی تھی اور اپنی کئی تصنیفات کے ذریعے اس کی داغ بیل بھی ڈالی تھی۔ سرسید، شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے مکتب فکر کے تربیت یافتہ تھے، جہاں اختلافات کو گفت وشنید اور مکالمہ سے سلجھانے کی روایت تھی۔ شاہ عبدالعزیز کے عہد تک فوجی فتوحات کے باوجود ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران برصغیر کی اسلامی علمی روایت سے مرعوب تھے۔ کمپنی کی انتظامیہ کے افسران شاہ صاحب کی مجالس میں شریک ہوتے اور ان سے استفادہ کرتے تھے۔ اس زمانے میں انگریز اردو، عربی اور فارسی زبانیں سیکھنے کے ساتھ مقامی ادب میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ ایسے انگریزی شعراء کی تعداد جو اردو میں غزل کہتے تھے، سینکڑوں میں ہے۔ لکھنؤ میں بہت سے انگریزوں نے مغل بود و باش اختیار کر رکھی تھی۔ قدامت پسند مسلمان انگریزی زبان، انگریزی لباس اور انگریزوں کی نوکری اور دوسرے بہت سے مسائل میں تحفظات کا اظہار ضرور کرتے تھے، لیکن انگریزوں سے مرعوبیت کی وجہ سے نہیں، بلکہ دینی ثقافت اور مذہب سے وابستگی کی بنا پر، ۱۸۵۷ء کے بعد حالات نے پلٹا کھایا اور استعمار نے جبر اور استبداد کی راہ اختیار کی، تو مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان اختلافات اور نفرت کی خلیج پیدا ہو گئی۔ استعمار نے اپنی برتری کے لیے اسلحہ اور فوج کے ساتھ علمی اور تبلیغی حملوں کا سلسلہ بھی شروع کیا، مناظرے اور جلسے شروع ہوئے، لیکن قدیم علم الکلام جدل اور مناظرے سے آگے نہ بڑھ سکا۔

سرسید نے جدید علم الکلام کی ضرورت پر زور دیا کیونکہ مغرب سے مکالمے کے لیے مغرب کی زبان اور فکر سے واقفیت ضروری تھی۔ مغرب کی طاقت کا سرچشمہ سائنس اور ٹیکنالوجی تھی۔ سرسید نے مسلمانوں کو نئے علوم سیکھنے کی دعوت دی۔ لیکن یہ دعوت شک وشبے کی نظر سے دیکھی گئی، یہ سمجھا گیا کہ سائنسی علوم کی تدریس سے مغربی استعمار مستحکم ہو گا۔ سرسید کے ساتھیوں میں بعض نے ساتھ دیا اور اس جدید علم الکلام کو آگے بڑھایا، لیکن بعض نے اس پر تنقیدی نگاہ ڈالی۔ علامہ شبلی نعمانی ان لوگوں میں سے تھے، جن کا کہنا تھا کہ مغرب سے مکالمے کے لیے قدیم علم الکلام کافی ہے، جدید علم الکلام کی ضرورت نہیں۔ عام طور پر علماء کا بھی یہی موقف تھا چنانچہ مولانا اشرف علی تھانوی اور دوسرے حضرات نے سرسید کے جدید علم الکلام پر کڑی تنقید کی اور اسے اسلامی تعلیمات سے متصادم ٹھہرایا۔ حالات بدلتے گئے اور علم الکلام کے تقاضے اور اہداف بھی بدلتے گئے، مختلف اہل علم نے علم الکلام کی اس پیش رفت میں حصہ لیا، لیکن ان کوششوں میں سب سے اہم اور نمایاں کام علامہ اقبال کا ہے۔ انہوں نے جدید علم الکلام میں اصول فقہ اور اجتہاد کو شامل کیا، مغربی فکر کا آزادانہ اور ناقدانہ مطالعہ ضروری قرار دیا اور یوں ایک وسیع اور جدید علم الکلام کی ابتدا کی، علامہ اقبال کی ان کوششوں نے علم الکلام کی بہت سی نئی جہتوں کو واضح کیا۔ روایتی علم الکلام مابعد الطبیعات اور علم العقائد تک محدود تھا۔ جدید علم الکلام سائنس، سیاسیات، معاشیات، اخلاقیات، سماجیات، لسانیات اور دیگر علوم کی وسعت کو ساتھ لے کر آیا ہے۔

اسلام اور مغرب کے روابط نے اس جدید علم الکلام کو بہت سے مزید نئے افق دیئے ہیں، جو اسلامی دنیا کے دانشوروں کی توجہات کا موضوع بنے۔ آج ایران، مصر، مراکش، ملائیشیا، لبنان، انڈونیشیا، بھارت، اور یورپ میں ان موضوعات پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں، مذاکرے ہو رہے ہیں، رسالہ اجتہاد کے موجودہ شمارے کا موضوع ’’اسلام اور مغرب‘‘ ہے، ارادہ ہے کہ آئندہ شمارے کا موضوع جدید علم الکلام ہو گا۔ ہماری کوشش ہے کہ اس رسالے کے ذریعے ہم ان علمی مباحث و مذاکرات سے آگاہی فراہم کر کے، اسلام کی اجتہادی روایت سے قارئین کا رابطہ جاری رکھ سکیں۔

اداریہ

خورشید احمد ندیم

دور جدید کی تفہیم میں دو باتیں بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ایک یہ کہ تہذیبی و علمی اعتبار سے اب ہم جزیرہ بنا کر نہیں رہ سکتے۔ جنگ عظیم دوم کے بعد کھینچی گئی سرحدیں اگرچہ آج بھی باقی ہیں لیکن علم وفلسفہ اور تہذیب وتمدن کے معاملہ میں یہ بے معنی ہوگئی ہیں۔ ان میدانوں میں دنیا کے دوسرے حصوں میں جو کچھ ہو رہا ہے، ہم ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔آج مسابقت کی ایک فضا قائم ہو چکی ہے، جس میں ہمیں غالب فکر و فلسفے کو یا تو تسلیم کر کے آگے بڑھنا ہے یا پھر اس کے متبادل کے طور پر کوئی دوسرا نقطہ نظر پیش کرنا ہے۔اسے آپ عالمگیریت کا جبر کہہ سکتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ آج فکر وفلسفہ اور تہذیب وتمدن کا سفر مغرب سے مشرق کی طرف ہے۔ پچھلے کئی عشروں سے مشرق مغرب کو کچھ دے نہیں پایا۔ کم وبیش تین عشرے قبل سلیم احمد مرحوم نے اپنی ایک معرکہ آراء نظم کے لیے ''مشرق ہار گیا'' کا عنوان باندھا تھا۔اس نظم میں اٹھائے گئے مباحث یقیناً آج تبدیل ہو گئے ہیں، لیکن اس کا عنوان بدستور آج بھی اسی طرح ہمارے عہد سے متعلق ہے۔ ہم اگر صرف اہل اسلام کے حوالے سے اس معاملہ کو دیکھیں تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ خود اسلامی علوم، تہذیب اور عالم اسلام پر بنیادی تحقیقی کام مغرب میں ہو رہا ہے اور ہماری حیثیت بڑی حد تک خوشہ چین کی ہے۔

آج اگر مسلمانوں کی طرف سے احیاء اور مسابقت کا کوئی عمل شروع ہوتا یا آگے بڑھتا ہے تو اس کے لیے ان دو امور کا ادراک ناگزیر ہے۔ پہلی بات کے فہم میں زیادہ مشکل نہیں کیونکہ ''عالمگیریت'' سے ہر کسی کو آئے دن کسی نہ کسی حوالے سے پالا پڑتا ہے۔ تاہم دوسری بات ایسی ہے، جو اپنے اندر تنوع رکھتی ہے اور اس ضمن میں ہمارے ہاں ہونے والی بحث سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ اس باب میں بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ''اجتہاد'' کا دوسرا شمارہ اس مطالعے کے لیے خاص کیا گیا ہے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے جو سوال زیر بحث لانا چاہیے، وہ یہ ہے کہ مغرب سے ہماری مراد کیا ہے؟ کیا یہ کوئی جغرافی شناخت ہے؟ کیا امریکہ ''مغرب'' ہے؟ کیا یہ ایک تہذیب ہے؟ کیا یہ کسی مذہب کا نام ہے؟ یہ تو وہ سوالات ہیں جو مغرب کو مجرد مفہوم میں لینے سے اٹھتے ہیں۔ بعض سوالات وہ ہیں جو اس وقت پیدا ہوتے ہیں، جب ہم مغرب کو اسلام کے بالمقابل ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

اس صورت میں پھر یہ سوال بھی اہم ہو جاتا ہے کہ اسلام سے ہماری کیا مراد ہے؟ مثال کے طور پر جب ہم اسلام اور مغرب کو متصادم قرار دیتے ہیں اور اسلام کو مذہب سمجھتے ہیں تو پھر لازماً اس تصور میں مغرب بطور مذہب سامنے آتا ہے۔اسی طرح اگر ہم اسلام کو ایک تہذیب قرار دیتے ہیں، تو پھر مغرب ایک تہذیب کا عنوان بن جاتا ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے۔ مغرب کا کوئی حوالہ اسلام کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ آج اسلام، اگر ہم مغرب کو جغرافی مفہوم میں لیں، تو وہاں کا دوسرا بڑا اور سب سے زیادہ پھیلنے والا مذہب ہے۔اس پھیلاؤ کے کئی اسباب ہیں۔ سب سے بڑا سبب ان لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہے، جو مسلمان دنیا سے ترک وطن کر کے مغربی ممالک میں آباد ہو رہے ہیں۔ یہ لوگ جب اپنی مذہبی شناخت کے ساتھ وہاں مقیم ہیں تو لازماً مغرب کے تہذیبی تشخص پر اثر انداز ہو رہے ہیں اور اس خطے کا جو تہذیبی رنگ ابھر رہا ہے، اس میں لازماً صبغۃ الاسلام کی آمیزش ہے۔ گویا جب ہم اسلام اور مغرب، دونوں کو تہذیبی مفہوم میں لیتے ہیں، تو انہیں باہم متصادم قرار دینا مشکل ہو جاتا ہے۔اسی طرح اگر اہم اسلام کو ایک مذہب کے طور پر لیں اور اسے مغرب سے متصادم سمجھیں تو پھر ہمیں بطور مذہب ''مغرب'' کی تعریف کرنا پڑے گی۔ یعنی جس طرح اسلام اور عیسائیت وغیرہ مذاہب ہیں، ہمیں یہ بتانا ہوگا کہ مغرب کے بحیثیت مذہب خدوخال کیا ہیں؟ یہی معاملہ اہل مغرب کا ہے کہ وہ جب اسلام کو مغرب کے حوالے سے زیر بحث لاتے ہیں، تو یہ دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اسلام سے کیا مراد لے رہے ہیں؟

''اجتہاد'' کے زیر نظر شمارے میں یہ موضوع بطور خاص ڈاکٹر ممتاز احمد کے مضمون میں زیر بحث آیا ہے، جس میں انہوں نے اسلام اور مغرب کے مفاہیم میں موجود اس تنوع کو بیان کیا ہے اور پھر یہ بتایا ہے کہ کس طرح کسی لکھنے والے کے ذہن میں موجود تصور، اس کے بیان کردہ فلسفے اور خیال پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک اسلام اور مغرب کے ضمن میں جاری یہ بحث فی نفسہ سیاسی ہے۔ اس تصور کو جناب اصغر علی انجینئر نے اپنے مضمون میں آگے بڑھایا اور یہ اس مذاکرے کا بھی ایک اہم پہلو ہے، جس کی تفصیلی روداد اس شمارے میں شامل ہے۔

بعض لوگ مغرب کو جدیدیت کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مغرب میں اصلاح مذہب کی جو تحریک اٹھی اور جس کے اہم مظاہر سیکولرازم اور جمہوریت ہیں اور جس کے تحت وحی کے بجائے عقل کو انسانی معاملات کی تنظیم میں حاکم قرار دیا گیا ہے، اس حوالے سے مغرب ایک دین کے ہم معنی ہے۔ اس تصور کو سامنے رکھیے، تو یہ سوال اٹھتا ہے کہ خود وحی کی تفہیم میں کیا عقل انسانی کا کوئی کردار ہے اور پھر یہ کہ عقل اور وحی کا باہمی تعلق کیا ہے؟ اس حوالہ سے کیا فہم اسلام میں عقل کا کوئی استعمال ہے؟ ڈاکٹر تماراسون نے ''اسلام، مغرب اور جدیدیت'' میں اس سوال کو اٹھایا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔

اسلام اور مغرب کی بحث میں ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ مذہب کے کثیر المدنی معاشرے میں مقیم مسلمان جن مسائل سے پہلی بار دوچار ہوئے ہیں، دین اس ضمن میں انہیں کیا رہنمائی فراہم کرتا ہے؟ اس اختلاط نے ہجرت، دارالحرب اور دارالاسلام اور اس بارے میں رائج تمام فقہی اصطلاحوں کی تفہیم نو کی ضرورت کو اجاگر کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد خالد مسعود نے اپنے اہم مقالے میں ان کا احاطہ کیا ہے، جس سے ان تمام مسائل کا ایک نیا تناظر ہمارے سامنے آتا ہے۔ ''مغرب میں اہل اسلام'' کے عنوان سے جس مذاکرے کی روداد شامل اشاعت ہے، اس سے بھی اس مسئلے کے کئی پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔

اسلام اور مغرب کے مطالعہ میں ہمارے لیے یہ بات بطور خاص اہم ہے کہ مغرب کے اہل علم اسلام اور مغرب کے موضوع پر کیا رائے رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد وسیم اور ڈاکٹر محسن نقوی کے مضامین سے مغرب کے علمی رجحان کی ایک بڑی حد تک مکمل تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر طاہر امین کا مضمون بھی اہم ہے۔ ان مضامین کے مطالعے سے یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ تمام اہل مغرب اسلام کے بارے میں ہم خیال نہیں۔ اگر کسی کی طرف سے تہذیبوں کے ممکنہ تصادم میں اسلام کو فریق قرار دیا گیا ہے تو بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو اس مقدمے سے اتفاق نہیں کرتے۔

مغرب میں ہونے والے بعض واقعات بھی ایسے ہیں، جنہیں صحیح تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ حالیہ تاریخ میں سلمان رشدی کے ناول ''شیطانی آیات'' کی اشاعت سے لے کر پوپ بینڈکٹ کی تقریر تک، کئی ایسے واقعات ہوئے ہیں، جنہوں نے مسلمانوں میں اشتعال پیدا کیا ہے۔ یہ واقعات مغرب کے عمومی رویے کے ترجمان ہیں یا ایک اقلیتی گروہ کا شاخسانہ؟ عیسائی مذہب کے سب ہی ماننے والے کیا اس سے اتفاق کرتے ہیں اور کیا یہ مغرب کی عمومی اسلام دشمنی کے عکاس ہیں؟ یہ سب سوالات جواب طلب ہیں اور اسلام اور مغرب کے حوالے سے جاری بحث کو نہیں سمجھا جا سکتا، اگر ہم ان واقعات کے صحیح تناظر سے آگاہ نہ ہوں۔ ''سلمان رشدی کا قصہ'' اور پھر ''نقد وتبصرہ'' کے ذیل میں شامل مضامین بڑی حد تک ان سوالات کے جوابات فراہم کرتے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر جان ایسپوسیٹو کے مضامین بھی بہت اہم ہیں، جن سے مغرب کے اہل علم کا وہ زاویۂ نگاہ سامنے آتا ہے، جو اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ہمدردانہ رویے پر مبنی ہے۔

اسلام اور مغرب کے حوالے سے چونکہ پروفیسر سموئیل ہنٹنگٹن کا تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے، اس لیے ان کی معروف کتاب کی تلخیص بھی کر دی گئی ہے، تاکہ موضوع کا یہ پہلو تشنہ نہ رہے۔

اس شمارے میں اس بات کی شعوری کوشش کی گئی ہے کہ ''اسلام اور مغرب'' کے باب میں جو اہم مباحث ہیں، ان کا ایک حد تک احاطہ کر دیا جائے تاکہ ایک عام پڑھے لکھے آدمی کو بھی موضوع کی تفہیم میں آسانی ہو۔ اور وہ پورے اعتماد کے ساتھ اس بحث میں شریک ہو سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ عام آدمی کی سنجیدہ مباحث میں شرکت معاشرے کے ارتقاء کے لیے ضروری ہے۔ یہ اس لیے بھی لازم ہے کہ ایک مسئلہ کا ادھورا علم صحیح نتائج تک پہنچنے میں مانع ہوتا ہے۔ ''اجتہاد'' کے اجرا میں اس بات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے کہ معاشرے کے علمی ارتقاء میں آزادانہ غور وفکر بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور یہ جریدہ اس موضوع کے حصول کی ایک کوشش ہے۔ اس کی اشاعت سے مقصود کسی خاص نقطۂ نظر کو آگے بڑھانا نہیں، بلکہ عامۃ الناس کو وہ علمی ماحول فراہم کرنا ہے، جو آزادانہ اور صحیح رائے کے قیام کے لیے ناگزیر ہے۔ امید ہے کہ ''اسلام اور مغرب'' کے موضوع پر اس شمارے کے مندرجات مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرنے میں معاون ہوں گے۔

''اجتہاد'' کے اس شمارے میں دیگر مستقل عنوانات کے تحت بھی اہم مضامین شامل ہیں۔ ''عالم اسلام اور اجتہاد'' میں اس بار انڈونیشیا کو موضوع بنایا گیا ہے۔ انڈونیشیا کو فکری اعتبار سے اگر دور حاضر کا سب سے بیدار اور متنوع مسلمان معاشرہ قرار دیا جائے تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ شامل اشاعت مضامین سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ انڈونیشیا میں لوگ درپیش مسائل پر کس طرح سوچ رہے ہیں۔ سیاسی اور سماجی معاملات میں مذہب اور روایت کے درمیان کیسے توازن قائم کیا جا رہا ہے اور وہاں کی مذہبی جماعتیں معاشرتی تعمیر میں کیا کردار ادا کر رہی ہیں۔ اسی طرح قانون سازی کے باب میں مذہب کے کردار کو بھی ان مضامین کے مطالعہ سے سمجھا جا سکتا ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی سرگرمیاں اور سفارشات وغیرہ بھی اس شمارے میں شامل ہیں۔ ان کے ساتھ ''زبان خلق'' کے عنوان سے مندرجات میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا گیا ہے، جس سے یہ جانا جا سکتا ہے کہ ''اجتہاد'' اور اسلامی نظریاتی کونسل کے بارے میں قومی سطح پر کس طرح کی آراء سامنے آ رہی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک بند معاشرہ اس جوہڑ کی مانند ہے، جس سے فکری پیاس نہیں بجھائی جا سکتی۔ ''اجتہاد'' اس بات کا پیغام ہے کہ غور وفکر اور تبادلۂ خیال ہی وہ واحد عمل ہے، جس سے نئے خیالات سامنے آئیں گے اور نئے خیالات ہی نئے جہانوں کا پتہ دیتے ہیں۔
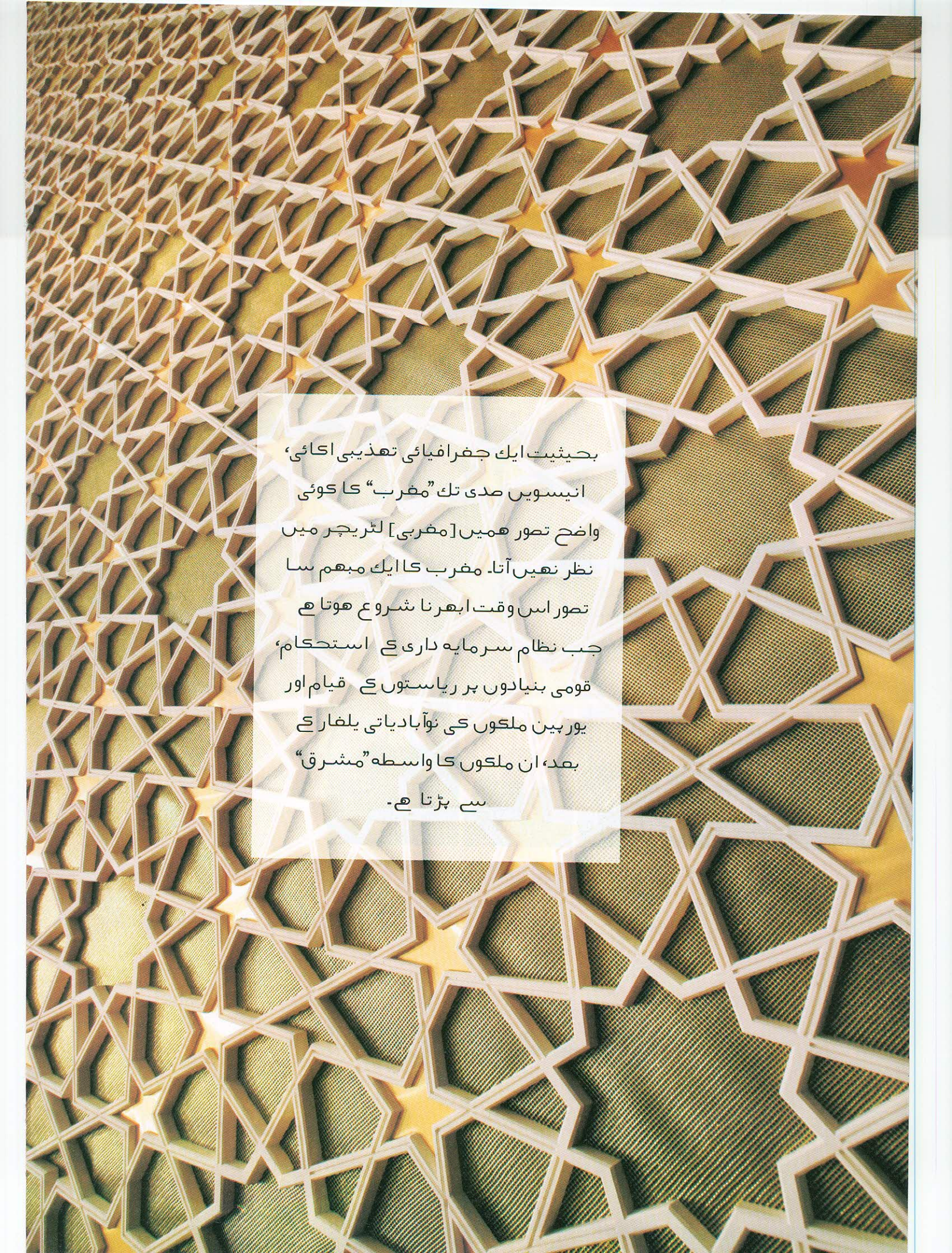
جہانِ تازہ کی فکرِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
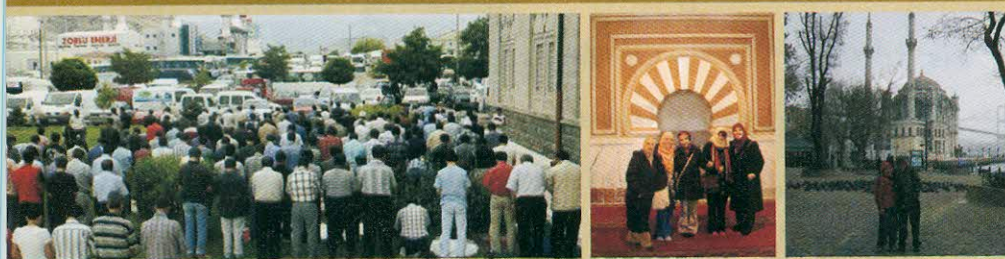
اسلام اور مغرب

بحیثیت ایک جغرافیائی تھذیبی اکائی،
انیسویں صدی تک "مغرب" کا کوئی
واضح تصور ھمیں [مغربی] لٹریچر میں
نظر نھیں آتا۔ مغرب کا ایک مبھم سا
تصور اس وقت ابھرنا شروع ھوتا ھے
جب نظام سرمایہ داری کے استحکام،
قومی بنیادوں پر ریاستوں کے قیام اور
یورپین ملکوں کی نوآبادیاتی یلغار کے
بعد، ان ملکوں کا واسطہ "مشرق"
سے پڑتا ھے۔
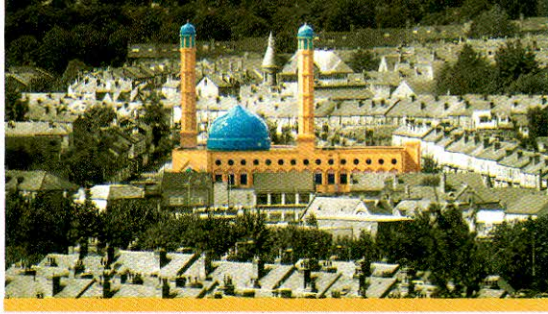
اسلام اور مغرب

چند اہم مباحث

ڈاکٹر ممتاز احمد ہمپٹن یونیورسٹی ہمپٹن، ورجینیا، امریکا میں سیاسیات کے پروفیسر ہیں۔ مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا کی اسلامی تحریکیں ان کی تحقیق کا خصوصی موضوع ہیں۔

''اسلام اور مغرب' ایک ایسا موضوع ہے، جو آج کل شرق وغرب میں ہر جگہ زیر بحث ہے۔ آئے دن نئی کتاب سامنے آ رہی ہے، مضمون پڑھے اور لکھے جا رہے ہیں، مکالمہ ہو رہا ہے، کانفرنسیں اور سیمنارز منعقد کیے جا رہے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ عالمی سیاست اور فکری دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ اب یہی رہ گیا ہے۔ مجھے اس موضوع کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن مغرب کے بعض علمی اور سیاسی حلقوں کی اس موضوع پر مبالغہ آمیز توجہ، جس مفروضے پر مبنی ہے، وہ یہ ہے کہ اس قضیہ میں اصل مرکزیت مغرب کو حاصل ہے اور یہ کہ مستقبل میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے امکانات کا دارومدار اب اس پر ہوگا کہ وہ مغرب سے اپنے تعلقات کس نہج پر استوار کرتے ہیں۔ گویا مغرب ہی وہ واحد تہذیبی اور اخلاقی پیمانہ ہے، جس سے اسلام اور باقی تمام غیر مغربی تہذیبوں کو ناپا اور تولا جائے گا۔ یہ مقدمہ میرے نزدیک محل نظر ہے۔

''اسلام اور مغرب'' کے تعلقات پر جاری اس بحث کو سمجھنے کیلئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم دونوں اصطلاحوں کی تعریف متعین کرنے کی کوشش کریں، یعنی یہ کہ جب ہم ''مغرب'' یا ''اسلام'' کی بات کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد کیا ہوتی ہے۔

پہلے ہم ''مغرب'' کو لیتے ہیں۔ یہ سوال بہت اہم ہے کہ کیا مغرب ایک تہذیبی اکائی ہے یا جغرافیائی؟ انیسویں صدی کے نصف میں ایک امریکی مصنف نے لندن کے کسی اخبار میں ایک مضمون پڑھا جس کا عنوان تھا ''ویسٹرن کلچر''۔ وہ اس عنوان کو دیکھ کر ہنس پڑا اور جب اس کیفیت سے نکلا تو اس نے اخبار کے ایڈیٹر کے نام خط میں سوال کیا کہ یہ ''ویسٹرن کلچر'' کس چڑیا کا نام ہے؟ تم یورپ والوں کا کلچر الگ ہے، ہم امریکنوں کا کلچر الگ ہے، اور یہ کہ آئندہ اپنی چالاکیوں میں ہم معصوم اور بھولے بھالے امریکنوں کو شامل کر کے بدنام کرنے کی کوشش نہ کرو۔ مارک ٹوین جب انیسویں صدی کے نصف آخر میں ''کورٹ آف سینٹ جیمز'' میں گیا اور اس سے ''ویسٹ'' کے بارے میں پوچھا گیا تو وہ ''امریکن ویسٹ'' کی باتیں کرنے لگا۔

''مغرب'' کا لفظ ''اسلام اور مغرب'' کی بحث میں ہمارے ہاں جس بے تکلفی اور آسانی کے ساتھ استعمال کیا جا رہا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ''مغرب'' کسی بہت متعین اور واضح اکائی کا نام ہے اور اس کے تشخص میں کسی ابہام کا امکان نہیں ہے۔ میرے خیال میں معاملے کی حقیقی نوعیت یہ نہیں ہے۔ ''مغرب'' کا تصور ایک مبہم تصور ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کی متفقہ تاریخی، سیاسی، تہذیبی اور مذہبی حدود کا تعین کرنا مشکل ہے۔ بحیثیت ایک جغرافیائی تہذیبی اکائی، انیسویں صدی تک ''مغرب'' کا کوئی واضح تصور ہمیں (مغربی) لٹریچر میں نظر نہیں آتا۔ مغرب کا ایک مبہم سا تصور اس وقت ابھرنا شروع ہوتا ہے، جب نظام سرمایہ داری کے استحکام، قومی بنیادوں پر ریاستوں کے قیام اور یورپین ملکوں کی نوآبادیاتی یلغار کے بعد، ان ملکوں کا واسطہ ''مشرق'' سے پڑتا ہے۔ یوں ایک پہلو سے دیکھا جائے تو ''مغرب'' نے اپنے الگ تہذیبی اور سیاسی تشخص کا شعور ''مشرق'' کے ساتھ اپنے روابط اور تصادم سے حاصل کیا ہے۔ یہ چیز صرف مغرب تک ہی محدود نہیں ہے۔ انفرادی اور اجتماعی طور پر شناخت کا موضوعی شعور (Subjective consciousness) بالعموم فریق دیگر (OTHER) سے تصادم کے نتیجے ہی میں پیدا ہوتا ہے۔

اسی ضمن میں ایک دلچسپ تاریخی حقیقت یہ بھی ہے کہ یورپی نشاۃ ثانیہ (European Enlightenment) کی رجائیت پسند اور مسلسل ترقی کے امکانات پر مبنی فکری اور سیاسی پیش رفت کے دور میں بہت کم مغربی مفکرین ''مغربی تہذیب'' کا ذکر کرتے نظر آتے ہیں۔ ''مغربی تہذیب کی انفرادیت'' اخلاقی برتری اور اس کی عالمگیر حیثیت (Universal Relevance) کا زیادہ چرچا اس کے دور عروج میں نہیں بلکہ اس کے دور انحطاط میں ہوتا ہے۔ یہ دور جنگ عظیم اول سے شروع ہوتا ہے، جب مغرب کی رجائی فکر کو پہلا بڑا دھچکا لگتا ہے۔ اسی دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب کے بڑے بڑے مفکرین، جن میں آسولڈ اسپنگلر، سوروکن اور ٹائن بی شامل ہیں، بیک وقت مغرب کی اخلاقی اور تہذیبی برتری کے ایک دیومالائی ماضی (Mythical past) کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ ہم عصر دور میں اس کے تہذیبی واخلاقی اور سیاسی زوال کا رونا روتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح یہی وہ دور ہے، جب مشرقی تہذیبوں کے مقابلہ میں مغرب کی فکری برتری کی سب سے بڑی پہچان، یعنی عقلیت پسندی کے خلاف

ایک طرف نطشے اور دوسری طرف سگمنڈ فرائیڈ بغاوت کا علم بلند کرتے ہیں اور جرمن سوشیالوجسٹ میکس ویبر عقل مطلق پر مبنی مغربی معاشرے کو آہنی پنجرے (Iron case) سے تعبیر کرتا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو اہل مغرب میں ''مغرب'' کے تہذیبی تشخص کا اظہار اس کے نقطۂ عروج سے نہیں، نقطۂ زوال سے شروع ہوتا ہے اور یہ تشخص، بڑی حد تک، نوآبادیاتی نظام کے خلاف ''مشرق'' کی مزاحمت کے جواب میں ایک دفاعی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ آج بھی صورت اس سے مختلف نہیں ہے۔ سابق برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیر اور امریکی صدر جارج بش نے کئی بار ان خیالات کا اظہار کیا ہے کہ عراقی مزاحمت کے خلاف ان کی جنگ ''تہذیب مغرب'' کو بچانے کی جنگ ہے۔ یہاں بھی تہذیبی تشخص ایک دفاعی ہتھیار کے طور پر استعمال ہو رہا ہے اور یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ گویا یہ دو تہذیبوں کی جنگ ہے۔

مغرب کا ایک اور تصور جغرافیائی وحدت کا بھی ہے، لیکن یہ تصور شاید اس دور میں زیادہ صحیح تھا جب مغرب سے مراد صرف یورپ اور وہ بھی مغربی یورپ تھا۔ مغرب کے جغرافیائی تصور کی ابتداء ایک لحاظ سے مغربی رومی سلطنت سے ہوتی ہے، لیکن کئی صدیوں تک اس جغرافیائی اکائی میں برطانیہ بھی شامل نہیں تھا اور سکینڈے نیویا کے ممالک بھی شامل نہیں تھے۔ پھر یہ بھی تھا کہ ترکی اور روس کے مغربی علاقے اور یورپ کے وہ ممالک جو خلافت عثمانیہ کے قبضہ میں تھے، وہ بھی مغرب کی دنیا سے باہر سمجھے جاتے تھے۔ دوسری طرف اب صورت حال یہ ہے کہ جو ممالک مغرب کی جغرافیائی سرحدوں سے ہزاروں میل دور ہیں، مثلاً آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ، وہ بھی مغرب کے تہذیبی تشخص کا حصہ بن چکے ہیں اور آسٹریلیا کے کنزرویٹو وزیراعظم جان ہاووڈ بھی مغربی تہذیب کی بقا کی جنگ لڑنے میں اتنے ہی مستعد ہیں جتنے کہ ٹونی بلیر اور جارج بش۔

اس تجزیے سے یہ بات تو بڑی حد تک واضح ہے کہ ''مغرب'' کی حیثیت تہذیبی اور جغرافیائی اکائیوں کی حد تک کم از کم مشکوک ضرور ہے۔ تو پھر کیا ''مغرب'' ایک مذہبی اکائی ہے؟ تاریخی طور پر اگر مغرب کو صرف یورپ تک محدود سمجھا جائے تو اس کا ایک مذہبی تشخص واضح طور پر نظر آتا ہے، جس کی بنیاد عیسائیت پر تھی اور ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عیسائیت نے یورپ کے تشخص اور تہذیبی اقدار میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ایک زمانہ میں یورپ کے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کس بہیمانہ طریقے سے ایک دوسرے کے گلے کاٹ رہے تھے اور ایک دوسرے کو دائرہ عیسائیت سے خارج کر رہے تھے۔ یورپ کی مذہبی وحدت کا نظام مارٹن لوتھر کی تحریک اصلاح کے بعد سے ختم ہو چکا ہے اور اس کا ایک واضح اظہار آج کے دور میں آئر لینڈ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں، یورپ ہی میں مشرقی عیسائیت کے وہ فرقے بھی موجود ہیں مثلاً گریک آرتھوڈکس چرچ، رشین آرتھوڈکس چرچ - جو مغربی عیسائیت کی مذہبی روایت کا نہ کبھی حصہ بن سکے اور نہ کبھی سمجھے گئے۔ مغرب کو ایک مذہبی (عیسائی) اکائی سمجھنے اور قرار دینے والے یہ بات بھی بھول جاتے ہیں کہ آج کے ۳۴ مغربی ممالک میں سے ۱۴ ممالک ایسے ہیں جہاں مسلمانوں نے سو سال سے بھی زیادہ حکومت کی ہے۔ تو پھر اسلام کو مغرب کے مذہبی شعور اور مغرب کی مذہبی روایت کا حصہ کیوں نہ سمجھا جائے؟ اس تاریخی حقیقت کے باوجود یورپ کی تاریخ اور اس کی خود تعبیری (Self-perception) سے مسلمانوں کی اس ''یاد'' کو یا تو محو کر دیا جاتا ہے یا اسے صرف کشمکش اور تصادم کا نام دیا جاتا ہے۔ گویا اس پوری تاریخ میں کوئی ثقافتی اور مذہبی تبادلہ ہوا ہی نہیں۔ کولمبیا یونیورسٹی کے رچرڈ بولیٹ نے اپنی ایک حالیہ تصنیف میں تاریخی اور تہذیبی اعتبار سے ''اسلامی/عیسائی تہذیب'' کے تصور کو زیادہ قرین قیاس قرار دیا ہے۔

مغرب کو ایک مذہبی (عیسائی) اکائی سمجھنے اور قرار دینے والے یہ بات بھی بھول جاتے ہیں کہ آج کے ۳۴ مغربی ممالک میں سے ۱۴ ممالک ایسے ہیں جہاں مسلمانوں نے سو سال سے بھی زیادہ حکومت کی ہے۔

اسی طرح ہم یہودیت کو کیوں بھول رہے ہیں، جس کے ماننے والے ہزار سال سے بھی زیادہ یورپ میں موجود رہے ہیں! البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی طرح یہودی بھی عیسائی مذہبی تشخص کے لیے ایک فریق دیگر (OTHER) کے طور پر موجود رہے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ان دنوں ''یہودی/ عیسائی روایت'' (Judeo-Christian Civilization) یا ''یہودی/ عیسائی تہذیب'' کی اصطلاح، عالم اسلام سے تصادم کے تناظر میں، جس بھائی چارے کے جذبات کے ساتھ مغرب میں استعمال کی جا رہی ہے، وہ جذبات دوسری جنگ عظیم کے بعد، بلکہ بڑی حد تک ۱۹۶۰ء کی دہائی کی پیداوار ہیں۔ آج سے صرف پچاس سال پہلے تک ہمیں مغرب کے کسی بھی معروف دانشور یا سیاست دان کے ہاں یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان بھائی چارے کے جذبات ملتے ہیں اور نہ ہی ان کی مشترکہ تہذیبی اقدار کا ذکر ملتا ہے۔ آج جن یہودیوں کو مغربی تہذیب کا جزو لاینفک بنا کر پیش کیا جا رہا ہے، انہی یہودیوں کو، محض یہودی ہونے کی بنیاد پر، اسی مغرب نے ساٹھ لاکھ کی تعداد میں موت کے گھاٹ بھی اتار دیا تھا۔ خود امریکہ میں آج سے پچاس سال پہلے تک یہ صورت تھی کہ جنوب کی اکثر ریاستوں میں سیاہ فام باشندوں کے ساتھ ساتھ یہودیوں پر بھی ''گوروں'' کے کلبوں اور ہوٹلوں میں داخلے پر پابندی تھی اور ہاورڈ یونیورسٹی نے اپنے بعض اہم شعبوں میں یہودیوں کے داخلے کے لیے ایک محدود کوٹا مقرر کر رکھا تھا۔

اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مغرب نہ تو ایک تہذیبی اکائی ہے، نہ تاریخی حقیقت ہے اور نہ ہی ایک مذہبی اکائی۔ میرے خیال میں مغرب کا تصور ایک سیاسی اور نظریاتی تشکیل (Construction) ہے۔ مغرب کو ایک نظریاتی اور سیاسی اکائی کے طور پر

ایک ٹھوس حقیقت کی حیثیت سے پیش کرنے کا رجحان سرد جنگ کے دنوں میں شروع ہوا جب مغرب کو امریکہ اور اس کے یورپی حلیفوں (بلکہ محض NATO) کے مترادف کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اس کے برعکس ''مشرق'' سے مراد سوویت یونین اور اس کے مشرقی یورپ کے حلیف ممالک تھے۔ یہ محض ایک نظریاتی سیاست کی تقسیم تھی، تہذیبی یا مذہبی اور جغرافیائی تقسیم نہیں تھی۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد یوں محسوس

> مغرب کے لیے مشرق کی ''روح'' اسلام میں نہیں بلکہ ہندوستانی اور چینی تہذیبوں میں ہے، اس لیے کہ اسلام کے آئینہ میں تو مغرب کو اپنا ہی مانوس چہرہ نظر آتا ہے

ہوتا تھا کہ ''مغرب'' اور ''مشرق'' کی یہ سیاسی اور نظریاتی تقسیم بے معنی ہو جائے گی اور بقول سابق صدر بش سینئر ایک ایسا نیو ورلڈ آرڈر تشکیل پائے گا جو ابھرتی ہوئی عالمگیریت کے اقتصادی تقاضوں سے ہم آہنگ ہوگا۔ لیکن ہوا یہ کہ سرد جنگ کے خاتمے کے فوراً بعد ''مغرب'' کے (یا یوں سمجھئے کہ امریکہ کے) دائیں بازو کے بعض دانشوروں نے ''تہذیبوں کے تصادم'' کا چرچا شروع کر دیا اور یوں عالمی سیاست میں ایک نئی تقسیم، یعنی تہذیبوں کی تقسیم کی بنا رکھی گئی۔ تہذیبوں کی اس تقسیم میں ان دانشوروں کے نزدیک (جن میں برنارڈ لیوس اور سموئیل ہنٹنگٹن پیش پیش تھے) فوری اور ناگزیر تصادم ''مغربی'' اور ''اسلامی'' تہذیبوں کے درمیان ہونا تھا۔ گویا ''مغرب'' کے لیے سوویت یونین کی جگہ اب ''اسلام'' ایک نئے OTHER کی حیثیت اختیار کر چکا تھا، جس کے مقابل میں مغرب کے لیے اپنے تہذیبی تشخص کو نمایاں (assert) کرنا ضروری تھا۔ تاہم میرے نزدیک، تہذیبی اصطلاحوں کے بے محل استعمال کے باوجود، تہذیبوں کی تقسیم اور تصادم کا نظریہ مذہبی اور تہذیبی اقدار کے اختلافات کا نہیں، سیاسی عوامل اور مفادات کی پیداوار ہے۔

''مغرب'' میں اس وقت دو بڑے کردار ہیں: ایک امریکہ اور دوسرا مغربی یورپ۔ امریکہ کے لیے اسلام کا چیلنج، خارجہ پالیسی اور نیشنل سیکورٹی کے حوالے سے ہے، اس لیے کہ امریکہ کے بین الاقوامی معاشی اور سٹریٹیجک مفادات عالم اسلام سے شدت کے ساتھ وابستہ ہیں اور عالم اسلام میں اسے اپنی بعض پالیسیوں کی وجہ سے شدید سیاسی اور جذباتی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ مسلمان حکمرانوں کی دوستی اور تعاون کے باوجود عوامی سطح پر امریکہ کو مسلمانوں کی عظیم اکثریت کی جس مخالفت کا سامنا ہے اس کی وجوہات سیاسی اور اقتصادی عوامل میں تلاش کرنا چاہئیں۔ اس مخالفت کو تہذیبی تصادم کا نام دینا خلط مبحث ہوگا۔

جہاں تک مغربی یورپ کا تعلق ہے تو اس کے لیے ''اسلام'' خارجہ پالیسی کا کم اور داخلی سیاسی تشخص کا مسئلہ زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی یورپ بڑی حد تک نسلی اور تہذیبی سطح پر کثیر الثقافتی (Multi-cultural) تجربہ سے ناآشنا رہا ہے۔ اس تناظر میں لگتا ہے کہ مغربی یورپ پر، گذشتہ ربع صدی میں مسلمان آبادی کے تیزی سے اضافے کے نتیجے میں ایک گہرے نفسیاتی خوف اور بے چینی کی کیفیت طاری ہو رہی ہے، اور شاید اسی کیفیت کو ''اسلام اور مغرب'' کی کشمکش کا نام دیا جا رہا ہے۔ ایک پہلو سے یہ کوئی عجیب یا انہونی بات نہیں ہے اور یہ ''مغرب'' ہی کے لوگوں کی خصوصیت نہیں ہے۔ قومیت پرستی کے اس دور میں۔ اور عالمگیریت کے باوجود۔ لوگوں کی یہ خواہش کہ وہ اپنے ہی جیسے لوگوں کے ساتھ رہیں، جو ان کے ہم مذہب و ہم زبان ہوں اور جن کی تاریخی یادیں بھی مشترک ہوں، اور ان کے اردگرد کوئی اجنبی گروہ نہ ہو، قابل فہم ہے۔

''اسلام اور مغرب'' کی اس بحث میں دوسرا عنصر ''اسلام'' ہے اور اسے بھی تشکیل نو (deconstruction) کی ضرورت ہے، کم از کم اس پہلو سے کہ مغرب اور اسلام کی بحث میں بالعموم ''اسلام'' سے کیا مراد لی جاتی ہے؟ باقی مذاہب کی طرح اسلام کا بھی ایک تجریدی اور مابعد التاریخی تصور ہے، جسے اکثر مغربی مفکرین اور اسلامی تحریکوں کے نظریہ ساز ایک جوہر (Essence) اور آئیڈیل کے طور پر پیش کرتے اور سمجھتے ہیں۔ مذہب کی یہ حیثیت اس وقت ہماری بحث سے خارج ہے، اس لیے کہ اپنی تجریدی صورت میں مذاہب ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہوتے۔ مذاہب کے درمیان کشمکش ان کے تاریخی اظہار کی شکلوں اور ان کے تحت قائم ہونے والے سیاسی اور معاشرتی قوت کے اداروں میں ہوتی ہے۔ چنانچہ ''اسلام اور مغرب'' کے درمیان تصادم کی جو باتیں آجکل سننے اور پڑھنے میں آ رہی ہیں، ان کا تعلق مابعد الطبیعاتی مسائل سے نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں اور اہل مغرب کے سیاسی رویوں، سیاسی پالیسیوں اور سیاسی کردار سے ہے۔

اہل مغرب کے دانشور جب ''اسلام اور مغرب'' کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہیں تو بالعموم وہ یہ نہیں بتاتے کہ ان کے تجزیے کی اساسی اکائی (unit of analysis) کیا ہے؟ یعنی ''اسلام اور مغرب'' کی ترکیب میں وہ ''اسلام'' سے کیا مراد لیتے ہیں؟ میں نے کئی مغربی مصنفین کو ایک ہی تحریر میں اسلام، اسلامی تحریکوں، مسلمان حکمرانوں، مسلمان معاشروں، مسلمانوں کی تاریخ کے مختلف ادوار، اسلامی مذہبی اور فلسفیانہ فکر اور صدام حسین، کرنل قذافی اور امام خمینی کو ایک ہی مفہوم میں استعمال کرتے دیکھا ہے۔ تو کیا یہ سب اسلام ہیں؟ برنارڈ لیوس ''اسلام اور مغرب'' پر بات کرتے کرتے

ایک ہی سانس میں خلافت راشدہ کی فتوحات، خلافت عثمانیہ، بوسنیا، سید قطب، سعودی نظامِ تعلیم، ڈنمارک کے کارٹونوں پر کابل اور اسلام آباد میں ہونے والے رد عمل، اور وہابی فکر کا ذکر اس طرح سے کرتے ہیں جیسے ان میں کوئی فرق ہی نہیں اور ان سب علامتوں کو ''اسلام'' کے ہم معنی سمجھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح سیموئیل ہنٹنگٹن بھی مغرب کے مقابلے میں اسلام کو اتنا لچک دار اور بے صورت (amorphous) سمجھتے ہیں کہ عالم اسلام کی ''خونیں سرحدیں'' (Bloody Borders) امام خمینی کی فکر، اور ترکی اور انڈونیشیا کی اسلامی جماعتیں اسلام کا مترادف بن جاتی ہیں۔ ایک بار ایک صاحب واشنگٹن کی ایک کانفرنس میں اسلام کے نظریۂ جنگ و امن پر تقریر کر رہے تھے اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اسلام صلح جوئی کا نہیں، جنگ وجدل کا مذہب ہے، انہوں نے جو دلائل دیے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ شام کے (سابق) صدر حافظ الاسد نے ابھی تک اسرائیل کے ساتھ صلح کے معاہدے پر دستخط نہیں کیے۔ یعنی اسلام کے نظریۂ جنگ و امن کا اصل حوالہ حافظ الاسد کا سیاسی رویہ ہے۔ یونیورسٹی آف شکاگو کے مارشل ہاجسن نے اسلام، Islamicate اور Islamdom میں جو تفریق کی تھی، اسے تو کم از کم پیش نظر رہنا چاہئے، یہ نہ ہو کہ جب کسی کا جی چاہے وہ اپنی سہولت کے لیے کسی ایک مسلمان فرد، جماعت، رسم، روایت، معاشرے اور تاریخی دور کو اسلام کا نام دے کر اس کا مقابلہ مغرب سے کرنے لگے۔ اب رہی ''اسلام اور مغرب'' کے درمیان کشمکش اور تصادم کی بات، تو اس سلسلہ میں دونوں جانب آگ لگانے والے لوگ موجود ہیں۔ تاہم فرق یہ ہے کہ انیسویں صدی کے نصف سے لے کر ۱۹۹۰ء کی دہائی تک مسلمانوں میں ''مغرب'' کے خلاف تصادم کی نوعیت خالصتاً سیاسی تھی۔ اس میں نہ تو ''تہذیبوں کے ٹکراؤ'' کا عنصر غالب تھا اور نہ ہی اس تصادم کو آسمانوں کی جنگ [یعنی مذہبی] سمجھا جاتا تھا۔ یہ ایک قابل فہم نوآبادیاتی نظام کے مملوکات محروسہ کی مزاحمت تھی، کاسمولوجیکل جنگ نہیں تھی۔ گویا ''ناگزیر تصادم'' کے نظریہ کی ابتداء عالم اسلام کے کسی نظریہ ساز سے نہیں، بلکہ اہل مغرب (امریکہ) کے دائیں بازو کے مفکرین، پالیسی ساز اداروں اور ری پبلکن پارٹی کے نیوکنزرویٹوز کی طرف سے ہوئی ہے۔ اسامہ بن لادن اور طالبان سے کئی سال پہلے برنارڈ لیوس نے اپنے مضمون میں ''تہذیبوں کا تصادم'' کی اصطلاح استعمال کرنا شروع کر دی تھی، جسے بعد میں سیموئیل ہنٹنگٹن نے شہرت دی۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی تک تو صورت یہ تھی کہ وہ اسلامی تحریکیں جنہیں آج مغرب دشمن قرار دیا جا رہا ہے اور جن کی بعض پالیسیوں (زیادہ تر بیانات) کی بنا پر ''تہذیبوں کے تصادم'' کی بات ہو رہی ہے، ''مغرب'' کے دوش بدوش - بلکہ مغرب کے تعاون اور اشتراک کے ساتھ - عالمی اشتراکیت کے خلاف مصروف جہاد تھیں۔ اس سے قبل ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائیوں میں بھی مشرق وسطیٰ، جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا کی بڑی بڑی اسلامی تحریکیں امریکہ کے ساتھ مل کر، عرب نیشنلزم، ناصرازم، عرب سوشلزم، اسلامی سوشلزم اور سوویت کیمونزم کے خلاف جنگ لڑ رہی تھیں۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں یہی اسلامسٹ ہی تو تھے جو امریکہ ہی کی اشیرباد سے امریکہ ہی کے حلیف کنزرویٹو عرب حکمرانوں سے افغان جہاد کیلئے چندہ جمع کر رہے تھے اور ''مشرق'' اور ''مغرب'' کی سرد جنگ کے ایک نہایت ہی فیصلہ کن اور نازک (critical) لمحے میں مغرب کے حلیف تھے۔ سوال یہ ہے کہ تہذیبوں کے ناگزیر تصادم اور آسمانوں کی جنگ کا نظریہ اس وقت کہاں تھا؟ یہ بات دونوں فریقوں سے پوچھی جانی چاہئے، مغرب کے ان نظریہ سازوں سے جو آج ''اسلام اور مغرب'' کے ناگزیر تصادم کا پرچار کر رہے ہیں، اور ان اسلامی گروہوں اور لیڈروں سے بھی جو ''مغرب'' کی مکمل تباہی تک ''جہاد'' کو جاری رکھنے کی باتیں کر رہے ہیں۔ جس طرح ہمارے ہاں کچھ مذہبی دانشور ایسے ہیں، جو عالم اسلام کی ایک تاریک اور مایوس کن تصویر پیش کرتے ہیں تاکہ مسلمانوں کو جوش دلایا جائے، اسی طرح کی سوچ اور فکر اہل مغرب کے بعض دانشوروں کے ہاں بھی اتنی ہی شدت کے ساتھ دیکھنے میں آتی ہے۔ مثلاً ہمارے ہاں کے بعض (بلکہ اکثر) مذہبی رہنما یہ کہتے ہیں کہ ہمارے حکمرانوں نے مغربی طاقتوں کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں، ہمارے دانشوروں نے مغربی فکر کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں، اور ہمارے رہنما معاشرتی، ثقافتی اور علمی مغربی اقدار کو غلاموں جیسی بے بسی کے ساتھ قبول کر چکے ہیں (اور کسی حد تک یہ باتیں درست بھی ہیں)۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بالکل اسی طرح کی گفتگو میں نے امریکہ اور یورپ میں بھی سنی ہے۔ پیو فاؤنڈیشن (Peo Foundation) کے ایک فورم میں، میں نے برنارڈ لیوس کو سنا۔ وہ مغرب کے حکمرانوں اور دانشوروں کی بزدلی اور شکست خوردہ ذہنیت کو کوس رہے تھے اور نہایت تأسف کے ساتھ آج کے حالات کا موازنہ ۴۰-۱۹۳۸ء کے دور سے کر رہے تھے جب مغرب ہٹلر کا مقابلہ کرنے اور اس کا راستہ روکنے کی بجائے اسے رجھانے (appease) کی کوشش کر رہا تھا۔ لیوس صاحب کا خیال تھا کہ آج کا مغرب چیمبرلین کی پالیسی پر چل رہا ہے جبکہ ضرورت اس وقت چرچل کی ہے۔ (اس پس منظر میں) کیا ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ عالم اسلام اور مغرب کے ان دونوں طبقات کا مقصد ایک ہے۔ یعنی خطرے کا ایک ہوا کھڑا کر کے اپنے اپنے لوگوں کو ایک بڑی تہذیبی جنگ کے لیے تیار کرنا اور افہام و تفہیم اور سیاسی جدوجہد کی بجائے جنگ جوئی کے راستے پر لگانا؟

یہ احساس ہوتا ہے کہ دونوں طرف کے کچھ لوگ (اور امریکہ میں ایسے لوگوں کی آوازیں نائن الیون کے بعد زیادہ زور شور سے سنائی دے رہی ہیں) سیاسی تنازعات کی جنگ نظریاتی بنیادوں پر لڑنا چاہئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں اس وقت

''اسلام اور مغرب'' کے مسئلہ کو ''دہشت گردی'' کے محور کے گرد گھمایا جا رہا ہے۔ ''دہشت گردی'' کے خلاف امریکہ نے جو حکمت عملی اختیار کی ہے، اس کے تین پہلو ہیں: ایک تو ہے "Bang Bang" جس کا مظہر ان دنوں عراق اور افغانستان میں دیکھا جا سکتا ہے۔ دوسری Law Enforcement جس کا اظہار Patriot Act اور گوانتانا موبے میں ہو رہا ہے اور تیسری حکمت عملی وہ ہے جسے ''نظریاتی جنگ'' کا نام دیا جا رہا ہے۔ ''اسلام اور مغرب'' کا مسئلہ دراصل اس تیسری حکمت عملی کا حصہ ہے۔ امریکہ کے دائیں بازو کے نظریہ ساز اور پالیسی ساز ایک نظریاتی جنگ برپا کرنا چاہتے ہیں اور یہ نظریاتی جنگ دو مختلف سطحوں پر لڑنے (یا لڑانے) کی باتیں ہو رہی ہیں: ایک سطح پر تو یہ جنگ ''اسلام اور مغرب'' کے درمیان ہے اور دوسری سطح پر خود اسلامی دنیا میں داخلی تہذیبی جنگ ہے، جو ان لوگوں کے نزدیک پہلی جنگ سے بھی زیادہ اہم ہے، یہ جنگ ہے ''اعتدال پسند'' اور ''شدت پسند'' مسلمانوں کے درمیان، یعنی ''اچھے'' اور ''برے'' مسلمانوں کے درمیان۔ تاہم ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ داخلی جنگ صرف اسلامی تہذیبی دنیا میں ہی برپا ہوتی نظر آتی ہے، اس کا کوئی مظہر، یا اس کی کوئی ضرورت ''مغرب'' میں دکھائی نہیں دیتی۔ وہاں تو گویا انتہا پسند موجود ہی نہیں ہیں، وہاں تو سب اعتدال پسند ہیں۔ یوں پوری اسلامی دنیا کو دو طبقات میں تقسیم کرنا اور وہ بھی مغرب کے بارے میں رویے کے حوالے سے، اوریئنٹلزم (استشراق) کی ایک نئی شکل ہے۔ بالفاظ دیگر اسلامی دنیا کی اپنی پہچان کے لیے بھی یہ دیکھنا ضروری ہے کہ مغرب کے بارے میں اس کا رویہ کیا ہے؟ یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ عراق میں امریکی قابض فوج کے خلاف جو لوگ مزاحمت کر رہے ہیں (مزاحمت کے طریقہ کار سے ہم کتنا ہی اختلاف کیوں نہ کریں) کیا وہ ''اسلام اور مغرب'' کی جنگ لڑ رہے ہیں؟ کیا اس مزاحمت کے لیے کوئی کم وزنی، سیاسی دلیل نہیں ہے؟ اگر آپ اسے ''دہشت گردی'' سے بھی موسوم کرنا چاہیں تو مجھے کوئی خاص اعتراض نہیں ہوگا، لیکن صدر بش اور ٹونی بلیر کی اس بات سے یقیناً مجھے اختلاف ہوگا کہ عراق میں وہ اسلاموفاشسٹ (Islamo-fascists) کے خلاف مغربی تہذیب کی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

اسی طرح ''اچھے'' اور ''برے'' مسلمانوں کی تقسیم بھی عجیب ہے۔ ۱۹۷۹ء کے ایرانی انقلاب کے بعد سلفی، وہابی اور سنی ''اچھے'' مسلمان تھے اور شیعہ ''برے'' مسلمان۔ اب صورت حال خاصی پیچیدہ ہوتی جا رہی ہے: لبنان میں سنی اچھے مسلمان ہیں لیکن عراق کے سنی برے مسلمان ہیں۔ عراقی شیعہ اچھے مسلمان ہیں مگر لبنانی شیعہ برے لوگ ہیں۔ تو پھر کیا اچھے اور برے مسلمانوں کی یہ تقسیم ایک Rhetorical device نہیں ہے؟ ژرژک نے گذشتہ دنوں ایک مضمون میں لکھا تھا کہ اسلام نہ صرف ''مغرب'' بلکہ خود ''مشرق'' کے لیے بھی ایک پیچیدہ تہذیبی مسئلہ ہے: مغرب والوں کے لیے وہ مشرق بن کر کھڑا ہو جاتا ہے اور مشرقی روحانیت کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے اور مشرق والوں کے سامنے وہ اپنی مغربیت کا رعب جھاڑنے لگتا ہے۔ اس طرح وہ دونوں کے لیے بیک وقت اچھا بننے کی کوشش میں دونوں کے لیے غیر بن جاتا ہے۔

تاہم مشرق و مغرب کی اس بحث کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مغرب کے لیے مشرق کی ''روح'' اسلام میں نہیں بلکہ ہندوستانی اور چینی تہذیبوں میں ہے، اس لیے کہ اسلام کے آئینہ میں تو مغرب کو اپنا ہی مانوس چہرہ نظر آتا ہے، مشرق کی پرکشش و پراسرار فضا (mystique) نظر نہیں آتی۔ اسی طرح مشرق کی دلہن سے مغرب کے دولہا کے ازدواجی تعلقات میں سب سے بڑی رکاوٹ اسلام ہے، جسے اپنی مردانگی کا اتنا ہی بڑا

اسلامک سنٹر آف کینیڈا

دعویٰ ہے جتنا کہ مغرب کو۔ ولفرڈ کینٹ ویل سمتھ صاحب سے میری واحد ملاقات ان کی وفات سے کچھ ماہ پہلے شکاگو کی ایک کانفرنس میں ہوئی۔ چائے کے وقفے میں، میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔ دوران گفتگو امریکہ اور عالم اسلام کے تعلقات کا ذکر آیا تو پروفیسر سمتھ صاحب نے کہا:

"One thing common between the US and Islam is that both do not want to be messed around."

(امریکا اور اسلام میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ یہ کہ دونوں فضول اور مکدر کرنے والے رویے کو پسند نہیں کرتے)

گویا اس بحث کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ ''اسلام اور مغرب'' کے درمیان اچھے تعلقات کی بنیاد اس بات پر رکھی جا سکتی ہے کہ امریکہ اور عالم اسلام کے ایک دوسرے سے mess-around نہ کریں۔ مغربی یورپ کے ممالک اپنی اپنی مسلمان آبادیوں کو عزت اور وقار کے ساتھ اپنے ہاں رہنے کے مواقع فراہم کریں اور مغربی ملکوں میں رہنے والے مسلمان اپنے اسلامی تشخص کو میزبان معاشروں کے مدمقابل لا کھڑا کرنے کی کوشش نہ کریں۔ یو ایس آئی ایس (USIS) کی ایک ٹیلی کانفرنس میں چند سال پہلے اسی ''اسلام اور مغرب'' پر گفتگو کے دوران پروفیسر ونسٹ کارنیل نے، جو سفید فام، اینگلوسیکسن نسل کے مسلمان ہیں اور جن کے باپ دادا دو سو سال سے بھی زائد عرصہ سے امریکہ میں آباد تھے، ایک موقع پر بہت جھنجھلاہٹ اور غصہ سے کہا: میری طرف دیکھیے! کیا میں ''مغرب'' نہیں ہوں اور کیا میں ''اسلام'' نہیں ہوں۔

اسلام مغرب اور جدیدیت

ڈاکٹر تمارا سون کالج آف کامن ولیم اینڈ میری کے شعبہ مذہبی امور میں سماجی علوم کی استاد ہیں

جدیدیت (modernity) ایک ایسا لفظ ہے، جس کا اصل مفہوم اس کی مختلف تعبیروں کی وجہ سے مبہم اور غیر واضح ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے ''اسلام اور جدیدیت'' کے موضوع پر ایک مکمل کتاب لکھی ہے لیکن اس اصطلاح کی تعریف اس کتاب میں نہیں کی گئی۔ عام طور پر ماڈرنٹی کو'ماڈرنزم' کے متبادل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جو ایک ملتی جلتی اصطلاح ہے مگر تیکنیکی طور پر اس کی تعریف مختلف ہے۔ مغرب میں جہاں یہ اصطلاح وضع کی گئی، ماڈرنزم سے مراد تیقن حاصل کرنے کا فلسفیانہ انداز ہے اور بنیادی طور پر اس کا انحصار وحی کی بجائے عقل پر ہے۔ اس اصطلاح کا آغاز ڈکارٹ کی ان کوششوں کی بنا پر ہوا جو اس نے بیّن اصولوں کو وضع کرنے اور شک وشبہ کی کیفیت پر غلبہ پانے کے لئے کیں تاہم اس اصطلاح کو کانٹ کے اس تنقیدی جائزے سے بھی منسوب کیا جاتا ہے۔ جو اس نے فلسفہ علم، اخلاقیات اور جمالیات کے بارے میں مرتب کیا۔ تیقن کے بارے میں اس دانشمندانہ اور عاقلانہ رویے کو مغربی سائنس کی ترقی کی بنیاد تصور کیا جاتا ہے یعنی وہ سائنسی انقلاب جسے عام طور پر زمانہ جدید کی پیداوار کہا جاتا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی اس پیش رفت اور یورپ کی سماجی وسیاسی تبدیلی کو، جو ایسے ہی مذہبی وسیاسی حاکمیت کے نظام سے جمہوریت کی طرف تبدیلی سے پیدا ہوئی، عام طور پر'ماڈرنٹی' کی بنیادی خصوصیات تصور کیا جاتا ہے۔

تاہم روزمرہ کی زبان میں الفاظ 'modernity' اور 'modernism' اکثر ضم کر دیے جاتے ہیں۔ ٹیکنالوجی کے لحاظ سے ترقی یافتہ معاشرے کے عام تصور میں جدید یورپی معاشرے کی ثانوی سیاسی ترقی کے تصورات بھی شامل ہو گئے ہیں جیسے سیکولرزم اور جدید معاشرے کے بہت سے ذیلی پہلو جیسے مادہ پرستی (materialism) اور الحاد (atheism)۔ مغرب سے باہر سیکولرزم، مادہ پرستی اور الحاد جیسے جدید معاشرے کے تصورات کی منفی تعبیر کی جاتی ہے، خاص طور پر مسلم دنیا میں جہاں اس پر تنقید کرنے کے لئے کہا جاتا ہے کہ یہ "جدید بنانے کا منصوبہ" ہے۔ مگر مغرب میں بھی ماڈرنٹی/ ماڈرنزم کا تنقیدی جائزہ بہت شدومد سے لیا جا رہا ہے اور مغرب میں جدید معاشرے کے کردار اور پیش قدمی کے بارے میں بھی واضح عدم اطمینان کی کیفیت موجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ جدید معاشرے کے مسلمان اور مغربی ناقدین کافی معاملات پر ایک سی رائے رکھتے ہیں۔ تاہم بدقسمتی سے ہم ایک ایسے دور میں رہ رہے ہیں، جس میں مغربی حکومتوں اور مسلم دنیا کے کچھ حصوں کے درمیان سیاسی تصادم کی فضاء پائی جاتی ہے اور سیاسی کشمکش کو اکثر اوقات فکری عدم موافقت کہا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں باہمی غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں، جو مشترکہ اقدار کو دھندلا کرنے کا باعث بنتی ہیں۔ مثال کے طور پر مسلم دنیا میں ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں، جو ٹیکنالوجی میں ترقی کی حمایت تو کرتے ہیں مگر وہ اقدار کے اس نظام کو رد کرتے ہیں، جس نے مغربی معاشرے کے ایک مخصوص تصور کو پوری دنیا میں صحیح یا غلط طور پر اتنا ناگوار بنا دیا ہے۔ لوگوں کی بڑی تعداد کی رائے ہے کہ جدید یورپی وامریکی معاشرے کے عقلیت پسندی (Rationalism) اور سیکولرزم کے تصورات میں ان ناگوار اقدار کا نظام پایا جاتا ہے۔ لہٰذا عقلیت پسندی (Rationalism) اور سیکولرزم کو اکثر غیر اسلامی یا اسلام مخالف خیال کیا جاتا ہے۔ ردعمل کے طور پر جب مغرب میں لوگ سنتے ہیں کہ مسلمان ریشنلزم اور سیکولرزم جیسے تصورات کو رد کرتے ہیں، تو ان کی سوچ یہ بن جاتی ہے کہ اسلام عقلیت پسندی کا مخالف ہے اور روایت پسندی، تھیوکریسی اور بنیاد پرستانہ طرز فکر کا حامی ہے۔

اس مضمون میں مذکورہ بالا غلط فہمیوں کی وضاحت کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ میں عقلیت پسندی، سیکولرزم اور ان پر کی جانے والی تنقیدی تحقیق کے بارے میں موجود غلط فہمی کے بارے میں بحث سے بات شروع کروں گی تا کہ اسلام اور مغرب کے درمیان پائی جانے والی مشترکہ اقدار کی نشاندہی کر سکوں۔ اس مقالے کا اختتام ٹیکنالوجی کی ترقی پر اپنے تبصرہ پر کروں گی اور یہی وہ شعبہ ہے جو جدیدیت اور ماڈرنزم پر تنقید کے حوالے سے علماء کی زیادہ توجہ کا مستحق ہے اور وہ اس حوالے سے ایک قابل قدر خدمت سرانجام دے سکتے ہیں۔

عقلیت پسندی

مغربی فلسفہ میں ریشنلزم کی بہت سی تعبیرات موجود ہیں۔ قدیم یونان میں حواس ظاہرہ کے ذریعے حاصل ہونے والے بظاہر غیر معتبر اور ناقابل پیشین گوئی نتائج سے گریز کی کوشش بھی ریشنلزم کی ایک تعبیر ہے۔ اس مقصد کو یقینی طور پر حاصل کرنے کے لیے

تجرباتی مشاہدات کی بجائے عقلی اصولوں پر انحصار کیا جاتا تھا۔ اس قسم کے عمیق عقلیت پسندی کا آغاز دورِ جدید میں بھی دوبارہ اس وقت ہوا، جب تیقن کے اجزاء ترکیبی کی تلاش شروع ہوئی۔ اس زمانے تک حواس سے حاصل کردہ علم اور بھی زیادہ اس قابل نہیں تھا کہ اسے متعین شکل میں پیش کیا جاتا۔ مثال کے طور پر حواس کے ذریعے حاصل کردہ علم کی وجہ سے لوگ خیال کرنے لگے تھے کہ چاند روشنی کا منبع ہے اور یہ کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے۔ یہ ایسے نظریات تھے جنہیں سائنسی ذرائع نے غلط ثابت کر دیا تھا۔ اس لئے چند مفکرین تمام علوم کی بنیاد حواس کے ذریعے حاصل شدہ معلومات سے گریز کر کے مستند ریاضیاتی اصولوں پر رکھنا چاہتے تھے۔

تاہم مغرب میں ''ریشنلزم'' اتنی بنیادی سطح کی چیز نہیں ہے۔ ''ریشنلزم'' کا عمومی مفہوم یہ ہے کہ حواس کے ذریعے حاصل کردہ علم ہمیں ایسا مواد فراہم کرتا ہے، جس کی بنیاد پر عقل اپنی سرگرمی دکھاتی ہے اور ہمیں علم فراہم کرتی ہے۔ جدید عقلیت پسند فلسفیوں نے معتبر اقوال کو غیر معتبر یا مشکوک اقوال سے الگ کرنے کے لئے اقوال کی اقسام یا سچائی کے دعووں میں امتیاز قائم کیا۔ امانیول کانٹ، زمانہ جدید کے مشہور فلسفی نے مشاہدے سے اخذ ہونے والے اور اس کے نزدیک قبل از تجربہ سامنے آنے والے تصورات یا لوگوں کے عمومی اندازِ تفکر میں پائے جانے والے فرق کو واضح کیا۔ مثال کے طور پر وہ کہتا ہے کہ ہم خود کار انداز سے فطرت کی ان قابلِ مشاہدہ چیزوں کا ادراک کر لیتے ہیں، جو اتفاقی طور پر آپس میں منسلک ہوں۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ حرکت پہلے سے ٹھہرے ہوئے جسم میں توانائی کے داخل کرنے سے پیدا ہوتی ہے، اگرچہ ہم توانائی کے انتقال کا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ ایسے تجربات کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ انہیں بالکل اسی طرح قابلِ انحصار سمجھا جا سکتا ہے، جس طرح تجزیاتی بیانات کو۔ تجزیاتی نتائج موضوع کی اس مخصوص تعریف سے اخذ کئے جاتے ہیں، جس سے ان کی تشکیل ہوئی ہو۔ مثال کے طور پر یہ نتیجہ کہ کوئی بھی چیز جس کی جسامت ہو، شکل رکھتی ہے۔ اس کے برعکس، ہمیں اپنے طور پر مربوط شدہ بیانات (Synthetic Statements) کے بارے میں زیادہ محتاط رہنا چاہئے جن میں دو ایسے اجزاء کو ملایا گیا ہو جو لازم نہیں کہ جوہری طور پر باہم متعلق ہوں۔

اسی طرح سے عقلیت پسندی محض رائے پر مبنی غیر یقینی صورتِ حال سے گریز کا اہتمام کرنا ہے۔ مگر دورِ جدید میں ریشنلزم نے اعلیٰ مذہبی طبقات کی طرف سے تعلیم دیئے جانے والے ناقص دلیل پر مبنی خیالات، مثلاً زمین کائنات کا مرکز ہے وغیرہ کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ ریشنلزم اس سیاست زدہ مذہبی نظام کا ردِ عمل ہے، جس نے اپنا مرکزی کردار برقرار رکھنے کے لیے ان صداقتوں کو رد کیا، جو اس نظام کی طرف سے کبھی پیش نہیں کی گئیں۔ عقلیت پسند عام طور پر ایسے تیقن کی اساس کے متلاشی رہے، جس سے نوعِ انسانی بڑے معتبر انداز سے ان جابرانہ طاقتوں کے خلاف دلیل لا سکے، جو مذہب کو اپنا غلبہ برقرار رکھنے کے لیے استعمال کرتی رہیں۔ لہٰذا ریشنلزم کو مذہب کے خلاف، ملحدانہ اور اخلاقیات سے بالکل عاری سمجھا جاتا ہے۔ تاہم، مذہبی سچائی کو برطرف کرنا کبھی بھی ریشنلزم کا منشا نہیں رہا، خاص طور پر اخلاقی تیقن جو کہ مذہبی سچائی سے حاصل ہوتا ہے، کبھی بھی ریشنلزم کے نشانے پر نہیں رہا۔ درحقیقت کانٹ کی بحث یہ ہے کہ نیکی اور فرض کے اساسی اخلاقی تصورات فطری (داخلی) ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ اخلاقیات کے ابتدائی اصول عیاں بالذات ہیں۔ اس کا ''عقلی اخلاقیات'' کا پیش کیا گیا اصول قطعی طور پر توجہ کا طالب ہے کہ: ''صرف اس قول پر عمل کرو جو بیک وقت آفاقی قانون پر بھی پورا اترے۔'' دوسرے الفاظ میں صرف وہی کام کرو جو ان اصولوں پر منحصر ہوں، جن کے بارے میں آپ سمجھیں کہ ان پر ہر ایک کو عمل پیرا ہونا چاہیے۔ مزید برآں کانٹ کا خیال تھا کہ وجود خدا اور آخرت کے بارے میں علم کا تجرباتی طور پر اگرچہ مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا مگر خدا اور آخرت کو اخلاقیات کے مقاصد کے مکمل فہم کے لیے بطور اجزاء ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے۔
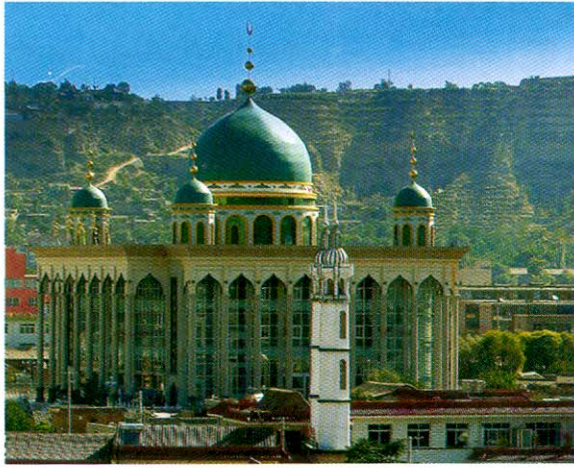
کانٹ خدا اور آخرت کے تصور کے بغیر اخلاقی دنیا کا تصور نہیں رکھتا مگر اس نے خدا اور آخرت کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ عقلیت پسند فلسفی ہوتے ہیں نہ کہ ماہرین مذہب۔ تاریخی سیاق وسباق کے تناظر میں عقلیت پسند خیال کرتے ہیں کہ ان کا کام یہ نہیں کہ وہ معلوم کریں کہ نیکی اور اخلاقیات انسانی فطرت میں مرکزی مقام کیوں رکھتے ہیں؟ یا خدا نے ہمیں اچھی فطرت پر پیدا کیا یا نہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس بحث کو دوسروں کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ اسی طرح، اگرچہ جدید معاشرہ جس کے پاس ٹیکنالوجی ہے، اس کی بنیاد محتاط استدلال کے اثرات پر ہے، تاہم مغرب میں بھی اکثر لوگ خدا کے بغیر اخلاقی دنیا کا تصور قائم نہ کر سکے۔ لہٰذا ریشنلزم کا دفاع کرتے ہوئے، اہلِ مغرب کی اکثریت سوچتی ہے کہ استدلال اور وحی آپس میں متصادم نہیں۔ وحی کے اندر بہت سے پہلو ایسے ہیں جو ہم سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں، مگر وحی کی اخلاقی تعلیمات عیاں بالذات ہیں۔ کوئی بھی آدمی جو معیاری ذہنی سطح کا حامل ہو، جس کی صاف انسانی فطرت کسی بے راہ روی یا ادویات وغیرہ سے خراب نہ ہوئی ہو، حقیقی اخلاقی تعلیمات کی اصابت کو تسلیم کرے گا۔ جس طرح قرآن پاک کی سورۃ ۱۴ میں ہے کہ ''نہیں چاہیے کہ وہ اپنی آنکھیں اور کان زمین کی سیاحت کرتے وقت'' یا ''آسمانوں میں اور اپنی

ذات میں نشانیاں دیکھتے وقت بروئے کار لائیں۔'' جدید ماہرین عمرانیات درحقیقت جدت کی بنیاد ایسے مذاہب میں تلاش کرتے ہیں، جن میں خدا کی وحدانیت کا تصور موجود ہے۔ ماہرین عمرانیات مثلاً پیٹر برگر وغیرہ خیال کرتے ہیں کہ خدا کی وحدانیت کا تصور قدیم پیگانزم (مظاہر فطرت کی پرستش) سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس میں خدا کو مکمل طور پر ماورائے ادراک اور خالق سمجھا جاتا ہے، کائنات سے باہر موجود ہے اور کائنات خدا کی محتاج ہے۔ تصور توحید کا خدا جو ایک ہے، افراد سے اخلاقی مطالبات بھی کرتا ہے۔ میکس ویبر کا کہنا ہے کہ اس کا نتیجہ فرد کی ذمہ داری کے تصور کی شکل میں نکلا اور یہی عقلیت پسندی کی بنیاد ہے لہٰذا دور جدید کی بنیاد بھی۔ اس کی نظر میں وحدانیت کے تصور سے سبق ملتا ہے کہ خدا نے انسانوں کو خاص صلاحیتیں ودیعت کیں اور ایک خاص مقصد دیا جس کی انہیں تکمیل کرنا ہے۔ خدا نے پھر ہمیں حکم دیا کہ ہم اس کی منشا کی پیروی کے لئے ان صلاحیتوں کو استعمال میں لائیں۔ ویبر سرمایہ داری نظام اور ترقی کی بنیاد (جو جدت کا باعث بنی) وحدانیت پر مبنی مذہبی تصور میں تلاش کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ خاص طور پر عیسائیت میں پروٹسٹنٹ فرقے نے قضاوقدر کے الہامی اعتقاد کی بنا پر لوگوں کو سخت محنت کے ذریعے مادی ترقی حاصل کرنے پر ابھارا تاکہ وہ ثابت کرسکیں کہ وہ خدا کے منتخب لوگ ہیں۔ واضح طور پر اس تصور کے مطابق جدت پسندی اور مذہب کے درمیان کوئی تصادم موجود نہیں، بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے سے باہم وابستہ دکھائی دیتے ہیں۔ فطری طور پر استدلال کی اہمیت کے اعتراف اور مذہبی اقدار کے درمیان کوئی کشمکش نہیں پائی جاتی۔ درحقیقت مغرب میں اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ استدلال کی اہمیت مذہب یا اخلاقیات کے سیاق وسباق میں ہوتی ہے۔ یعنی اس کی ضرورت تب ہوتی ہے، جب اسے صرف اخلاقی مقاصد کے لیے استعمال کیا جانا مطلوب ہو۔ جب اجتہاد کا ذکر ہو تو مغرب میں طلباء کا ردعمل تائید کرنے والا ہوتا ہے۔ بہت سے طلباء کلاس روم میں اسلام کے روایتی نظریات کے ساتھ آتے ہیں، جو انہوں نے ''مغربی سائنس'' کے مناظرانہ الزامات سے اخذ کیے ہوتے ہیں اور ان کا مطالبہ ہوتا ہے کہ مغربی سائنسی علوم کو 'اسلامی علم' سے بدل دیا جانا چاہیے۔ مغرب میں اسلام کے طالب علموں کا خدشہ ہوتا ہے کہ مسلمان استدلال کو رد کرتے ہیں اور اسے روایت کی اندھی تقلید کے ساتھ بدلنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ رائج الوقت غلط خیالات اس وقت رد کردیئے جاتے ہیں، جب وہ اسلامی تعلیمات میں علم کے حصول کے بارے میں انسانی ذمہ داری، خدا کی مرضی کو پورا کرنے کے لیے عقل کے استعمال، بدلتے ہوئے مخصوص حالات میں خدا کی منشاء کے نفاذ کے بہترین طریقوں کے بارے میں پڑھتے ہیں۔

بلاشبہ یقین تک پہنچنے کے لیے صرف استدلال پر انحصار کرنے میں خطرہ پوشیدہ ہے اور اسلام کا مطالعہ کرنے والے مغربی طلباء اس پر بحث کرنے کے لیے تیار ہیں۔ غلامی، نوآبادیاتی نظام اور نسل پرستی جیسی انتہائی ظالمانہ زیادتیوں کو بلاشبہ اخلاقی اصولوں کے خلاف گردانا جاتا ہے۔ درحقیقت یہی وجہ ہے کہ ایک انصاف پر مبنی معاشرے کے قیام کے لیے بطور بنیاد جدید رجحانات کے خلاف ردعمل کے طور پر ایک نظریے کا ظہور ہوا، جسے پس جدیدیت (Postmodernism) کہا گیا کیونکہ کانٹ کے مطابق ''خالص استدلال'' ایک منصفانہ معاشرے کے قیام کے لیے ناکافی ہے۔ مشہور اسکالر اڈورڈ سعید سے جب جدیدیت کے حوالے سے ان کے تنقیدی مضمون کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا ''میرا خیال ہے کہ مجھے جو بات اکثر متاثر کرتی ہے وہ ناانصافی پر غصہ کرنا، ظلم کی عدم برداشت، آزادی اور علم کے بارے میں بہت ہی غیر حقیقی خیالات ہیں''۔ لہٰذا بیسویں صدی کے آخر میں اٹھنے والی تحریک جسے post modernism کہا جاتا ہے ماورا ادراک یا آفاقی اقدار کو رد نہیں کرتی (جیسا کہ عموماً کہا جاتا ہے)، بلکہ عاقلانہ نتائج میں سے اخلاقیات کے اخراج پر تشویش کا اظہار کرتی ہے۔ مغرب میں بہت سے اسکالر عقلی تیقن اور اخلاقی تیقن کے درمیان فرق کو تسلیم کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ طلباء علامہ محمد اقبال استدلال کے کام، خاص طور پر ان کے تصور ''فکر اسلامی کی تشکیل جدید'' Reconstruction of Religious Thought in Islam کو بہت سراہتے ہیں۔ عقلی تیقن صرف استدلال سے ہی جنم لیتا ہے۔ جب کہ اخلاقی تیقن داخلی ایمان پر منحصر ہے جو عقل کی پہنچ سے دور ہے۔ مگر پھر بھی استدلال بطور سرگرمی کی بنیاد کو رد نہیں کیا جاسکتا نہ ہی اخلاقی تیقن عقلیت پسندی کی جگہ لے سکتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں یعنی نہ ہی عقیدہ عقل کے بغیر کسی کام کا ہے اور نہ ہی عقل عقیدے کے بغیر کسی اہمیت کی حامل ہے۔

> جب مغرب میں لوگ سنتے ہیں کہ مسلمان ریشنلزم اور سیکولرزم جیسے تصورات کو رد کرتے ہیں تو ان کی سوچ یہ بن جاتی ہے کہ اسلام عقلیت پسندی کا مخالف ہے اور روایت پسندی، تھیوکریسی اور بنیاد پرستانہ طرز فکر کا حامی ہے۔

سیکولرزم

معاصر اسلامی مباحث میں سیکولرزم کو عقلیت پسندی (Rationalism) کی نسبت زیادہ برا سمجھا جاتا ہے۔ عام طور پر اسے ایک آئیڈیالوجی یا نظریہ سمجھا جاتا ہے اور اس کی تعبیر ایسے کی جاتی ہے کہ جیسے یہ کوئی بہت ہی ناپسندیدہ چیز ہو۔ عبدالوہاب المسیری اپنے ایک مضمون ''سیکولرزم کے جامع اور مفصل اصول وضوابط'' میں سیکولرزم کی معیاری تعریف ''چرچ اور ریاست کی علیحدگی'' کو رد کرتے ہیں مگر وہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ تعریف شہرت حاصل کرچکی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ سیکولرزم کی اگر پیچیدہ تعریف کی جائے تو یہ دنیا کے بارے میں ایک مجموعی نقطہ نظر، ایک خاص فلسفہ زندگی اور ایک ایسا جامع اصول ہے، جو حقیقت کی تمام سطحوں پر بہت سے مخفی اور صریح

طریقوں کے ذریعے عمل پیرا ہوتا ہے۔ یہ جدید مغربی تہذیب میں اساسی اور غالب اصول ہے اور اسی طرح تمام جدتوں میں کارفرما ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نتیجتاً سیکولرازم ایسا پیراڈائیم ہے جو کئی مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ اور وہ ان مسائل کو ''موجودہ تہذیب کا بحران'' کہتا ہے۔ وہ مسائل حسب ذیل ہیں:

''ترقی کا خمیازہ، مقدار، ہر شعبہ زندگی میں مشینوں کا تعارف، معیار بندی، حالت بیگانگی، مفہوم ومقصود کا بحران، افادی اقدار کا غلبہ، فلسفہ نسبیت (یہ نظریہ کہ علم/اخلاقیات اضافی چیز ہے اور زمان ومکان اور انفرادی تجربات پر منحصر ہے)، معاشرتی انتشار، دستور فراموشی، معاہدہ بندی کا بڑھتا ہوا رجحان، کسی تنظیم کے مفادات کا تحفظ بالمقابل تنظیم میں سول سوسائٹی کے مفادات کے تحفظ کا مسئلہ، ریاست کی فرد پر غیر ضروری پابندیاں، کمپنیوں اور بیوروکریسی کی بالادستی، ادارہ خاندان کا زوال، انحطاط شناخت، فرد کی پستی، انسان کو مرکز نہ بنانا، انسان دوستی کے خلاف فلسفوں کا ظہور، فلسفیانہ تشکیک، بین الاقوامیت یا عالمگیریت، انفرادی شناخت اور خلوت کا خاتمہ، دنیا پر امریکی غلبہ، غیر ممالک کی ثقافت، تجارت اور اقدار پر امریکی کنٹرول، جدید ٹیکنالوجی اور روزمرہ کے استعمال کی اشیاء کی بھرمار، تصور کی تجسیم، اشیاء پرستی، ترقی سے بے جا عقیدت، تبدیلی اور فیشن کا رجحان، کنزیومرزم، فوری تسکین حاصل کرنے کا کلچر، خودفریفتگی کا کلچر، جدید دنیا بطور آہنی شکنجہ، خالق ومخلوق کے فنا کا نظریہ، دنیا سے اچاٹ پن، بے جا قومی امتیاز کا احساس، نسل پرستی، فحش نگاری، مفہوم کی تشکیل نو، سلب انسانیت، وغیرہ''۔

جناب المسیری سیکولرازم کو ملحدانہ نظام سے منسوب نہیں کرتے جبکہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن اسے الحاد کا خاصہ قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے سیکولرازم کے بارے میں صرف یہ کہا ہے کہ یہ ''جدیدیت کا زہر قاتل'' ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سیکولرازم تمام اخلاقی اقدار کے تقدس اور ہمہ گیریت (ماورائیت) کو پامال کرتا ہے اور یہ ایک ''لازماً ملحدانہ نظام'' ہے۔

اگرچہ فضل الرحمٰن میرے رہنما ہیں اور میں انہیں بہت ہی قابل احترام شخصیت سمجھتی ہوں لیکن اس بات کی نشاندہی ہونی چاہئے کہ سیکولرازم کے بارے میں یہ یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ملحدانہ نظام ہے اور میں نہایت ادب کے ساتھ جناب عبدالوہاب المسیری کے گوش گزار کرنا چاہتی ہوں کہ سیکولرازم کوئی نظریہ نہیں ہے۔ ہمارے لیے مناسب ہوگا کہ ہم جدید معاشرہ کے تمام مسائل کو سیکولرازم کے معیار پر پرکھیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ سیکولرازم صرف ایک سماجی ڈھانچہ ہے جس نے مقدس رومن سلطنت کے ٹوٹنے کے ساتھ ہی جدید یورپ میں فروغ پایا۔

دو متضاد مسائل جن کا سیکولرازم حل چاہتا ہے، ان کا موازنہ کر کے سیکولرازم کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اولاً قرون وسطیٰ کے پادریوں کا حد سے زیادہ آخرت پر اصرار تھا جو اپنے پیروکاروں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے کہ وہ صرف آخرت کے بارے میں فکر کریں۔ انہیں دنیاوی امور کے بارے میں فکر کرنے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ دنیاوی امور کو لالچ اور بدعنوانی کا دنگل سمجھا جاتا تھا۔ انہیں غربت اور اپنی تکالیف کے بارے میں شکایت کرنے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ یہ چیزیں آخرت میں ان کے لیے اعزاز و اکرام کا باعث تصور کی جاتی تھیں۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ عام لوگوں کو سیاست میں حصہ لینے کی اجازت نہیں تھی اس لیے کہ سیاست کرنا ان کے بس کی بات نہیں سمجھی جاتی تھی اور یہ تصور کیا جاتا تھا کہ اگر وہ سیاست میں حصہ لیں گے تو ان کی زندگی بلاشبہ آلودہ ہو جائے گی۔

سیکولرازم کے نام سے جو ایک نظام سب سے پہلے متعارف ہوا اس کا مآخذ لاطینی اصطلاح SAECULA ہے، جس کے معنی ہیں وقت کا اکھاڑہ یہ (aeterna) کے برعکس ایک اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں لامتناہی الہامی دنیا۔ یہ سیکولرزم ایک ایسی تحریک تھی جس کے ذریعے تمام اہل عقیدہ کی حوصلہ افزائی کی گئی کہ وہ اس دنیا کے بارے میں فکر کریں، تعلیم حاصل کریں، ظلم اور بدعنوانی کے خلاف جنگ کریں اور اپنی اور معاشرہ کی فلاح و بہبود کی ذمہ داری سنبھالیں۔ بعد میں سیکولرازم سے یہ مفہوم لیا جانے لگا کہ یہ ایک ایسا عقیدہ ہے جس کی رو سے کسی بھی مذہبی جماعت کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ دوسروں کی تعلیم کے بارے میں حکم چلائیں۔ صدیوں تک لوگوں کو جبری طور پر عقیدہ تبدیل کرنے کے دور کے بعد جب یہ عقیدہ غالب ہو گیا تو مذہبی تعلیم کو سرکاری سکولوں سے ختم کر دیا گیا۔ والدین کو یہ حق اور ذمہ داری دی گئی کہ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ ان کے بچے ان کے اپنے پسند کے مذہبی اصولوں کے مطابق تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔
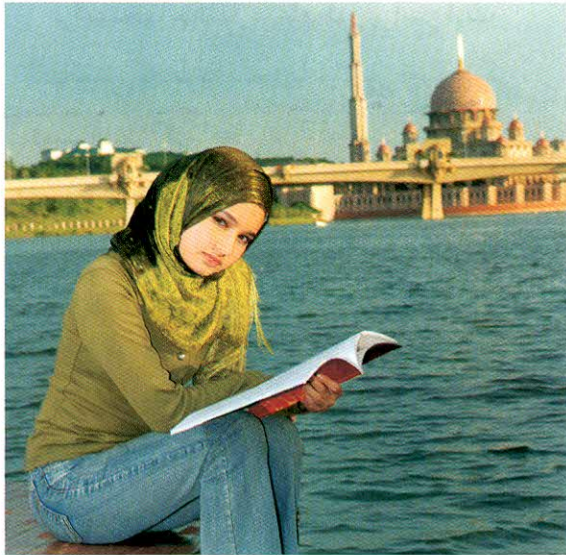
بلاشبہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ کوئی ماورائی اقدار نہیں ہیں اور در حقیقت کچھ ایسے ملحد لوگ بھی موجود ہیں جن کا عقیدہ سیکولرازم کے مفہوم سے مختلف ہے۔ سیکولرازم مذہبی اقدار کو رد نہیں کرتا بلکہ معاشرہ یا سیاست میں مذہبی اقدار کے کردار کو رد کرتا ہے۔ یورپ اور امریکہ کا کوئی شخص مذہبی سکولوں کو بند کرنے کے لیے نہیں کہتا۔ حقیقی صورت حال یہ ہے کہ مغرب میں مذہبی سکولوں کی مقبولیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ مزید برآں، اگرچہ کچھ لوگ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ کلی

طور پر ماورائی اقدار سے رجوع کیے بغیر سیاسی فیصلے کر سکتے ہیں، عمومی طور پر ''اقدار سے بے نیازی'' (Value free) کی اصطلاح ایک افسانہ کے طور پر سامنے آئی ہے۔

علاوہ ازیں یہ بات واضح ہے کہ مذہب اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ معاشرہ میں الہامی اقدار پر عمل ہوگا، یہاں تک کہ سرکاری مذہب کی موجودگی میں بھی یہ ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ اس معاشرے میں الہامی اقدار پر عمل ہوگا۔ کلیسائی حاکمیت کے زیر اثر یورپ کی تاریخ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے، جیسا کہ رشید الغنوشی جو تیونس کے ایک مشہور و معروف مسلمان مفکر ہیں، انہوں نے اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ مذہبی و سیاسی نظام کے غالب ہونے اور اس کی مداخلت کے باعث سیکولرازم نے فروغ پایا۔ فی الحقیقت مختلف النوع با اختیار مذہبی سیاسی نظاموں میں سے ہر ایک نظام مذہبی اقلیتوں کے لیے امتیازی سلوک اور سخت گیری پر مبنی تھا۔ اس تناظر میں جدید یورپی اور امریکی دنیا میں امن کے لیے یہ لازمی ہو گیا تھا کہ ریاست کے جابرانہ اختیار سے مذہبی اختیار کو علیحدہ کیا جائے۔ جدید یورپی اور امریکی دنیا میں شہریت کسی مخصوص عقیدے سے وابستگی کی بنیاد پر مزید مبنی نہیں رہی تھی بلکہ شہریت کی اساس ایسے حقوق اور ذمہ داریاں تھیں، جو برادری کے ارکان کے مذہب سے قطع نظر ان کے درمیان تقسیم تھیں۔

معاصر اسلامی مباحث میں سیکولرزم کو عقلیت پسندی (Rationalism) کی نسبت زیادہ برا سمجھا جاتا ہے۔ عام طور پر اسے ایک آڈیالوجی یا نظریہ سمجھا جاتا ہے اور اس کی تعبیر ایسے کی جاتی ہے کہ جیسے یہ کوئی بہت ہی ناپسندیدہ چیز ہو۔

دوسرے لفظوں میں جابرانہ قوت اور مذہبی حاکمیت کی علیحدگی کثیر المذہبی معاشرہ میں امن قائم کرنے کا ذریعہ تھا۔ مختلف عقائد رکھنے والے لوگوں کو مذہبی آزادی دینے کا یہ ایک طریقہ تھا اور اس مذہبی آزادی کو قانونی تحفظ دیا گیا تھا تاکہ کوئی سرکاری مداخلت نہ ہو یا رکاوٹ نہ ڈالی جا سکے مگر اس میں اس بات کی شرط تھی کہ لوگ دوسروں کے حقوق کا احترام کریں گے۔ یہی وہ نظام ہے جسے مغرب کے زیادہ تر لوگ سیکولرزم سمجھتے ہیں۔ ہمیں سورۃ بقرہ (۲:۲۵۶) میں جو تعلیم دی گئی ہے، ان کے نزدیک بالکل یہی سیکولرزم ہے: ''مذہب میں کوئی جبر نہیں ہے''۔ علی ہذا القیاس، مغرب میں انتہائی مخلص مذہبی لوگ کٹر سیکولر ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہبی اقدار کے حقیقی مفہوم کو روز مرہ کے امور میں تلاش کیا جا سکتا ہے اور ان کی تعمیل کی جا سکتی ہے۔ مذہبی اقدار کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ آپ مہربانی سے پیش آئیں، وزن پورا تولیں، کاروباری معاملات میں ایمانداری کا مظاہرہ کریں، ضرورتمندوں کی مدد کریں اور ظلم کو روکیں۔

اگر ہاتھ سے نہیں روک سکتے تو زبان سے روکیں اور اگر یہ نہیں تو کم سے کم دل سے ظلم کو برا مانیں۔ یہ معروف حدیث کی عبارت ہے۔ تاہم یہ لوگ یہ نہیں چاہتے کہ ریاست مذہبی تعلیم کو چلائے۔ وہ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ انہیں اپنے بچوں کو اپنی پسند کے مذہب کی تعلیم دینے کی اجازت ہونی چاہیے۔

اس طرح سے مجموعی طور پر سیکولرزم مذہب کو رد نہیں کرتا بلکہ یہ مذہب کی جابرانہ قوت کو رد کرتا ہے اور یہ بذات خود ایک اخلاقی قدر ہے اور یہ اخلاقی قدر کئی مذاہب کے اندر موجود ہے۔ اسلامی معاشرہ کی تاریخ اور ڈھانچہ یورپی عیسائی معاشرہ سے بہت مختلف ہے، تاہم یہ بات صحیح ہے کہ قدیم اسلامی سیاسی نظریہ جیسا کہ چوتھی صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی میں شافعی فقہ کے ماہر الماوردی نے بیان کیا ہے، کی رو سے مذہبی حاکمیت کو تنفیذی یا انتظامی طاقت سے الگ ہونا چاہیے۔ الماوردی کے نزدیک خلیفہ کا عہدہ اس لیے قائم کیا گیا تھا کہ خلیفہ اسلام کے سپہ سالار اور دنیاوی امور کے منتظم کی حیثیت سے پیغمبرؐ کے کام کو جاری رکھ سکے۔ الماوردی کے مطابق خلیفہ کے فرائض میں تین چیزیں آتی ہیں: دفاع، خزانہ اور انتظام و انصرام۔ خلیفہ کو اپنے علاقہ کے شہریوں کو حملہ سے بچانا، سرحدی علاقہ کے دفاع کو قائم رکھنا اور ان لوگوں کے خلاف جنگ کرنا جو یا تو مسلمان بننے سے انکار کریں یا مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کرنے سے انکار کریں۔ بطور امین خلیفہ کا کام زکوٰۃ اور جائز مال غنیمت وصول کرنا، منصفانہ طور پر تنخواہیں مقرر کرنا اور خزانہ سے ان کی ادائیگی کرنا اور اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ جن لوگوں کا انہوں نے تقرر کیا ہے، وہ ایمانداری سے خزانے کی رقم کا استعمال کریں۔ مسلمہ مذہبی اصولوں کو تحفظ فراہم کرنا اور عدالتی فیصلوں اور سزاؤں کے نفاذ کو یقینی بنانا خلیفہ کی سب سے اہم ذمہ داریاں ہیں۔

الماوردی نے خلیفہ کی معیاری اہلیت میں یہ بات بھی شامل کی ہے کہ خلیفہ اجتہاد کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ لیکن انہوں نے یہ بات نہیں کہی کہ خلیفہ کا کام قانونی فیصلے بھی کرنا ہے، اس لیے کہ خلافت عباسیہ کے دور میں قانون سازی کا اختیار اعلیٰ تربیت یافتہ قانونی سکالرز (فقہاء) کو تفویض کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا قدیم نظریہ کی رو سے مذہبی سکالروں سے مشاورت کے سلسلے میں خلیفہ مقلد ہو سکتا ہے (قانونی نظیر پر عمل کرنے والا یا مقلد، نہ کہ ایک آزاد مفکر) اسلامی سیاسی نظریہ کا واضح اصول یہ ہے کہ اسلامی قانون سیاسی حاکمیت کے جواز کا حتمی مأخذ ہے۔ دوسرے الفاظ میں قانون سازی کا اختیار تکنیکی طور پر انتظامی اختیار سے الگ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں سیاسی (حاکمانہ یا جابرانہ) اختیار کو مذہبی (قانون سازی) کے اختیار سے الگ رکھا گیا ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ مذہب کو سیاست سے الگ کر دیا گیا ہے، تاہم سیاسی اختیار نظریاتی طور پر اسلامی قانون کے تحت ہے۔ اس سے یہ مراد ہے کہ مذہبی اختیارات سے جابرانہ اختیار کو نکال دیا گیا ہے، جیسا کہ مغرب میں ہوا لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ مذہب کو سیاست سے نکال دیا گیا ہے۔ مغرب میں بالکل اسی طرح کا طریقہ کار موجود ہے، جیسا کہ اسلام میں ہے یعنی کہ سیاسی اور انتظامی

اختیارات ملکی قانون کے پابند ہونے چاہئیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ مغرب میں ملکی قانون کا انحصار تاریخی طور پر عیسائی قانون پر رہا ہے، تاہم مغربی قانون میں تمام مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد کو آزادی حاصل ہے اور یہاں تک کہ ان لوگوں کو بھی حقوق حاصل ہیں، جو کسی مذہب سے تعلق نہیں رکھتے۔ اس مغربی نظام قانون کا متبادل [اسلام میں] غیر مسلموں کے اس حق کے اسلامی تحفظ کی صورت میں موجود ہے جس کے تحت کسی اسلامی ریاست میں بھی غیر مسلم اپنے مذہبی قوانین پر عمل کر سکتے ہیں۔ یہ نظام واضح طور سے مغربی سیکولرازم سے مختلف ہے۔ جس طرح سیکولرازم مذہب کے خلاف نہیں ہے یا اپنی نوعیت کے اعتبار سے ملحدانہ نہیں ہے، اسی طرح اسلامی نظام بھی ملائیت پر مبنی نہیں ہے۔ حقیقت میں وہ عنصر جو سیکولرازم اور اسلام میں مشترک ہے وہ مذہبی آزادی کا احترام اور مذہبی جبر کی نفی ہے۔

ترقی

مغربی اور اسلامی دنیا دونوں میں بہت سے لوگوں کے ذہن میں ترقی کا مفہوم ٹیکنالوجی کے حوالے سے ترقی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ مغرب میں جو کچھ ''فائدہ مند'' ہے اسے قبول کر لیا جائے اور باقی چیزوں کو رد کر دیا جائے۔ یہاں فائدہ مند چیزوں سے مراد ٹیکنالوجی کی ترقی ہے۔ بعض مسلمانوں کی رائے یہ ہے کہ ٹیکنالوجی کو اپنانے کے ساتھ ساتھ روائتی اسلامی تعلیمات کو بھی ملحوظ رکھا جائے تا کہ ٹیکنالوجی کی ترقی کو اسلامی طریقے کے مطابق استعمال کیا جا سکے۔ یوں دلیل دی جاتی ہے کہ اس ترقی کو اچھے مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے اور مغرب کی طرح محض دولت اور طاقت حاصل نہ کی جائے۔
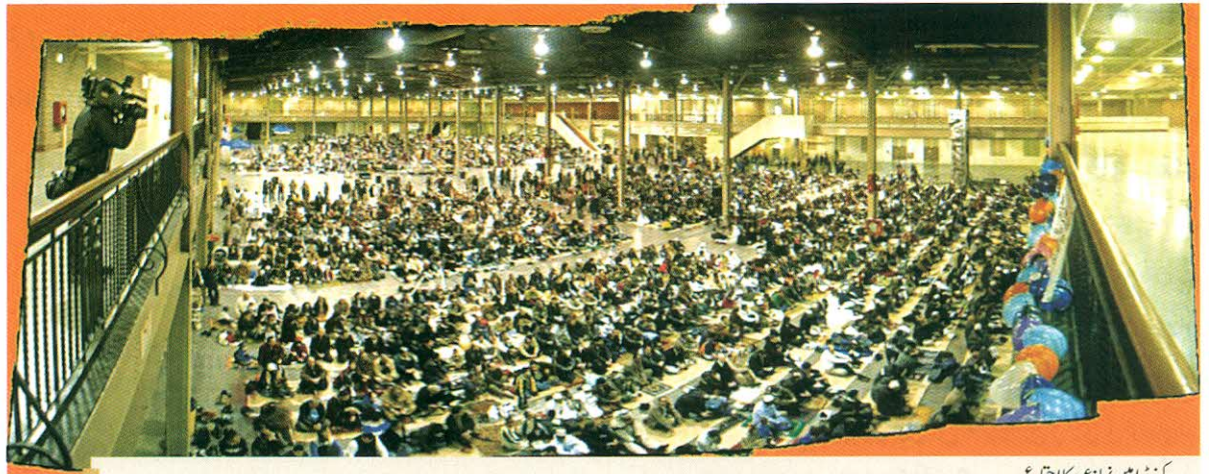
کینیڈا میں نماز عید کا اجتماع

تاہم میں اسے بہت ہی بد قسمتی سمجھتی ہوں کہ ترقی کو ٹیکنالوجی سے منسوب کر لیا گیا ہے۔ میں اس بات پر یقین نہیں رکھتی کہ یہ رائے توحید پر مبنی کسی بھی مذہب کی اقدار کے مطابق ہے۔ یہ قابل فہم ہے کہ مغرب میں ''ترقی'' کو غیر معترضانہ طور پر ٹیکنالوجی کی ترقی سے منسوب کیا جاتا ہے، جہاں جدید ٹیکنالوجی میں ترقی برپا ہوئی ہے (اگر چہ ٹیکنالوجی کے میدان میں حاصل کی گئی یہ ترقی سائنس اور ریاضی پر مبنی ہے اور ان مضامین کو مسلم دنیا میں فروغ حاصل ہوا اور یہاں سے یہ مضامین مغرب منتقل ہوئے۔) یہ وہ مقام ہے جہاں مسلم دنیا فی الحقیقت مغرب کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ ہے۔

اسلام میں ''ترقی'' کے تصور کو کسی بھی صورت محض ٹیکنالوجی یا دولت کی پیداوار سے منسوب کر کے گھٹایا نہیں جا سکتا۔ دیگر روایات کے مقابلے میں اسلام کی واضح خصوصیت یہ ہے کہ اسلام میں انسانی ذمہ داری پر بہت زور دیا گیا ہے اور انسانی ذمہ داری یہ ہے کہ انسان انفرادی اور اجتماعی طور پر خدا کی مرضی کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالیں۔ یہ ذمہ داری ہمیں قانونی ڈھانچہ اور مذہبی فرائض کی ادائیگی میں نظر آتی ہے۔ قرآن اس ذمہ داری کو تاریخ میں جگہ دینے پر زور دیتا ہے اور یہ تاکید ماورائے زمان نہیں ہے۔ لوگوں کا عقیدہ، ذمہ داری اور الہامی ہدایت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہماری سماجی تاریخی تناظر میں نظر آنا چاہئے۔ اس کا آغاز امانت سے ہوتا ہے، جس کی ذمہ داری اٹھانے کا وعدہ بنی نوع انسان نے اپنی تخلیق کے وقت کیا۔ یہ وہ وعدہ تھا جس کے تحت ہم نے خلیفہ اور نائب کی حیثیت سے کردار ادا کرنا تھا تا کہ معاشرہ میں ایسی مساوات دوبارہ قائم کی جا سکے، جس طرح کہ بنی نوع انسان مساوی پیدا کیے گئے ہیں۔ راستہ (الشریعت)، راہ عمل (السبیل) دکھائے گئے ہیں۔ ''راہنمائی'' (ہدیٰ) قرآن کے ذریعے مسلسل فراہم کی گئی ہے، جسے ہر مرتبہ پڑھنے اور تلاوت کرنے سے رہنمائی حاصل ہوتی رہتی ہے۔ یہ راہنمائی وہ معیار قائم کرتی ہے، جس کے ذریعے ہم راہ عمل میں اپنی ترقی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہ ایسے معاشرہ کی مثال پیش کرتا ہے جو انصاف پر کار بند ہونے کے حوالے سے متحد ہو، ایک ایسا معاشرہ جس کی صحت کے معیار کا اندازہ اس معاشرے میں رہنے والے سب سے زیادہ کمزور افراد کی فلاح و بہبود سے لگایا جا سکے نہ کہ ریاست کی خام ملکی پیداوار (جی ڈی پی) یا اوسطاً فی کس آمدنی سے۔ اس راہنمائی کی موجودگی میں معیار کی حیثیت سے ٹیکنالوجی کی ترقی پر غور کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جس کے ذریعے ہم ترقی کا اندازہ لگاتے ہیں۔

انصاف کو فروغ دینے اور ظلم کے خاتمے میں کامیابی حاصل کرنے کے مقابلے میں ٹیکنالوجی کی بنیاد پر ترقی حاصل کرنے کو ترقی کا معیار قرار دینا محض شرک ہے۔

ترقی کے اسلامی تصور کی اہمیت سمجھنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح سے ''روحانیت'' اور ''سیکولر'' کے درمیان اس فرق کو ختم کیا جا سکتا ہے جو قرون وسطیٰ کی عیسائیت میں بہت نمایاں ہو گیا تھا۔ قرآن پاک میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ روحانیت اور سیکولرازم آپس میں کلی طور پر جڑے ہوئے ہیں۔

قرآن بتاتا ہے کہ سیکولر یعنی دنیا میں روزمرہ کے ہمارے باہمی عمل کے ذریعے ہی روحانی ترقی حاصل ہوتی ہے۔ فی الحقیقت، الہامی اقدار پر یقین یا ان کی پابندی کرنا یا ان کے سامنے تسلیم ہونے کا اندازہ لگانا کسی دوسرے طریقے سے ممکن نہیں۔ اسی وجہ سے قرآن عمل سے خالی ایمان کی مثالیں بیان کرتا ہے، یعنی وہ لوگ جو ''دکھاوے کی عبادت کرتے ہیں اور یتیموں پر ظلم کرتے ہیں اور ضرورتمندوں کی بہبود کے لیے کام نہیں کرتے''۔ اسلام میں ترقی ایک ایسی صلاحیت کا نام ہے، جس سے انسان ہر قسم کے سماجی، تاریخی، معاشی اور سیاسی حالات میں ان اقدار سے صحیح طور پر وابستہ رہے بالخصوص ٹیکنالوجی کی ترقی کی ترغیبات اور چیلنجوں کو خاطر میں لائے بغیر ان اقدار سے وابستگی اسلام میں ترقی کہلاتی ہے۔ جب میں اپنے شاگردوں کو ان اصولوں یعنی ترقی کے اس نظریئے کی تعلیم دیتی ہوں، تو شمالی امریکہ میں موجود میرے شاگرد فوری طور پر اس تصور سے متاثر ہو جاتے ہیں، وہ اس بات میں بہت دلچسپی رکھتے ہیں کہ قرآن پاک میں نماز کی ہدایت کے مقابلے میں کمزور اور مصیبت زدہ لوگوں کی فلاح و بہبود پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

> ''نیکی یہی نہیں کہ تم مشرق و مغرب (کو قبلہ سمجھ کر ان) کی طرف منہ کر لو بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر اور فرشتوں پر اور (اللہ کی) کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں اور مال باوجود عزیز رکھنے کے رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں، مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں (کے چھڑانے) میں (خرچ کریں) اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور جب عہد کریں تو اس کو پورا کریں اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہء) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں۔ یہی لوگ ہیں جو (ایمان میں) سچے ہیں اور یہی ہیں جو (اللہ سے) ڈرنے والے ہیں۔ (سورۃ البقرہ: ۱۷۷)

یہ طلبہ محسوس کرتے ہیں کہ ترقی کے حوالے سے اسلام کی یہ تعلیمات بالکل وہی ہیں، جو وہ چاہتے ہیں۔ فی الحقیقت بہت سے طلبہ نے یہ سمجھ لیا کہ یہاں قرآن پاک کا انداز بیان بہت واضح، براہ راست اور برمحل ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ مغربی دنیا میں موجودہ دور کی صورت حال سے متعلق نمایاں طور پر بے اطمینانی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ مادی چیزوں، ان کے استعمال اور طاقت کے حصول پر بہت زور دیا جاتا ہے۔

اس صورت حال نے لوگوں کو روحانیت کی طرف مائل کر دیا ہے، جو اخلاقیات کے ذریعے مکمل ذہنی اطمینان حاصل کرنے کا منبع ہے۔ امریکہ کے کتب خانوں میں آج کل جو کتابیں سب سے زیادہ فروخت ہو رہی ہیں، وہ مذہبی موضوعات سے متعلق ہیں۔ اکثر لوگ یہ نہیں چاہتے کہ سرکاری مذاہب کو یورپ اور امریکہ میں نافذ کیا جائے۔ ہم مذہبی جبر کی اپنی باری گزار چکے ہیں اور ہمیں یہ معلوم ہے کہ مذہبی جبر کے نتیجے میں کوئی اچھا اخلاقی معاشرہ پیدا نہیں ہو سکتا، نہ ہی مغرب کے لوگ یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنی ذہنی صلاحیتوں پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیں یا ٹیکنالوجی کے حوالے سے تنزل کی جانب جائیں۔ لیکن وہ یہ چاہتے ہیں کہ مقاصد بالکل واضح بیان ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ مقاصد کے واضح بیان کے حوالے سے مسلم دنیا جدید دنیا میں بہت بڑا کردار ادا کر سکتی ہے۔

> اسلام میں ''ترقی'' کے تصور کو کسی بھی صورت محض ٹیکنالوجی یا دولت کی پیداوار سے منسوب کر کے گھٹایا نہیں جا سکتا۔ دیگر روایات کے مقابلے میں اسلام کی واضح خصوصیت یہ ہے کہ اسلام میں انسانی ذمہ داری پر بہت زور دیا گیا ہے۔

مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی حد تک جدت پسندی/ جدید طور طریقے اپنانے کے سلسلے میں دفاعی رویہ اختیار کرنے کے بجائے مسلمانوں کو اب یہ موقع حاصل ہے کہ وہ مذہبی اور ذہنی آزادی قبول کرتے ہوئے اور ترقی کے اقدار کو فروغ دیتے ہوئے ترقی کے بارے میں اسلامی نظریات کا فیصلہ کن اور پراعتماد انداز میں اعلان کرنے کی صورت میں نہایت مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں تاہم اسلامی ترقی کی پیمائش مقدار کی بنیاد پر نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ ترقی کا ایک ایسا معیار ہے، جس کی دنیا خواہشمند ہے، یہ ترقی کا ایسا تصور ہے، جس کا اندازہ خوبی کی بنیاد پر لگایا جا سکے گا۔ اس ترقی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکے گا کہ ہم کس حد تک ایک منصفانہ سماجی نظام تخلیق کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ ترقی کے مغربی تصورات کی اصلاح کرنے کے لیے یہ ایک ضروری عمل ہے۔ جب مغرب کے لوگ اس بات کو تسلیم کر لیں گے کہ مسلمان عقلیت پسندی کے خلاف نہیں ہیں اور ان کا نظام ملائیت پر مبنی نہیں ہے اور جب مسلمان یہ قبول کر لیں گے کہ مغرب کے لوگ مذہب کے خلاف نہیں ہیں اور ان کا نظام الحاد پر مبنی نہیں ہے، تو میرے خیال میں ہم ٹیکنالوجی کی ترقی کی خوبیوں اور خامیوں پر ایک بہت مفید مکالمے کا آغاز کر سکیں گے۔

ترجمہ: سید مراد علی شاہ، محمد اشرف طارق

اسلام اور مغرب کے علمی رجحانات

ڈاکٹر محمد وسیم

اسلامی بنیاد پرستی کا تصور ۱۹۸۰ء سے ایک علمی بحث کا مرکزی موضوع رہا ہے۔ اسلامی انتہاء پسند گروہوں کے ابھرنے کے ساتھ ہی اسلام اور مغرب کے مابین فرق کے حوالے سے پرانے اختلافات کو ہوا ملی۔ 9/11 کے واقعے کے بعد افغانستان اور عراق پر امریکی قیادت میں قبضے نے اس بحث کو اور زیادہ وسیع کر دیا۔ اسلام اور مغرب کے درمیان یہ نزاع بہت سے مخالفانہ جدلیات کا حامل ہے، جیسے عقلیت پسندی بمقابلہ شدت پسندی، جمہوریت بمقابلہ آمریت، جدیدیت بمقابلہ روایت پسندی اور تہذیب وتمدن بمقابلہ قدامت پرستی۔ سیاسی اور سماجی زندگی میں مذہب کی بڑھتی ہوئی اہمیت نے جدت پسندی کو چیلنج کر دیا ہے، جس کی بنیادی خصوصیت انکار خداوندی (Death of God) ہے۔ اس عمل کو عام طور پر خداؤں کی واپسی (Return of gods) کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اسلام ازم کے بڑھتے ہوئے رجحان کے حوالہ سے عام طور پر دو قسم کی آراء ہیں۔ نام نہاد مستشرقین کا خیال ہے کہ اسلامی انتہا پسندی کے بڑھتے ہوئے رجحان کا سبب اسلام کی ثقافتی اقدار اور اس کی خصوصیات ہیں۔ ۱۹۸۰ء سے مستشرقین کی متنوع آراء پر مبنی لٹریچر کی ایک بھرمار ہے جسے نو استشراق یا جدید استشراق کا نام دیا گیا ہے۔ پروفیسر ہننگٹن کے نزدیک موجودہ تنازعہ اسلام اور مغرب کے تصور جمہوریت اور جدیدیت کے حوالے سے موجود تاریخی عدم موافقت کا تسلسل ہے۔ جب کہ برنارڈ لیوس کہتا ہے کہ اسلام ازم کی طرف سے مغرب کی مخالفت کے احساسِ ذلت، حسد اور خوف کا ایک مرکب ہے۔ وہ مسلمانوں کے یورپ کے بارے میں غیظ وغضب کی حقیقی وجوہات کا تجزیہ کرتے ہوئے اس رائے کا اظہار کرتا ہے کہ شروع شروع میں مسلمان مغرب کے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے جو بعد میں نفرت اور دشمنی میں تبدیل ہوگئی۔ لیوس اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ مغربی سرمایہ داری اور جمہوریت اسلام کی روایتی اقدار کے حوالے سے سب سے بڑا چیلنج بن کر ابھرے ہیں۔ اس نے مسلمان دنیا میں بڑھتے ہوئے امریکہ مخالف رجحان کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ امریکہ مغربی بلاک کا بلا مقابلہ قائد بن کر ابھرا ہے اور یوں مسلمانوں کی یورپ دشمنی کا بھی ہدف بنا ہے، جس کا ایک تاریخی پس منظر ہے۔ اسی طرح کا نقطہ نظر ایک اور مستشرق ڈینیئل پائپس کا ہے، اس کے خیال میں مسلمانوں میں مغرب مخالف رجحان رکھنے والے گروہوں کا تیزی سے پھیلنا مسلمانوں اور عیسائیوں کے ابتدائی دور کے تنازعے کا تسلسل ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ مسلمان اپنی اقدار کے حوالے سے پریشان ہیں، جن کی جگہ مغربی اقدار لے رہی ہیں۔ مغرب کے مقابلہ میں شکست کا احساس اسلامی بیداری کے اس عمل کا حقیقی سبب ہے۔

مستشرقین نے اسلام کو جس طرح پیش کیا ہے، وہ اس کے بارے میں موجود ریاستی تصور کی حوصلہ افزائی کرتا اور مسلم معاشروں کے بارے میں موجود زندہ حقائق کو نظر انداز کرتا ہے۔ اس رو میں اسلام کو قبائلی معاشرت کا ایک ایسا توحید پرست مذہب قرار دیا گیا ہے، جہاں خود معاشرے کے اندر سے ایک دوسرے کے مخالف طاقتور عناصر کمزور عناصر کو چیلنج کرتے ہیں۔ نتیجتاً یہ استشراق اسلام کا ایک ایسا تصور پیش کرتا ہے، جو اپنی تمدنی اقدار کے ساتھ موجودہ ''تہذیبوں کے تصادم'' کا ذمہ دار ہے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق اس کا علاج مسلمان معاشروں کو جدید اور مغرب زدہ بنانا ہے۔

> مسلمانوں میں مغرب مخالف رجحان رکھنے والے گروہوں کا تیزی سے پھیلنا مسلمانوں اور عیسائیوں کے ابتدائی دور کے تنازعے کا تسلسل ہے۔

مستشرقین کے اس نقطہ نظر پر مغربی اور غیر مغربی سکالرز نے شدید تنقید کی ہے۔ جو لوگ تصادم کی بجائے مفاہمت کے قائل ہیں، انہوں نے اسلام اور مغرب کے درمیان تاریخی اختلافات کے تسلسل کو یکسر مسترد کر دیا ہے۔ ان کے نزدیک اسلام ازم کے رجحان کے بڑھنے میں بہت سے اندرونی اور بیرونی عوامل کارفرما ہیں۔ ہنٹر اس قسم کی سوچ رکھنے والے سکالرز کو نیو تھرڈ ورلڈسٹ کہتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کے حامیوں نے مغرب مخالف اسلام ازم کی بنیادوں میں بہت سے سیاسی، معاشی اور تاریخی عوامل کی نشاندہی کی ہے۔ اس نے مزید یہ کہا ہے کہ مسلمانوں کے اندر مغرب کے بارے میں منفی سوچ کا ماخذ مغرب کا مسلم ممالک پر صدیوں پر محیط قبضہ ہے۔ موجودہ مغرب مخالف جذبات ان مسلمانوں میں بھی موجود ہیں جو سیکولر ہیں۔ مزید

یہ کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے مسلم دنیا میں ہمیشہ آمر حکمرانوں کی مدد کی اور یہ بھی نفرت کا ایک سبب ہے۔ مفاہمت پسندوں کی رائے یہ ہے کہ مسلمانوں اور مغرب کو قریب لایا جا سکتا ہے، بشرطیکہ مسلمانوں کے بارے میں مغرب کی پالیسیوں میں تبدیلی لائی جائے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آج مسلمانوں اور مغرب میں تصورات کے اختلاف کا ایک سبب مفاہمت پسندوں کی رائے یہ ہے کہ مسلمانوں اور مغرب کو قریب لایا جا سکتا ہے بشرطیکہ مسلمانوں کے بارے میں مغرب کی پالیسی تبدیل کی جائے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آج مغرب اور مسلمانوں کے تصورات کے اختلاف کا ایک سبب مسلمانوں کے کلاسیکی کتب کی تشریح و تعبیر پر مغرب کا غلبہ ہے۔ بجائے اس کے کہ ان کتب کے تناظر کو مسلمان معاشروں کے موجودہ سماجی حالات کے حوالے سے سمجھا جائے، یہ کوشش دور وسطیٰ کے ان خیالات کو ایک طرح پھر سے زیر بحث لانا ہے جو اس عہد کے اسلام اور مغربی عیسائیت دونوں میں داخلی جھکاؤ کے رجحان کے باعث پیدا ہوا ہے۔ اسی طرح مغرب نے اسلام کو مذہب و سیاست میں وحدت کے حوالے سے سمجھا ہے، جو موجودہ مسلمان معاشروں کے حقائق سے متصادم ہے۔ مسلمان دنیا میں درحقیقت مذہب اور سیاست میں علیحدگی ہو چکی ہے اور یہ انداز فکر اس کا ادراک نہیں کرتا۔ مورٹیمر (Mortimer) کا خیال ہے کہ مغرب کو اسلام کے بجائے مسلمانوں کو سمجھنے پر زیادہ توجہ دینا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کا انفرادی اور اجتماعی سطح پر مغرب کے ساتھ اختلاط ہے جو ان کے تصورات کی صورت گری کرتا ہے۔ وہ اس بات پر بھی معترض ہے کہ مسلمانوں کی قدیم کتب اور لٹریچر سے اسلامی انقلابیوں کے محرکات کو سمجھا جائے۔

> مستشرقین نے اسلام کو جس طرح پیش کیا ہے وہ اس کے بارے میں موجود ریاستی تصور کی حوصلہ افزائی کرتا اور مسلم معاشروں کے بارے میں موجود زندہ حقائق کو نظر انداز کرتا ہے۔ اس رو میں اسلام کو قبائلی معاشرت کا ایک توحید پرست مذہب قرار دیا گیا ہے۔

فریڈ ہالی ڈے نے اسلام اور مغرب کے درمیان قدیم تنازع کے تصور کو رد کرتے ہوئے ''اسلامی خطرے'' کو ایک افسانہ قرار دیا ہے۔ اس نے اسلامی بیداری کو مسلمانوں کے سیاسی، معاشی اور سماجی زوال سے منسلک کیا ہے۔ ہالی ڈے نے مزید یہ کہا کہ یہ صورت حال مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے عدم تحفظ کے احساس کی نشاندہی کرتی ہے۔ مزید برآں اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس جدید دنیا میں ''اسلام خطرے میں ہے'' کا مقبول نعرہ صحیح معنوں میں اسلامی بیداری کی بنیادوں کو واضح کرتا ہے۔ جمال ملک کے نزدیک مستشرقین اسلامک ریڈیکل ازم کو مذہب سے منسوب کرتے ہیں اور مسلم، غیر مسلم دنیاؤں کے اختلاط کے ہمہ جہتی عمل کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس طرح مسلم انتہا پسندی کو ایک ایسے عمل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، جو خود کار ہے جبکہ مسلمان ملکوں میں حرکت پیدا کرنے کے لیے بنیادی شناختیں مرکزی کردار ادا کرتی ہیں اسی طرح پاکستان کی تاریخ اور سیاست جسے انتہا پسندی کا مرکز قرار دے کر نظر انداز کیا جاتا ہے، ایک مختلف کہانی سناتے ہیں۔ عالمی سطح پر احیائے اسلام کو جدیدیت کے ایک براہ راست نتیجہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مارساف نے کہا ہے کہ اسلام کی مقبولیت کے بڑھتے ہوئے رجحان کی بنیادی وجہ معاشرے کے زرعی دور سے پوسٹ انڈسٹریل دور میں داخل ہونے سے جو خطرناک نتائج نکلے ہیں، ان کا ردعمل ہے۔ ایسے فساد زدہ حالات میں اسلام ہی سماجی انصاف کا آفاقی تصور زندگی معلوم ہوتا ہے۔ برگاٹ اور ڈوویل نے شمالی افریقہ میں ۱۹۷۰ء سے اسلامی انتہا پسندی کے بڑھتے ہوئے رجحان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ نوآبادیاتی دور کے تسلسل کا ردعمل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلامسٹ فرنچ کلچرل پھیلاؤ کو روکنے کے لیے اسلامی اصطلاحیں، لغت اور علامتوں کو استعمال کرتے ہیں۔ اس نے کہا کہ اسلام پسندوں کے نعرے کی مقبولیت کا انحصار اس تصور پر ہے کہ وہ مغرب کے اثر سے آلودہ نہ ہو۔ اسلامی بیداری کو نوآبادیت کے خاتمے کے بعد کے تیسرے مرحلے کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ تاہم اخوی نے اس بات کو مسترد کر دیا ہے کہ اسلام اور مغرب کی کشمکش ناگزیر ہے۔ اس نے اپنے اس موقف کی تائید میں بہت سی مثالیں پیش کی ہیں کہ مسلمان اور غیر مسلم تاریخ میں اکٹھے رہ چکے ہیں۔ اس نے اٹھارویں صدی سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان علمی اور فلسفیانہ حوالے سے، جو تبادلۂ خیالات ہوئے ہیں، ان کی بھی نشاندہی کی ہے۔ مسلمانوں کی مغرب کے بارے میں سوچ پر تبصرہ کرتے ہوئے، اس نے کہا کہ مغرب کے غلبے کی صورت میں مسلمانوں کو سیاسی اور معاشی طور پر جو نقصان پہنچا ہے، اس کی یہی وجہ ہے۔ مسلمانوں اور مغرب کے درمیان موجود خلیج کو کم کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے مسائل کو حل کیا جائے اور فلسطین جیسے تنازعات کو ختم کرایا جائے۔

اسلامی انتہا پسندی کے معاملے پر مغرب کے سکالرز دو گروہوں میں تقسیم ہیں۔ بعض اسے ایک غیر منقسم واحد عمل سمجھتے ہیں جبکہ بعض کے نزدیک یہ متنوع صورتوں کا حامل ہے۔ مستشرقین اسلامسٹوں کے درمیان موجود اختلافات کو غیر اہم سمجھتے ہیں۔ اسلامی انتہا پسندی کے حوالے سے انٹرنیشنل کرائسز گروپ (ICG) نے اپنی رپورٹ میں یہ کہا ہے کہ اسلامزم کو ایک غیر منقسم عمل سمجھنے کے حوالے سے جو تصورات پیش کیے جاتے ہیں وہ غلط ہیں۔ اس نے اپنی رپورٹ میں یہ کہا ہے کہ مستشرق اور تنوع کا انکار کرنے والے مسلمان، انتہا پسندوں کے ہاں موجود لائحہ عمل، مقاصد اور نقطہ نظر کے متنوع ہونے کو نظر انداز کرتے ہیں۔ ان کے تجزیوں کے مطابق مسلم انتہا پسندوں کے عام طور پر دو گروہ ہیں۔ اعتدال پسند اور انتہا پسند۔ یعنی ایک وہ گروہ ہے جس کے ساتھ مغرب کی کسی درجے میں افہام و تفہیم ہو سکتی اور دوسرا گروپ وہ ہے جس کے ساتھ یہ تعلق ممکن نہیں ہے۔

ICG نے اسلامی تحریکوں کی جامع رپورٹ میں سنی اسلامی تحریکیت کے تین رجحانات کا ذکر کیا ہے:

۱۔ سیاسی مذہبی تحریکیں: یہ تحریکیں تشدد کے نظریہ کے خلاف ہیں اور انکا مقصد پر امن انتخابی اور سیاسی حکمت عملی سے اقتدار کا حصول ہے، جیسے عرب دنیا میں الاخوان المسلمون۔

۲۔ احیائی اور بنیاد پرست تبلیغی تحریکیں: یہ اسلامی عقائد کی بقا کے لیے تبلیغ میں مصروف رہتی ہیں، جیسے تبلیغی جماعت۔

۳۔ عرب سلفی تحریکیں اور جہادی تنظیمیں: یہ تشدد کو جائز سمجھتی ہیں اور اسے کافر دشمنوں سے اسلامی ممالک کا دفاع قرار دیتی ہیں۔

اس رپورٹ میں شیعہ تحریک کے ساتھ موازنہ بھی کیا گیا ہے جو علماء اور مذہبی طبقے کی قیادت میں زیادہ متحرک اور یک جان دکھائی دیتی ہے۔

اس سوال کے جواب میں کہ اسلامی ریڈیکل ازم کے جواب میں کیا مناسب حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے، دو نقطہ ہائے نظر سامنے آئے ہیں۔ ایک کو مفاہمت پسند اور دوسرے کو تصادم پسند کہا جا سکتا ہے۔

مستشرقین کی حکمت عملی یہ ہے کہ مسلم انتہا پسندوں کے ساتھ عدم تعلق رکھتے ہوئے انہیں سیاسی عمل سے دور رکھا جائے۔ مارٹن کریمر نے یہ کہا کہ مسلم انتہا پسندوں کے ساتھ کوئی سمجھوتہ اور مطابقت نہیں ہوسکتی۔ جو سکالرز اس طرح کے مناظر پیش کرتے ہیں، کریمر انہیں معذرت خواہانہ رویے کا حامل (apologists) قرار دیتا ہے۔ اس کا یہ بھی خیال ہے کہ اسلامی ریڈیکل ازم کی موجودہ لہر ایک کمزور عمل ہے اور اگر اس سے درست طور پر نمٹا جائے تو یہ خود بخود ختم ہو جائے گی۔ ان نظریات کا ڈینیئل پائپس نے تجزیہ کرتے ہوئے مسلم انتہا پسندوں سے نمٹنے کے حوالے سے مضبوط پالیسی اپنانے کی ضرورت پر دلائل دیئے۔ پائپس نے یہ کہا ہے کہ امریکہ کو چاہئے کہ وہ کسی بھی مسلم عسکریت پسند گروپ کو کہیں اقتدار میں نہ آنے دے۔ کیونکہ پھر ایسی حکومت کو ختم کرنا بہت مشکل ہوگا، جیسے موجودہ ایرانی حکومت۔ مزید برآں اس نے یہ کہا کہ امریکہ کو ایسی مسلمان حکومتوں کی مدد کرنی چاہئے، جنھیں اسلامی عسکریت پسندی کا سامنا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلم دنیا میں جمہوریت کو آہستہ آہستہ متعارف کرایا جائے تاکہ اس طرح انتہا پسندوں کو ابھرنے کا موقع نہ مل سکے۔

دوسری طرف مفاہمت و مطابقت پسندوں نے مسلم دنیا کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنے کے حوالے سے جامع پالیسیاں اختیار کرنے کے حق میں دلائل دیئے ہیں۔ ان کے اور مستشرقین کے درمیان اختلاف کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ مفاہمت پسند اس کی سفارش کرتے ہیں کہ اسلامزم کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ جدیدیت کی طرف رجوع کرے۔ 9/11 کے بعد امریکہ نے متعدد پالیسیاں اختیار کی ہیں، جیسے قبضے کے ذریعے حکومتوں کی تبدیلی، مشرق وسطیٰ میں جمہوریت کا فروغ اور مسلم دنیا میں تعلیمی اصلاحات، جن سے مغرب اور مسلم دنیا کے مابین موجود نظریات کے اختلاف کو وسیع کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد وسیم: لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز (LUMS) میں بین الاقوامی تعلقات کے استاد ہیں۔

امریکا: ایک مسلمان ادارے کے بک سٹال پر رکھے گئے قرآن مجید اور دینی کتب سے اہل مغرب کی دلچسپی
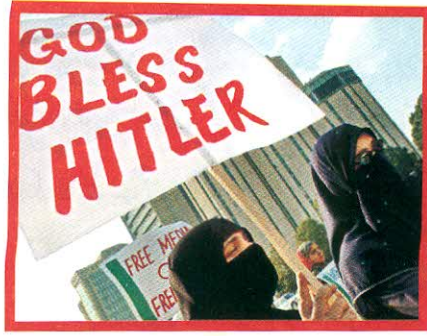
اسلام انتہا پسندی اور مغرب

جان ایل ایسپوسیٹو

پچھلے سال واشنگٹن پوسٹ اوراے بی نیوز نے ایک سروے کا اہتمام کیا جس کے نتائج کے مطابق عام طور پر امریکہ کی نصف آبادی اسلام کے بارے میں غیر موافقانہ رائے رکھتی ہے۔ یہ وہ تعداد ہے جس میں اضافہ ہوا۔ 9/11 کے بعد ایسی فضا میں یہ ثابت کرنا مشکل ہوگیا کہ مسلمانوں کی اکثریت دہشت گردی اور تشدد کے اسی طرح خلاف ہے، جس طرح کہ باقی دنیا اور غیر مسلم دنیا کے لیے یہ جاننا مشکل ہوگیا ہے کہ اس عظیم عالمی مذہب کو سمجھنے کا آغاز کہاں سے کریں۔

عیسائیت اور یہودیت کی طرح اسلام کا آغاز مشرق وسطیٰ سے ہوا۔ ایف ای پیٹرز (F. E. Peters) نے اپنی کتاب ''اولادِ ابراہیم'' (Children of Abraham) میں بہت سی مشترکہ چیزوں کو بیان کیا ہے۔ مسلمان، عیسائیوں اور یہودیوں کی طرح حضرت ابراہیم کے خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ اسلام کو ابراہیمی دین کا تسلسل قرار دیا گیا ہے۔ یہ کوئی نیا مذہب نہیں ہے۔ مسلمان بائبل میں مذکور انبیاء کو مانتے ہیں، حضرت موسیٰ پر خدا کی نازل ہونے والی مقدس کتاب کو بھی مانتے ہیں اور اسی طرح حضرت عیسیٰ کو بھی مانتے ہیں۔ عیسیٰ اور مریم مسلمانوں کے عام نام ہیں۔

مسلمانوں کے مطابق اسلام کے پانچ ستون ہیں۔ جو بڑے واضح ہیں۔ مسلمان بننے کے لیے یہ بنیادی کلمہ پڑھنا ضروری ہے کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں)۔ اس کلمہ سے اسلامی عقیدے کی دو بنیادوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک سچے خدا کی عبادت اور دیگر ہر شے (دولت، دنیاوی مستقبل، انا وغیرہ) کو خدا سمجھنے سے انکار اور دوسرے نبی کریم ﷺ کی غیر معمولی اہمیت۔

حضرت محمد ﷺ کی زندگی مسلمانوں کے لیے ایک مثالی نمونہ ہے، جیسے حضرت عیسیٰ کی زندگی عیسائیوں کے لیے نمونہ ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ مسلمان نبی ﷺ کو عالم انسانیت ہی کا ایک بے مثال نمونہ سمجھتے ہیں۔ آپ ﷺ کو مسلمان ایک مثالی خاوند، مثالی باپ اور دوست، عظیم سیاسی لیڈر اور عظیم قاضی قرار دیتے ہیں۔

مسلمانوں کے دلوں میں حضرت محمد ﷺ کی جو عظمت ہے، اس کا اندازہ ہمیں اس رد عمل سے ہوتا ہے، جس کا اظہار انہوں نے ۱۹۸۸ء میں سلمان رشدی کے ناول ''شیطانی آیات'' (Satanic Verses)، ڈنمارک کے ایک اخبار میں چھپنے والے کارٹون اور پوپ بینڈکٹ کے بیان —— جس میں انہوں نے ایک قدیم بازنطینی بادشاہ کے حوالے سے برائی اور غیر انسانی اخلاق لانے کا ذمہ دار آپ ﷺ کو قرار دیا (معاذ اللہ) —— پر کیا۔ یہ ردعمل مسلمانوں کی عظیم اکثریت کی طرف سے سامنے آیا نہ کہ کسی انتہا پسند گروہ کی جانب سے۔

آپ ﷺ کی شخصیت عصر حاضر سے جو مطابقت رکھتی ہے، اس کا اندازہ آرم سٹرانگ کی کتاب ''محمد: ہمارے عہد کے رسول'' (Muhammad: A Prophet of our Time) اور طارق رمضان کی کتاب ''پیغمبر کے نقوش پا'' (In the Footsteps of Prophet) سے مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

اسلام کے تین دیگر ستون درج ذیل ہیں:

۱) نماز: اس کی ادائیگی دن میں پانچ دفعہ کی جاتی ہے۔

۲) زکوٰۃ: سالانہ ٹیکس کی صورت میں اس سے غریبوں کی مدد کی جاتی ہے۔

۳- روزہ: رمضان کے مہینوں میں رکھا جاتا ہے۔

اور پانچواں ستون یہ ہے کہ مسلمان زندگی میں ایک دفعہ حج ادا کرتے ہیں۔

مغرب نے اسلام کو عرب دنیا کا مذہب قرار دینے کی کوشش کی، جب کہ زیادہ تر مسلمان پاکستان، انڈونیشیا، بنگلہ دیش، انڈیا اور نائیجیریا میں پائے جاتے ہیں۔ اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی آبادی 1.3 بلین ہے جس میں عرب مسلمانوں کی تعداد 1/5 ہے۔ اسلام یورپ میں دوسرا اور امریکہ میں تیسرا بڑا مذہب ہے۔

(اسی طرح) اسلام کے نام پر عورتوں سے جو سلوک روا رکھا جاتا ہے وہ ہر جگہ ایک سا نہیں ہے۔ بعض مسلم ممالک مثلاً سعودی عرب میں عورت کے لیے مکمل طور پر اپنے وجود کو چھپانا ضروری ہے، وہ نہ کار چلاسکتی ہے، نہ ووٹ کے لیے جدوجہد کرسکتی ہے،

لیکن کچھ مسلم ممالک میں عورتیں آزادی کے ساتھ سیاست میں حصہ لے سکتی ہیں، موٹر سائیکل چلا سکتی ہیں اور ساڑھی، پینٹ، شرٹ سمیت ہر طرح کا لباس پہن سکتی ہیں۔ مصر، شام، ایران، ترکی، ملائیشیا اور انڈونیشیا میں عورتیں یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کر سکتی ہیں، اور پیشہ ورانہ ملازمت بھی کر سکتی ہیں، پاکستان، بنگلہ دیش، ترکی اور انڈونیشیا میں عورتیں سربراہ مملکت بھی رہ چکی ہیں۔

مسلمان جہاد کو اسلام کا چھٹا ستون سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن مجید میں جہاد کا مفہوم خدا کی رضا کے لیے جد وجہد کرنا، نیک زندگی گزارنا، عدل پر مبنی معاشرے کا قیام اور اسلام اور مسلمانوں کا دفاع پر محیط ہے۔ تاہم ماضی میں مسلم حکمرانوں نے جہاد کی اس اصطلاح کو مسلمان علماء کی مدد سے اپنی سلطنتیں وسیع کرنے کے لیے مقدس جنگ کے طور پر استعمال کیا۔ دور حاضر میں اسامہ بن لادن جیسے انتہا پسند اسلام کو اپنی جنگ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ میری کتاب ''غیر مقدس جنگ: دہشت گردی خدا کے نام پر'' (Unholy War: In the Name of God)، اس موضوع کا تجزیہ کرتی ہے، جس طرح فواز جرجز (Fawaz Gerges) کی کتاب ''جہادیوں کا سفر: مسلمانوں کے اندر عسکریت پسندی'' (Journey of Jehadist) بھی اس موضوع کا احاطہ کرتی ہے۔ گیلپ ورلڈ پول اس حوالے سے ایک ارب سے زیادہ مسلمانوں کے جذبات و نقطہ ہائے نظر پر کچھ روشنی ڈالتا ہے۔ برسوں کے مطالعہ کے بعد میری رائے یہ ہے مسلمانوں کی یورپ سے دشمنی سیاسی بنیادوں پر ہے، نہ کہ مذہبی بنیادوں پر اور مسلمان مغرب سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ ان کے مذہب اسلام کا احترام کرے۔

9/11 کے بعد اسلام اور انتہا پسندی کو الگ کرنا بہت اہم ہے۔ صرف اسی صورت میں مغرب اس قابل ہوگا کہ وہ دنیا بھر میں مسلم اکثریت کو خود سے دور کرنے، مغرب میں مسلمان شہریوں کو دیوار سے لگانے اور عالمی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اتحادیوں کو ناراض کرنے سے محفوظ رہ سکے گا۔

(جان ایسپوسیٹو، جارج ٹاؤن یونیورسٹی واشنگٹن میں اسلامیات کے استاد ہیں اور یونیورسٹی کے مرکز برائے مسلم مسیحی تعلقات کے بانی ڈائریکٹر ہیں)

سترہویں صدی میں جو مذہبی تبدیلی رونما ہوئی اسے غلطی سے ایک منفی واقعہ یا مسیحیت کی پسپائی سمجھا گیا۔ یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی گئی کہ فطرت انسانی مذہبی خلا سے متنفر ہے اور نتیجتاً جب کسی معاشرہ کا آبائی مذہب پس پشت جا پڑتا ہے تو جلد یا بدیر کوئی دوسرا مذہب یا مذاہب اس کی جگہ لے لیتے ہیں۔ میرے نقطہ نظر سے یورپ میں مسیحیت کی پسپائی سے جو خلا پیدا ہوا تھا وہ تین مذاہب کے فروغ سے پر ہوگیا۔ جنھیں سائنس اور حرفیات کے مربوط اطلاق سے ناگزیر ترقی کا عقیدہ، و طینت اور اشتراکیت کہا جاسکتا ہے۔

مغربی اذہان کے لیے کسی معاشرے میں بیک وقت ایک سے زائد مذاہب کی موجودگی کو قبول کرنا ایک مشکل امر ہے کیونکہ مغرب کے آبائی مذہب میں مسیحیت تینوں علیحدگی پسند یہودی مذاہب سے زیادہ پرتشدد رہی ہے۔ مغرب میں مذہبی رواداری پر عمل اور اس آدرش کی طرف رجوع کرنا، سترہویں صدی میں کیتھولک، پروٹسٹنٹ مذہبی محاذ آرائی کے خلاف رد عمل کا منفی پہلو تھا۔ اس کے بر خلاف زیادہ تر غیر مسیحی ممالک میں ایک سے زاہد مذاہب کا بیک وقت وجود ایک معمول کی بات تھی یہاں تک کہ اسلام، جو مسیحیت کی طرح یہودی توحیدی مذاہب کی خودپسندی کا امین ہے، قرآن کی رو سے یہودی مذاہب یعنی یہودیت اور مسیحیت کے ساتھ رواداری کا سلوک کرنے کا پابند ہے بشرطیکہ ان کے پیرو مسلمانوں کے سیاسی تسلط کو قبول کرلیں۔ قبل مسیحی یونانی رومی دنیا میں اور ہندوئوں کے یہاں مشرقی ایشیا میں کئی مذاہب اور فلسفوں کا وجود ایک معمول کی بات تھی۔ اشتراکی چین سے قبل بدھ مت کا فلسفہ تائوازم کے مقامی مذہب میں کنفیوشیت کے سرکاری فلسفے کے ساتھ صلح و آشتی کے ساتھ موجود رہا۔ جاپان میں بدھ مت اورشنتو مذہب کے ساتھ اشتمالی تعاون کے ساتھ رہا اور توکوگاوا کی حکومت میں نو کنفیوشیت کو میرے خیال کے مطابق بدھ مت اور شنتو کے مساوی مرتبہ حاصل تھا۔

(آرنلڈ ٹوئن بی بنام دائیسا کو اکیدا)

تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تشکیل نو

تلخیص:
محمد خالد سیف
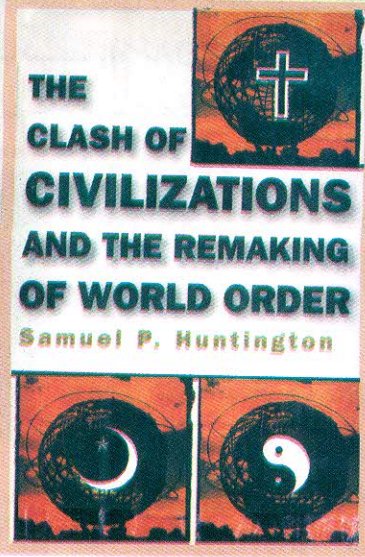
''تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تشکیل نو''، "The Clash of Civilization and the Remaking of World Order" ایک مشہور کتاب ہے جو ٹچ اسٹون، نیویارک سے ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کے مصنف ہارورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر، جان ایم اولن انسٹیٹیوٹ فار سٹریٹجک سٹڈیز کے ڈائریکٹر اور ہارورڈ اکیڈمی فار انٹرنیشنل اینڈ ایریا سٹڈیز کے چیئرمین سیموئیل پی ہنٹنگٹن ہیں۔ وہ کارٹر انتظامیہ میں نیشنل سیکورٹی کونسل کے ڈائریکٹر آف سیکورٹی پلاننگ، فارن پالیسی کے بانی اور شریک مدیر اور امریکن پولیٹیکل سائنس ایسوسی ایشن کے صدر رہ چکے ہیں۔ ان کی یہ کتاب گزشتہ برسوں میں شائع ہونے والی مشہور ترین اور حد درجہ متنازع کتابوں میں سے ایک ہے۔ تلخیص میں مصنف کے خیالات اور مفروضات کو کسی تبصرہ کے بغیر پیش کیا گیا ہے تاکہ قارئین کرام اس حساس موضوع کے بارے میں اپنی رائے خود قائم کرسکیں۔ تلخیص میں جناب سہیل انجم کے ترجمہ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، جو اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کے زیر اہتمام پہلی مرتبہ ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا تھا جس کے لیے ہم ناشر اور مترجم دونوں کے شکر گزار ہیں۔

یہ کتاب اس مرکزی خیال کی حامل ہے کہ ثقافت اور ثقافتی شناخت، سرد جنگ کے بعد کی دنیا میں اتحاد، انتشار اور تصادم پیدا کر رہی ہے۔ یہ کتاب درج ذیل پانچ حصوں پر مشتمل ہے:

حصہ اول: تاریخ میں پہلی بار عالمی سیاست کثیر قطبی اور کثیر تہذیبی ہے۔ جدیدیت مغربیت سے مختلف ہے۔ یہ کسی بھی مثبت حوالے سے کسی آفاقی تہذیب کو جنم دے رہی ہے اور نہ غیر مغربی معاشروں کو مغربی بنا رہی ہے۔

حصہ دوم: تہذیبوں کے بدلتے ہوئے توازن میں، مغرب کا اثر ورسوخ نسبتاً کم ہو رہا ہے۔ ایشیائی تہذیبیں اپنی طاقت کو توسیع دے رہی ہیں، آبادی کے اعتبار سے اسلام پھیل رہا ہے، جس سے مسلمان ممالک اور ان کے ہمسایوں کے لیے عدم استحکام میں اضافہ ہو رہا ہے اور غیر مغربی تہذیبیں اپنی ثقافتوں کی اہمیت واضح کر رہی ہیں۔

حصہ سوم: تہذیبوں کی بنیاد پر ایک عالمی نظام جنم لے رہا ہے، ثقافتی تعلق رکھنے والے معاشرے ایک دوسرے سے تعاون کر رہے ہیں اور معاشروں کو ایک تہذیب سے دوسری میں منتقل کرنے کی کوششیں ناکام ہو رہی ہیں۔

حصہ چہارم: مغرب کی آفاقیت کے دعوے اسے اسلامی اور چینی تہذیب سے متصادم کر رہے ہیں، مقامی سطح پر رخنہ جنگیں، جو بیشتر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ہیں، ''قرابت دار ملکوں کے گرد اجتماع''، لڑائی کے بڑھنے کے خطرے اور مرکزی ریاستوں کی جنگوں کو رکوانے کی کوششوں کا سبب ہیں۔

حصہ پنجم: مغرب کی بقاء کا انحصار اہل امریکہ کے اپنی مغربی شناخت کے دعویٰ کرنے، اہل مغرب کے تہذیب کو آفاقی نہیں، منفرد سمجھنے اور غیر مغربی معاشروں کے چیلنجوں کے خلاف اس کی تجدید اور تحفظ کے لیے متحد ہونے میں ہے اور تہذیبوں کی عالمی جنگ سے بچنے کا انحصار، دنیا کے رہنماؤں کے عالمی سیاست کے کثیر تہذیبی کردار کو قبول کرنے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے تعاون کرنے میں ہے۔

اس نئی دنیا میں سب سے زیادہ پھیلے ہوئے، اہم اور خطرناک تنازعات سماجی طبقات یا امیر وغریب گروہوں کے مابین نہیں، بلکہ مختلف ثقافتی اکائیوں میں ہوں گے۔ تہذیبوں میں قبائلی جنگیں اور نسلی تنازعے پیدا ہوتے رہیں گے مگر مختلف تہذیبوں سے وابستہ ممالک اور گروہوں میں تشدد کے واقعات میں شدت آتی رہے گی کیونکہ ان تہذیبوں سے وابستہ ممالک اور گروہ اپنے ''قرابت دار ممالک'' کی حمایت کے لیے جمع ہو جائیں گے۔ واکلاف ہیول کے بقول ''ثقافتی تنازعات میں اضافہ ہو رہا ہے اور تاریخ کے کسی بھی دوسرے دور کے مقابلہ میں آج زیادہ پر خطر ہیں'' اور ژاق ویلو متفق ہے کہ ''مستقبل کے تنازعات کی بنیاد اقتصادیات یا نظریات کی بجائے ثقافتی عوامل ہوں گے''۔ اور خطرناک ترین ثقافتی تنازعات تہذیبوں کے مابین رخنوں پر ہیں ہیں۔

مغرب تہذیبی اعتبار سے زیادہ طاقتور ہے اور برسوں تک رہے گا لیکن دوسری تہذیبوں کے مقابلہ میں زوال پذیر ہے۔ مغرب اپنی اقدار کے اثبات اور اپنے

مفادات کے تحفظ کے لیے سرگرمِ عمل ہے، جب کہ غیر مغربی معاشرے دوراہے پر کھڑے ہیں۔ بعض مغرب کی تقلید کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور مغرب کے ساتھ شامل ہونا چاہتے ہیں۔ دوسرے کنفیوشسی اور اسلامی معاشرے مغرب کی مزاحمت کرنے اور اس کے اثر کو ''متوازن'' کرنے کے لیے اپنی اقتصادی وفوجی طاقت بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس طرح سرد جنگ کے بعد کی عالمی سیاست کا مرکزی محور مغربی طاقت وثقافت اور غیر مغربی طاقت وثقافت کے مابین تعامل ہے''۔

عالمگیر تہذیب کا تصور مغربی تہذیب کی مخصوص پیداوار ہے۔ انیسویں صدی میں مغرب کی ذمہ داری کے تصور نے غیر مغربی معاشروں پر مغربی سیاسی اور معاشی غلبہ کی توسیع کا جواز فراہم کیا۔ بیسویں صدی کے اختتام پر عالمگیر تہذیب کا تصور دوسرے سماجوں پر مغربی ثقافتی بالادستی اور ان کے مغربی رواجوں اور اداروں کی نقالی کرنے کی ضرورت کا جواز فراہم کر رہا ہے۔ عالمگیریت غیر مغربی ثقافتوں سے محاذ آرائی کے لیے مغرب کا نظریہ ہے۔

جدید بننے سے قبل سو سال کے عرصہ میں مغربی معاشرے کی امتیازی خصوصیات کیا تھیں؟ اہل علم نے اس سوال کے مختلف جوابات دیئے ہیں، لیکن اہم اداروں، رواجوں اور عقائد پر جنہیں بجا طور پر مغربی تہذیب کی اساس کہا جاسکتا ہے، یہ دانشور متفق ہیں اور وہ ہیں: کلاسیکی ورثہ، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مسالک، یورپی زبانیں، دینی ودنیوی حاکموں کی علیحدگی، قانون کی حکمرانی، سماجی تکثیریت، نمائندہ ادارے، فرد پسندی۔

بیسویں صدی میں نقل وحمل اور مواصلات کی ترقی اور عالمی باہمی انحصار کے باعث علیحدگی پسندی کی راہ اختیار کرنے والوں کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ ڈینیل پائپس نے اسلام کے بارے میں لکھا ہے ''بہت انتہا پسند بنیاد پرست ہی جدیدیت نیز مغربیت کو مسترد کرتے ہیں۔ یہ لوگ ٹیلی وژن سیٹ دریاؤں میں پھینک دیتے ہیں، کلائی کی گھڑیوں پر پابندی لگاتے ہیں اور اندرونی احتراقی انجن کو رد کر دیتے ہیں۔ اس پروگرام کے ناقابل عمل ہونے کے باعث ان گروہوں کی کشش بہت محدود ہو جاتی ہے اور بعض صورتوں میں حکام سے تشدد آمیز ٹکراؤ میں شکست کھانے کے بعد ان گروہوں کا نام ونشان مٹ گیا، جیسے سادات کے قاتل، مکہ کی مسجد کے حملہ آور اور بعض ملائیشیائی گروپ۔ نام ونشان مٹ جانا ہی عام طور پر بیسویں صدی میں خالصتاً استرداد کی پالیسیوں کی تقدیر ہے۔ ٹائن بی کے الفاظ میں ''کٹر پن ایک قابل عمل راستہ نہیں''۔

اسلامی احیاء

اسلامی احیاء اپنی وسعت اور ہمہ گیری کے اعتبار سے اسلامی تہذیب کے مغرب سے مقابلہ کا تازہ ترین مرحلہ ہے اور مغربی نظریات کی بجائے اسلام میں ''حل'' تلاش کرنے کی کوشش ہے۔ اس میں جدیدیت کو قبول کرنا، مغربی ثقافت کو رد کرنا اور جدید دنیا میں راہنمائی کے لیے اسلام سے از سرنو وابستگی شامل ہے۔ یہ ساری اسلامی دنیا میں پھیلی ہوئی ایک وسیع علمی، ثقافتی، معاشرتی اور سیاسی تحریک ہے۔ اسلامی بنیاد پرستی جسے عموماً سیاسی اسلام سمجھا جاتا ہے، اسلامی تصورات، رواجوں اور اظہار کے بڑے پیمانے پر احیاء کے طریقوں اور اسلام سے از سرنو وابستگی کا صرف ایک جزء ہے۔

اس احیاء نے ہر مسلم ملک میں سیاست سمیت معاشرے کے بہت سے پہلوؤں کو متاثر کیا ہے۔ جان ایل ایسپوسیٹو نے لکھا ہے کہ ''ذاتی زندگی میں اسلامی بیداری کے اشاریئے'' مختلف ہیں: دینی فرائض (نماز روزہ وغیرہ) کی طرف توجہ بڑھ جانا، مذہبی تقریبات ومطبوعات کا عام ہونا، اسلامی ملبوسات واقدار پر زیادہ زور، صوفی مسلک کا پھر متحرک ہو جانا۔ اس وسیع البنیاد بحالی کے ساتھ عوامی زندگی میں اسلامی رجحان والی حکومتوں، تنظیموں، قوانین، بینکوں، سماجی بہبود کی خدمات اور تعلیمی اداروں میں اضافہ ہوا ہے۔ حکومتوں اور حزب اختلاف، دونوں نے اپنا اقتدار بڑھانے اور عوامی حمایت حاصل کرنے کے لیے اسلام کا رخ کیا ہے۔ ترکی اور تیونس جیسے سیکولر ملکوں سمیت بہت سے حکمران اور حکومتیں اسلام کی ممکنہ طاقت سے آگاہ ہو رہے ہیں اور اسلامی مسائل کے بارے میں ان کی حساسیت اور تفکرات بڑھ رہے ہیں''۔

مغربی وائرس اور ثقافتی پاگل پن

جو سیاسی رہنما یہ تصور کرتے ہیں کہ وہ اپنے معاشروں میں ثقافتی اساس کو نئی شکل دے سکتے ہیں، وہ ناکام ہوں گے۔ وہ مغربی ثقافت کے کچھ عناصر متعارف کرا سکتے ہیں مگر اپنی دیسی ثقافت کے بنیادی عناصر کو خارج نہیں کر سکتے ہیں۔ اگر مغربی وائرس ایک بار کسی معاشرے میں داخل ہو جائے، تو اسے نکالنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ وائرس زندہ رہتا ہے لیکن مہلک نہیں۔ مریض بچ جاتا ہے لیکن پوری طرح صحت یاب نہیں ہوتا۔ سیاسی رہنما تاریخ بنا سکتے ہیں، مگر تاریخ سے بچ نہیں سکتے۔ وہ مقطوع ممالک پیدا کرتے ہیں، مغربی معاشرے پیدا نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے ثقافتی مخبوط الحواسی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

اسلام: اتحاد کے بغیر آگاہی

۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کے عشروں میں انہی عوامل نے، جنہوں نے اسلامی احیاء کو ابھارا تھا، امہ اور اسلامی تہذیب کے ساتھ شناخت کو مضبوط بنایا، جیسا کہ مسلم اتحاد کے اس احساس کی عکاسی اور حوصلہ افزائی ریاستوں اور بین الاقوامی تنظیموں کے اقدامات سے بھی ہوتی ہے۔ اسلامی آگاہی سے اسلامی اتحاد کی طرف سفر میں دو تضاد ہیں (۱) اسلام طاقت کے باہم مخالف مراکز کے درمیان بٹا ہوا ہے، سب کے سب اپنی قیادت میں اسلامی اتحاد کے فروغ کے لیے امہ کے ساتھ شناخت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ (۲) امہ کے تصور میں یہ مفروضہ موجود ہے کہ قومی ریاست ناجائز ہے، تاہم امہ صرف کسی ایک یا ایک سے زیادہ مرکزی ریاست کے اقدامات سے ہی متحد ہو سکتی ہے، جو فی الحال موجود نہیں۔

مسلمانوں میں داخلی وخارجی تنازعات کا بڑا سبب کسی اسلامی مرکزی ریاست کی عدم موجودگی ہے۔ اتحاد کے بغیر آگاہی اسلام کی کمزوری اور دوسری تہذیبوں کے لیے خطرے کی وجہ ہے۔ کیا یہ صورت حال جاری رہنے کا امکان ہے؟

ایران، پاکستان اور سعودی عرب نے اپنی شناخت واضح طور پر مسلم ممالک کی حیثیت سے کرائی اور امہ کو اپنے زیر اثر کرنے اور اسے قیادت فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ممالک تنظیموں کی سرپرستی کرنے، اسلامی گروپوں کو مالی امداد فراہم کرنے، افغانستان میں جنگجوؤں کی مدد کرنے اور وسط ایشیا کی اقوام کو اپنی جانب کھینچنے میں باہم مقابلہ کرتے رہے ہیں۔

اسلام اور مغرب

صدر بل کلنٹن اور بعض مغربی باشندوں کا خیال ہے کہ مغرب کو اسلام سے کوئی پرخاش نہیں، بلکہ صرف متشدد اسلامی انتہا پسندوں سے مقابلہ ہے لیکن چودہ سو سالہ تاریخ سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ اسلام اور عیسائیت کے درمیان تعلقات اکثر کشیدہ رہے ہیں، بیسویں صدی میں لبرل جمہوریت اور مارکسسٹ لیننزم کا تنازع محض عارضی اور سطحی تاریخی واقعہ ہے۔ اسلام اور عیسائیت کے تعلقات مسلسل تنازع پر مبنی رہے ہیں۔ بعض اوقات پرامن بقائے باہمی کے لیے کوشش کی جاتی رہی لیکن زیادہ تر سخت شدید جنگ رہی۔ جان ایسپوسیٹو نے کہا کہ ''اپنی تاریخی حرکیات کے باعث دونوں
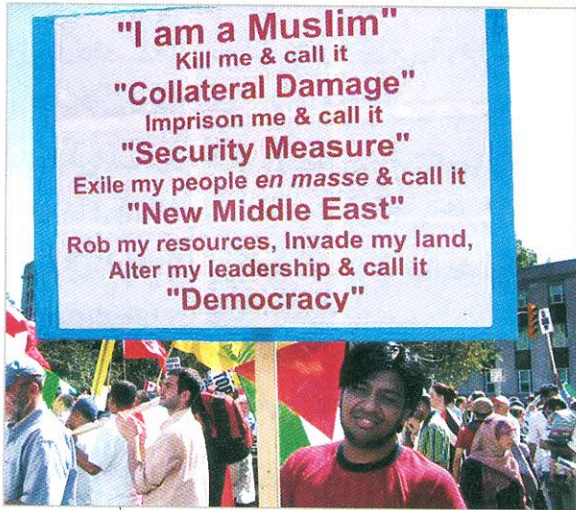
برادریوں نے خود کو طاقت، زمین اور افراد کے مسئلہ پر ایک دوسرے کے مقابل اور بعض اوقات خونریز تصادم میں نبرد آزما پایا''۔ صدیوں سے دونوں مذاہب زبردست شورشوں کے باعث عروج وزوال سے دوچار ہوتے رہے ہیں۔ اسلام واحد تہذیب ہے، جس نے کم ازکم دوبار مغرب کی بقا کو مشکوک بنایا ہے۔

بیسویں صدی کے آخر میں اس طرح کے عوامل نے اسلام اور مغرب کے درمیان اختلاف کو وسیع کرنے کی کوشش کی ہے: (۱) مسلمانوں کی آبادی بڑھنے سے بے روزگار نوجوانوں کی بڑی تعداد پیدا ہوئی، جو اسلام پسندانہ تحریکوں میں کام آتے، ہمسایہ معاشروں پر دباؤ ڈالتے اور مغرب کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں۔ (۲) اسلامی احیاء نے مسلمانوں کے مغرب کے مقابلہ میں اپنی تہذیب اور اقدار کے ممتاز کردار کے بارے میں اعتماد بحال کیا ہے۔ (۳) ساتھ ہی ساتھ مغرب کی اپنی اقدار اور اداروں کو عام کرنے، فوجی اور اقتصادی بالادستی برقرار رکھنے اور عالم اسلام میں مداخلت کرنے کی کوششوں نے مسلمانوں کے اندر شدید تلخی کو جنم دیا ہے۔ (۴) کمیونزم کے خاتمے کے بعد مغرب اور اسلام، ایک مشترکہ دشمن کے منظر سے ہٹ جانے کی وجہ سے اب ایک دوسرے کو خطرہ سمجھنے لگے ہیں۔ (۵) مسلمانوں اور مغربی باشندوں میں بڑھتے ہوئے تعلقات نے دونوں کے اندر اپنی شناخت اور دوسرے سے مختلف ہونے کا نیا احساس پیدا کیا ہے۔ یعنی اسلام اور مغرب کے درمیان پیدا ہونے والے تنازعات کے اسباب طاقت اور ثقافت کے بنیادی سوالوں میں مضمر ہیں۔

۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کی دہائیوں میں مسلمانوں کا عمومی رجحان مغرب مخالف رہا ہے۔ یہ اسلامی احیاء کا فطری نتیجہ اور مسلمان معاشروں کی ''غرب زدگی'' کے خلاف ردعمل ہے۔ اسلام کے اثبات نو کا مطلب، خواہ اس کی مخصوص فرقہ وارانہ شکل کچھ بھی ہو، مقامی سماج، سیاست اور اخلاق کی حمایت اور امریکی اثرات کی مذمت ہے۔ مسلمان مغرب کی طاقت اور اس سے اپنے معاشرے اور عقائد کو درپیش خطرے سے ڈرتے ہیں۔ وہ مغربی ثقافت کو مادہ پرست، بدعنوان، انحطاط پذیر اور اخلاق باختہ سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کی نظروں میں مغربی سیکولرزم، لادینی اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی بے راہ روی مغربی عیسائیت سے بدتر ہیں۔ مغرب کے خلاف ردعمل نہ صرف اسلامی احیاء کے علمی حلقوں میں نظر آتا ہے بلکہ یہ مسلمان حکومتوں کے مغرب کے بارے میں رویوں کی تبدیلی میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

مسلمانوں میں بڑھتی ہوئی مغرب دشمنی کے بالمقابل مغرب میں ''اسلامی خطرے'' کے بارے میں تشویش بڑھ رہی ہے، جو مسلمان انتہا پسندوں کی طرف سے ہے۔ اسلامی دنیا کو جوہری پھیلاؤ، دہشت گردی اور یورپ میں بن بلائے تارکین کا گڑھ اور ماخذ سمجھا جاتا ہے اور یہ تشویش عوام اور رہنماؤں دونوں میں پائی جاتی ہے۔

مغرب کے لیے اصل مسئلہ اسلامی بنیاد پرستی نہیں، بلکہ اسلام ہے۔ ایک مختلف تہذیب، جس کے افراد کو اپنی ثقافت کی برتری اور اپنی طاقت کی کمتری کا شدید احساس ہے۔ اسلام کا مسئلہ سی آئی اے یا امریکی محکمہ دفاع نہیں، بلکہ مغرب ہے، ایک مختلف تہذیب جس کے افراد کو اپنی عالمگیر ثقافت پر یقین ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی برتر طاقت، ان پر اس ثقافت کو پوری دنیا میں پھیلانے کو فرض قرار دیتی ہے۔ اسلام اور مغرب کے درمیان تنازعے کے یہی اساسی اجزاء ہیں۔

اسلام ابتداء ہی سے تلوار کا مذہب رہا ہے۔ اس میں عسکری فضائل کی بہت تعریف کی جاتی ہے۔ اسلام ''خانہ بدوش جنگجو بدو قبائل'' کے درمیان ابھرا اور یہ پرتشدد ابتداء اسلام کی گھٹی میں پڑی ہے۔ محمد (ﷺ) خود ایک زبردست ماہر حرب اور بہترین سپہ

سالار کی حیثیت سے یاد کیے جاتے ہیں۔ (عیسیٰ (علیہ السلام) اور گوتم بدھ کے بارے میں کوئی یہ بات نہیں کہہ سکتا) یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ اسلام کے عقائد منکرین سے جنگ کی تلقین کرتے ہیں اور جب اسلام کی ابتدائی توسیع کا سلسلہ کم ہوا تو مسلمان گروہوں نے عقیدے کے بالکل خلاف آپس میں لڑنا شروع کر دیا۔ فتنوں یا داخلی تنازعات اور جہاد کا تناسب بہت زیادہ اول الذکر کے حق میں ہوگیا۔ قرآن اور مسلم عقائد کے دوسرے بیانات میں تشدد کے امتناع کے بارے میں شاذ ہی احکام ہیں اور عدم تشدد کا تصور مسلم عقائد اور عمل میں موجود نہیں۔

کشمیر کی جنگ میں پاکستان نے شورش پسندوں کی کھلی سفارتی و سیاسی حمایت کی اور پاکستانی فوجی ذرائع کے مطابق پیسہ اور اسلحہ سے بھی مدد کی، نیز تربیت، نقل و حمل کی سہولتیں اور پناہ گاہ فراہم کی۔ شورش پسندوں کے لیے پاکستان نے مسلمان حکومتوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش بھی کی۔ ۱۹۹۵ء تک شورش پسندوں کو افغانستان، تاجکستان اور سوڈان کے کم از کم ۱۲۰۰ مجاہدین کی مدد حاصل ہو چکی تھی، جو اسٹنگر میزائل اور دیگر ایسے ہتھیاروں سے لیس تھے، جو امریکیوں نے سوویت یونین کے خلاف جنگ میں انہیں فراہم کیے تھے۔

تہذیبی جنگ اور نظام

ایسی عالمی جنگ کا امکان بہت کم ہے، جس میں دنیا کی بڑی تہذیبوں کی مرکزی ریاستیں شریک ہوں لیکن ناممکن نہیں۔ اس طرح کی جنگ مختلف تہذیبوں کے درمیان رخنہ جنگ کے پھیل جانے سے چھڑ سکتی ہے، جس میں سب سے زیادہ امکان ایک طرف مسلمانوں اور دوسری طرف غیر مسلموں کے ہونے کا ہے۔ جنگ پھیل جانے کا امکان اس صورت میں زیادہ ہوگا، جب مرکزی ریاست کی حیثیت کے امیدوار مسلم ممالک اپنے برسر پیکار ہم مذہبوں کو امداد فراہم کرنے کی کوشش کریں۔

اس عالمی تہذیبی جنگ کا فوری نتیجہ کچھ بھی ہو۔ باہمی جوہری بربادی، یا تھکاوٹ کی وجہ سے جنگ بندی پر اتفاق یا بالآخر تیانن مین اسکوائر میں روسی و مغربی افواج کی رسائی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جنگ کے تمام شرکاء کی معاشی، آبادیاتی اور فوجی طاقت میں نمایاں کمی ہو جائے گی۔ لہٰذا عالمی طاقت جو صدیوں تک مشرق سے مغرب کی طرف منتقل ہوتی رہی تھی اور مغرب سے مشرق کو منتقل ہونا شروع ہوگئی تھی، اب شمال سے جنوب کو منتقل ہوگی۔ تہذیبوں کی جنگ سے سب سے زیادہ فائدہ ان تہذیبوں کو پہنچتا ہے، جو اس میں شریک نہیں ہوتیں۔

مستقبل میں بڑی بین التہذیبی جنگوں سے بچنے کے لیے مرکزی ریاستوں کو دوسری تہذیبوں کے تنازعات میں مداخلت سے اجتناب کرنا چاہیے۔ یہ ایک سچائی ہے لیکن اسے بعض ممالک خصوصاً امریکہ کے لیے بلاشک وشبہ قبول کرنا مشکل ہوگا۔

اسلام اور مغرب کے چیلنج

ایک فارسی ضرب المثل کا مفہوم ہے:

”جب تک درخت کی جڑ میں پانی موجود ہے، بہتری کی امید کی جا سکتی ہے۔“

روایتی اصولوں کے مطابق سچی سرگرمی کے منہاج پر کسی مثبت کام کا امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے اور اسی میں اعلائے کلمۃ الحق اور اس کے مطابق عمل کا انتہائی مرکزی اور واضح کام شامل ہے۔ جہاں ایمان ہے وہاں مایوسی کی کوئی جگہ نہیں۔ آج بھی اگر دنیائے اسلام میں سچے دانشوروں کا ایک ایسا گروہ تشکیل دیا جا سکے جو بیک وقت روایتی بھی ہو اور جدید دُنیا سے کاملاً آگاہ بھی تو مغرب کی دعوت مبارزت کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور اسلامی روایت کی روح کو اس فالج سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے جس کے باعث اس کے دست و باؤ خطرے میں ہیں۔

اس بات کا اندازہ لگانے کے لیے کہ اسلامی دُنیا میں اب بھی کیا کچھ بچایا جا سکتا ہے۔ یہی بات یاد رکھنا کافی ہوگا کہ مسلمانوں کی ایک غالب اکثریت اب بھی اسلامی تہذیب کو ایک زندہ حقیقت سمجھتی ہے جس میں جیتی ہے، سانس لیتی ہے اور دم دیتی ہے۔ انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک اسلامی تہذیب حال کا حوالہ ہے، ماضی کا واقعہ نہیں۔ وہ لوگ جو اس تہذیب کو صرف ماضی کا حوالہ سمجھتے ہیں اس مختصر مگر غلغلہ خیز اقلیت کا جزو ہیں جو دُنیائے روایت میں زندہ نہیں ہیں اور جو اپنے لامرکز ہونے پر تمام مسلم معاشرے کو لامرکز قیاس کیے بیٹھے ہیں۔

سید حسین نصر

اسلام اور مغرب: چند اہم مغربی تصانیف

ڈاکٹر محسن مظفر نقوی

تاریخ عالم میں بہت سے واقعات ایسے رونما ہوئے ہیں، جنہوں نے تاریخ کا رخ تبدیل کر دیا اور جس ڈگر پر وہ چل رہی تھی، اس نے وہ راستہ تبدیل کر دیا۔ گزشتہ صدی میں پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) نے یورپ کی تاریخ کو متاثر کیا، پھر دوسری جنگِ عظیم (۱۹۳۹ء) نے اس نقشے کو تبدیل کیا جو ''یورپ، ایشیاء اور افریقہ'' کا مشترکہ سیاسی نقشہ کہا جاتا تھا اور یوں نئی سیاسی اور ریاستی اکائیوں کا دور شروع ہوا۔

اکیسویں صدی کی ابتداء ہی گویا ایک تاریخ ساز واقعے سے ہوئی، جسے دنیا ۹ ستمبر ۲۰۰۱ء (۹/۱۱) کے نام سے جانتی ہے۔ اس واقعے نے دنیا پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ ان اثرات کے بے شمار پہلو ہیں، جن کا احاطہ کرنا ممکن نہیں لیکن اس واقعے کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اسلامی دنیا اور غیر اسلامی دنیا کے فکری رجحانات، سیاسی اور معاشی تعلقات، تہذیبوں کے تصادم اور عدم تصادم اور ان تمام کے اسباب وعلل اور مستقبل کے اندیشوں وخدشات پر اس دوران بہت کچھ لکھا گیا اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اتنی کثیر تعداد میں کتابیں اور مضامین ومقالات

> اکیسویں صدی کی ابتداء ایک تاریخ ساز واقعے سے ہوئی، جسے دنیا ۹/ستمبر ۲۰۰۱ء (۹/۱۱) کے نام سے جانتی ہے۔

شائع ہو چکے ہیں کہ لائبریری کی ایک الماری انہیں سے بھر سکتی ہے۔ ان تمام کتابوں کا نہ احاطہ ممکن ہے اور نہ ہی مطلوب، آئندہ سطور میں ہماری کوشش ہوگی کہ چند منتخب اور ہمارے نقطہ نظر سے اہم کتابوں کے حوالے سے نو ستمبر کے بعد اسلام اور مغرب کی صورت حال پر کچھ تحریر کریں۔

جنگ عظیم اول (۱۹۱۴ء) کے بعد نو آبادیات پر استعماری قوتوں کی گرفت ڈھیلی پڑنی شروع ہوئی، تو ان نو آبادیات نے اپنی آزادی کی جدوجہد شروع کی۔ ان میں خاص طور پر وہ علاقے شامل تھے، جن کے لیے اب ''اسلامی ممالک'' یا ''اسلامی دنیا'' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ یہی دور کم وبیش ترکی میں انقلاب اور عملی طور پر خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کا ہے، جو بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے شروع میں وقوع پذیر ہوا۔ اس دور میں مسلمان نو آبادیوں میں آزادی کی تحریکوں کو ''فلسفۂ جہاد'' سے غذا ملی اور ہم اس دور کے مفکرین میں جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، حسن البنا اور سید قطب شہید کے نام نمایاں طور پر دیکھتے ہیں۔

روکزینے یوبن بطور اسسٹنٹ پروفیسر ویلیزلے کالج میں سیاسیات، سیاسی نظریات کا تقابلی مطالعہ اور خواتین سیاسی مفکرین کے نظریات پڑھاتی ہیں۔ ان کی کتاب ''دشمن آئینے کے سامنے، اسلامی بنیاد پرستی اور موجودہ عقلیت پسندی کی حدود''

(Roxanne L. Euben: *Enemy in the Mirror: Islamic Fundamentalism and the Limits of Modern Rationalism* Princeton University Press, 1999)

بنیادی طور پر سید قطب، جمال الدین افغانی، محمد عبدہ اور امام خمینی کے نظریات کا مطالعہ ہے، جسے وہ اسلامی بنیاد پرستی سے تعبیر کرتی ہیں۔ اس کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ مصنفہ نے اسلام اور مسلم مفکرین کے نظریات کو ''دشمن'' کے نظریات کے طور پر مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب کے دوسرے باب (Projections and Reflections: Islamic Fundamentalism and Modern Rataionalist Discourse) میں مصنفہ نے اسلامی بنیاد پرستی کے بارے میں مسلمانوں کے نظریات اور ان کے نتیجے میں مسلمانوں کے تصورِ دنیا پر گفتگو کی ہے، بعد ازاں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کی دی ہوئی بنیاد پرستی کی وضاحت درست نہیں۔ دنیا کے تصور اور بنیاد پرستی میں جو قباحتیں موجود ہیں، اس کی بناء پر کتاب کی مصنفہ نے یہ بتایا ہے کہ عملی دنیا میں اس بنیاد پرستی کی ایک خاص شکل وجود میں آئی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے گروہوں کی اصلیت، عمر، پیشہ ورانہ صلاحیت، نظریاتی مقاصد وغیرہ کا مطالعہ کیا ہے اور اس امر کو ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ اسلامی بنیاد پرستی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کی تشریح ''اسٹرکچر پریشر'' کے جواب

میں ''میکانکی ردِعمل'' کے طور پر کی جا سکتی ہے اور اس کا کوئی خاص تعلق ''موروثی طاقت'' سے نہیں ہے۔

اس کتاب کے تیسرے باب میں سید قطب کے فلسفۂ سیاسی پر گفتگو ہے، جس میں اخلاقیات کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ مصنفہ کا خیال ہے کہ سید قطب کے نظریات موجودہ سیاسی اقتدارِ اعلیٰ کے تصور کو چیلنج کرنے اور ''بعد از روشن خیالی عہد'' (post-Enlightenment) میں پیدا ہونے والے سیاسی نظریات مارکسیت، آزاد خیالی (Liberalism) اور سوشلزم پر اخلاقی تنقید مہیا کرتے ہیں۔ سید قطبؒ کے نظریات میں سب سے اہم بات اللہ تعالیٰ کے اقتدارِ اعلیٰ کا تصور ہے، جس نے پورے موجودہ نظامِ سیاسی کو ایک چیلنج دیا ہے۔ اس کتاب کی مصنفہ نے سید قطب کے نظریات کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کے ناقدین چارلس ٹیلر، الاسڈیر میک انٹائر، رابرٹ بلا، حنا آرینٹ، رچرڈ جان نیو ہاس اور دانیال بیل (Charles Taylor, Alasdair MacIntyre, Robert Bellah, Hannah Arendt, Richard John Neuhouse, Daniel Bell) وغیرہ کے افکار پر بھی بحث کی ہے اور ان نظریات کے تناظر میں سید قطبؒ کی ''دبیز تشریح'' کی کوشش کی ہے۔ اسلامی تحریکوں کا اصل اصول اللہ تعالیٰ کی سیاسی حاکمیت کا تصور ہے، جس کا نتیجہ دنیا میں اللہ کے سیاسی اقتدار کا قیام ہے، جو اسلام کے نفاذ سے ہی ممکن ہے۔ یہ وہ بنیادی نظریہ ہے جس پر الاخوان المسلمون، جماعت اسلامی، طالبان، القاعدہ سب ہی تحریکوں کی اساس ہے کہ اس دنیا پر اللہ تعالیٰ کی حکمرانی اس کی شریعت جاننے والوں کے ذریعے قائم کی جائے گی، جس کو ہر قیمت پر تمام ادیان پر غالب آنا ہے کیونکہ یہ اللہ نے اس کے مقدر میں لکھ دیا ہے، خواہ یہ بات مشرکوں کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔ (سورۂ توبہ) پروفیسر یوبن (Euben) کی کتاب ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی اور اس نے اسلامی سیاسی نظام کو ''دشمن'' کے نظام کے طور پر پیش کیا۔

پروفیسر برنارڈ لوئیس (Bernard Lewis) کا نام پڑھے لکھے حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں، خاص طور پر مشرق وسطیٰ کے مطالعے میں انہیں خاص شہرت حاصل ہے۔ ۲۰۰۲ء میں ان کی کتاب ''کیا غلط ہوا: مغرب کا اثر اور مشرق وسطیٰ کا ردعمل'' (What Went Wrong: Westren Impact and Middle Eastern Response) شائع ہوئی۔ یہ کتاب بنیادی طور پر سات ابواب پر مشتمل ہے، جس میں مسلمانوں کے عروج کے بعد زوال، مغرب کے عروج کی وجوہ اور مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے اور تجزیاتی نقطۂ نظر اپنایا گیا ہے۔ اس کتاب کے آخر میں ایک باب نتیجے (Conclusion) پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا پیراگراف بہت اہم ہے، وہ لکھتے ہیں:

''بیسویں صدی کے دوران مشرق وسطیٰ میں ہی نہیں بلکہ پوری اسلامی دنیا میں یہ بات بالکل واضح ہوگئی تھی کہ معاملات واقعی بری شکل اختیار کر چکے ہیں۔ ہزار سال پرانے حریف یعنی عیسائی دنیا کے مقابلے میں مسلم دنیا زیادہ غریب، کمزور اور جاہل ہو گئی ہے، انیسویں اور بیسویں صدیوں کے دوران مغرب کی اہمیت اور غلبہ ہر صاحبِ بصیرت پر عیاں تھا، جو ہر مسلمان کی عوامی زندگی اور زیادہ تکلیف دہ حد تک، ذاتی زندگیوں پر بھی حملہ آور تھا۔ (صفحہ ۱۵۱) برنارڈ لوئیس نے اپنی اس کتاب کے پہلے باب میں جنگوں کے اثرات کا، دوسرے باب میں دولت اور قوت کی پیاس کا، تیسرے باب میں سماجی اور ثقافتی رکاوٹوں کا، چوتھے باب میں جدیدیت اور سماجی عدل و مساوات کا، پانچویں باب میں لادینیت اور سول سوسائٹی کے کردار کا، چھٹے باب میں وقت، مکان اور جدیدیت کا، جب کہ ساتویں اور آخری باب میں ثقافتی تبدیلیوں کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ برنارڈ لوئیس نے اپنی اس کتاب میں جو بنیادی طور پر تین لیکچروں سے تیار کی گئی ہے، مسلمانوں کی معاشی کمزوری، عسکری کمزوری اور سیاسی کمزوری کا جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ ان تینوں میدانوں میں ان کی شکست اور عیسائی دنیا کی مضبوطی نے موجودہ حالات پیدا کیے ہیں۔ اس ضمن میں مسلمانوں کے شاندار ماضی کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ جب مسلمان اس کے بعد معاشی، سیاسی اور عسکری کمزوریوں کا شکار ہوئے تو سوال اٹھا کہ ہماری اس حالت کا ذمہ دار کون ہے؟ اس کا ذمہ دار انہوں نے مغرب اور امریکہ کو قرار دیا اور یوں ایک بحران پیدا ہوا۔ برنارڈ لوئیس کے خیال میں مسلمانوں کی حالت کی ذمہ داری خود مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔ اپنی اس کتاب میں ''تاریخی'' تجزیہ کرنے کے بعد اپنی دوسری کتاب ''اسلام کا بحران، مقدس جنگ اور غیر مقدس دہشت گردی'' (*The Crisis of Islam: Holy War and Unholy Terror, 2003*) میں برنارڈ لوئیس نے اسلامی دنیا کے علمی و فکری بحران پر بحث کی ہے۔ مسلمان ممالک کی کارکردگی پر گفتگو کرتے ہوئے ایک مقام پر برنارڈ لوئیس نے لکھا ہے:

''مسلمان ممالک کی کارکردگی کی شماریات کو تقابلی بنیاد پر دیکھا جائے تو یہ کارکردگی تباہ کن ہے۔ ملکی پیداوار کے لحاظ سے سب سے اوپر ترکی ہے، جس کی آبادی چھ کروڑ چالیس لاکھ ہے، جس کا نمبر تیسواں ہے، جو

آسٹریلیا اور ڈنمارک کے درمیان ہے، جن میں سے ہر ایک کی آبادی پچاس لاکھ سے زائد نہیں ہے۔ اس کے بعد انڈونیشیا کا نمبر آتا ہے، جس کی آبادی ۲۱ کروڑ بیس لاکھ کے قریب ہے، اس کا نمبر ملکی پیداوار میں اٹھائیسواں ہے، جب کہ ناروے کا نمبر ۲۷ واں ہے اور اس کی آبادی پینتالیس لاکھ ہے، جب کہ سعودی عرب کا نمبر ۲۹ واں ہے اور اس کی آبادی دو کروڑ دس لاکھ ہے، قوتِ خرید کے لحاظ سے انڈونیشیا مسلمان ملکوں میں پہلا، جب کہ لسٹ میں پندرہویں نمبر پر ہے، اس کے بعد مصر کا نمبر آتا ہے۔ معیارِ زندگی کے اعتبار سے مسلم ممالک میں قطر پہلے نمبر پر ہے، جب کہ عالمی لسٹ میں یہ ۲۳ ویں نمبر پر ہے، متحدہ عرب امارات ۲۵ ویں نمبر پر اور کویت ۲۸ ویں نمبر پر ہے۔

کتابوں کی فروخت کے لحاظ سے صورت حال اور بھی زیادہ خراب ہے، پہلے ستائیس ملکوں کی فہرست امریکہ سے شروع ہوتی ہے اور ویت نام پر ختم ہوتی ہے، اس میں ایک بھی مسلمان ملک شامل نہیں ہے۔ عرب ہیومن ڈیولپمنٹ کی رپورٹ ۲۰۰۲ء کے مطابق عرب دنیا میں سالانہ ۳۳۰ کتابیں ترجمہ ہوتی ہیں، جب کہ صرف یونان میں اس سے پانچ گنا زائد کتابیں سالانہ ترجمہ ہوتی ہیں (یعنی ۱۶۵۰ کتابیں)۔ مامون رشید (۹ ویں صدی عیسوی) کے عہد سے اب تک ترجمہ ہونے والی کتابوں کا اندازہ دس لاکھ ہے، جب کہ اسپین میں ایک سال میں اتنی کتابیں ترجمہ ہوتی ہیں، تمام عرب ممالک کا سالانہ GDP ۵۳۱ء۲ بلین ڈالر تھا (۱۹۹۹ء) جب کہ صرف اسپین کا GDP ۵۹۵ء۵ بلین ڈالر تھا۔''

برنارڈ لوئیس نے اپنی اس کتاب میں چونکا دینے والے اعداد و شمار دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں اور اسلام کا بحران دراصل ان کا اندرونی علمی، فکری، معاشی اور سیاسی بحران ہے اور کیوں کہ مسلمان ممالک جدید علمی و سائنسی ترقی میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں لہٰذا اب وہ اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ان کے خیال میں سعودی حکومت اور وہابیت کا ملاپ (باب ۸، ۹) مسلمانوں میں موجودہ دہشت گرد عناصر کی پیدائش کا سبب بنا اور اس کا سدِباب خود مسلم ممالک اور قومیتوں کے لیے ضروری ہے۔

اسلام اور بیرونی دنیا کے درمیان تنازع، کشمکش، دہشت گردی کے خلاف جنگ، دہشت گردی یا جہاد اپنے اندر بہت سے پہلو رکھتا ہے۔ ہم کسی ایک عامل کو اس صورت حال کا ذمہ دار نہیں قرار دے سکتے۔ آپ نے دیکھا کہ یوبن کی کتاب اسلام کے سیاسی نظریے کو حالات کا ذمہ دار قرار دیتی ہے، جب کہ برنارڈ لوئیس اپنی کتابوں میں مسلمانوں کی اندرونی کمزوریوں کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ اس کے بارے میں ایک تیسرا نقطۂ نظر بھی ہے، جس کا جائزہ ہم دو کتابوں کی مدد سے لیں گے۔

ان میں سے پہلی کتاب رچرڈ کلارک (Richard A. Clarke) کی ''تمام دشمنوں کے خلاف: دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ کی اندرونی کہانی'' "Against All Enemies: Inside America's War on Terror" ہے مسٹر کلارک نے ۱۹۷۳ء میں سیکرٹری ڈیفنس کے آفس میں کام کرنے سے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ صدر کلنٹن نے مئی ۱۹۹۸ء میں انہیں قومی سلامتی کا پہلا کوآرڈینیٹر مقرر کیا۔ صدر بش کے دور میں بھی وہ اس عہدے پر برقرار رہے۔ ۲۰۰۳ء تک وہ سینئر ایگزیکٹو سروس کے کیریئر ممبر تھے، ۹/ستمبر کے واقعے کے وقت قوم کے کرائسس منیجر تھے اور Situation Room ان کے کنٹرول میں تھا۔ ان کا پورا کیریئر ملٹری اور سول سروس اور انٹیلی جنس کے شعبوں سے متعلق رہا ہے۔ گیارہ ابواب پر مشتمل یہ کتاب Free Press نے ۲۰۰۴ء میں شائع کی۔ اس کتاب کے دوسرے باب میں مصنف نے بتایا ہے کہ امریکہ کس طرح اسلامی دنیا میں وارد ہوا اور اس کے پس پشت کیا عوامل تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ ۱۹۷۴ء میں عربوں نے امریکہ کے لیے تیل کی فراہمی پر پابندی لگائی، تو امریکہ نے اس حقیقت کا ادراک کیا کہ خلیج کے وسائل اس کے لیے کتنے اہم ہیں۔ ۱۹۷۹ء میں امریکہ کے سب سے بڑے حلیف رضا شاہ پہلوی کو اسلام پسندوں نے ہٹا کر اپنی حکومت قائم کر لی (انقلاب ایران) پھر کرسمس کے دن روس نے افغانستان پر حملہ کر دیا۔ رضا شاہ پہلوی نے خلیج میں امریکہ کے لیے دو اہم کام کیے تھے (۱) عرب بائیکاٹ کے باوجود امریکہ کو تیل کی فراہمی یقینی بنانا (۲) شاہ نے امریکہ کو یقین دلایا کہ تیل کی دولت کے ذریعے وہ روس کے جنوبی علاقے پر جرمنی جیسی مضبوط فوج قائم کر لے گا۔ کتاب کا مصنف کہتا ہے کہ روس کے ساتھ سرد جنگ اور دہشت گردی کے خلاف جنگ میں کئی مماثلتیں ہیں: (۱) دونوں تنازعات عالمی سطح کے ہیں، جن میں علاقائی جنگیں، خفیہ سیل اور متنازع نظریہ ہائے حیات موجود ہیں (۲) دونوں میں ہمارے شہروں کو وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کا سامنا ہے۔ (۳) دونوں صورتوں میں ہمارے مخالفین اپنے نظریے کو پوری دنیا پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔

> سید قطبؒ کے نظریات میں سب سے اہم بات اللہ تعالیٰ کے اقتدارِ اعلیٰ کا تصور ہے جس نے پورے موجودہ نظامِ سیاسی کو ایک چیلنج دیا ہے۔

فاضل مصنف نے اس سلسلے میں امریکی صدر اور انتظامیہ کی تین ترجیحات بیان کی ہیں: (۱) اپنے ملک کو دہشت گردی سے محفوظ رکھنا اور سرزمین کا دفاع کرنا (۲) القاعدہ کے فلسفے کو رد کرنے اور روکنے کے لیے مسلم قوتوں سے شراکت کرنا تاکہ ''اصلی اسلام'' کو فروغ دیا جائے، عام امریکی اور اسلامی اقدار کے لیے حمایت حاصل کی جائے اور عام طور پر پائی جانے والی بنیاد پرستی کے متبادل فلسفہ تشکیل دیا جائے۔ (۳) اس ضمن میں فعال ممالک کے ساتھ تعاقب کیا جائے، نہ صرف

دہشت گردوں کو گھیرنے اور ان کے مقدس مقامات، نیز ان کے فنڈز کو ختم کرنے کے لیے بلکہ ''اوپن گورنمنٹس''، کو مضبوط کرنے اور انہیں سیاسی، معاشی اور معاشرتی طور پر اتنا مضبوط کرنے کے لیے کہ وہ القاعدہ اور ایسی ہی دوسری دہشت گرد تنظیموں کی جڑوں تک پہنچ کر انہیں ختم کر سکیں۔ یہ کتاب یقیناً امریکہ اور یورپ کی دہشت گردی کے خلاف مشترکہ جنگ کو سمجھنے کے لیے اہم ہے۔ اہم ترین بات اس ضمن میں یہ ہے کہ کتاب کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ دراصل یہ جنگ خلیج اور ملحقہ علاقوں میں امریکی معاشی مفادات کی جنگ ہے۔

اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ دہشت گردی کے خلاف مزعومہ جنگ دراصل خلیج میں موجود تیل کے لیے جنگ ہے نیز یہ کہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد امریکہ کو ایک ''دشمن'' کی تلاش تھی، جس کی بناء پر وہ نہ صرف یہ کہ اس علاقے میں موجود رہے بلکہ خود امریکیوں کو بھی متحد رکھے۔ وہ ''دشمن'' اس نے ''مسلمان دہشت گردوں'' کے روپ میں مہیا کر لیا۔ اس امر پر ایک اور اہم کتاب میں بہت زیادہ زور دیا گیا ہے اور شماریاتی حقائق کی مدد سے اسے ثابت کیا گیا ہے۔ یہ کتاب جان بلیمی فوسٹر اور رابرٹ میک چزنی نے مرتب کی ہے (Pax Americana: *Exposing the American Empire*, ed John Bellamy Foster and Robert W. Mc Chesney 2004) سولہ ابواب پر مشتمل یہ کتاب مکمل طور پر یہ ثابت کرتی ہے، جیسا کہ اس کے نام سے بھی ظاہر ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ اور گلوبلائزیشن وغیرہ کے تصورات دراصل امریکی امپائر بنانے کی سازش ہے، جو خلیج کے ممالک اور دیگر ترقی پذیر ممالک پر اپنا تسلط قائم کر کے امریکہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ امریکہ نے دنیا کے مختلف ممالک میں جو بڑی بڑی کارروائیاں کی ہیں اور جنگوں میں ملوث رہا ہے ان کی تفصیل کچھ یوں ہے:

چین (۱۹۴۵ء) یونان (۴۹-۱۹۴۷ء) کوریا (۱۹۵۳-۱۹۵۰ء) ایران (۱۹۵۳ء) گوئٹے مالا (۱۹۵۴ء) ہند چینی (۱۹۶۵ء) لبنان (۱۹۵۸ء) کانگو (۱۹۶۴ء) کیوبا (۱۹۶۱ء) انڈونیشیا (۱۹۶۵ء) ڈومینکن ریپبلک (۶۶-۱۹۶۵ء) چلی (۱۹۷۳ء) انگولا (۱۹۹۲ء-۱۹۷۶ء) لبنان ۸۴-۱۹۸۲ء) گریناڈا (۱۹۸۴-۱۹۸۳ء) افغانستان (۸۹-۱۹۷۹ء) ایل سلواڈور (۹۲-۱۹۸۱ء) نکاراگوا (۹۰-۱۹۸۱ء) پاناما (۹۰-۱۹۸۹ء) عراق (۱۹۹۱ء) صومالیہ ۹۴-۱۹۹۲ء) ہیٹی (۱۹۹۴ء) بوسنیا (۱۹۹۵ء) یوگوسلاویہ (۱۹۹۹ء) افغانستان (۲۰۰۱ء) اور عراق (۲۰۰۳ء)۔ اس کتاب (Pax Americana) میں تفصیلی مضامین کے ذریعہ یہ بات تقریباً ثابت کر دی گئی ہے کہ امریکہ اور یورپ کا اصل مقصد خلیج اور مشرقِ وسطیٰ کی دولت پر قبضہ کر کے دنیا کو خاص کر مسلم ممالک کو دوبارہ سیاسی اور اقتصادی نوآبادیوں میں تبدیل کرنا ہے۔ لہذا حکمتِ عملی یہ اختیار کی گئی کہ مسلمانوں میں دہشت گردوں کو مشخص کیا جائے اور اس حیلے کے تحت مسلمان ریاستوں پر اپنا سیاسی اور اقتصادی تسلط قائم کیا جائے۔ اس امر کا بھرپور جائزہ ایک اور اہم کتاب ''نئی صلیبی جنگیں: مسلمانوں کو دشمن بنانے کا عمل'' تالیف عمران قریشی اور مائیکل اے سیل۔

(*The New Crusades, Constructing the Muslim Enemy*, ed: Emran Qurashi and Michael A Sell. Oxford University Press. 2005, Columbia University Press:2003) میں لیا گیا ہے۔ گیارہ ابواب پر مشتمل یہ کتاب انتہائی عالمانہ مضامین پر مشتمل ہے۔ ان مضامین میں اسلام کے بارے میں یورپ کے خیالات اور بعض بنیادی غلط فہمیوں پر علمی اور تجزیاتی گفتگو کی گئی ہے اور انہیں دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے، خاص طور پر وہ نظریات زیر بحث آئے ہیں، جن کی بنیاد پر مسلمانوں کو مغرب کا دشمن ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ایوانہائے حکومت میں پرورش پانے والی بنیاد پرستی اور آزاد جمہوریت کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ سیموئیل ہنٹنگٹن کے فلسفۂ تہذیبوں کے تصادم پر بھی

اچھے مضامین ہیں، جو اس فلسفے کا پس منظر، پیش منظر اور پھر اس پر تنقید پیش کرتے ہیں۔ فرانسس فوکویاما کے نظریے The End of History کو تہذیبوں کے تصادم کے ساتھ رکھ کر مطالعہ کیا گیا ہے، ساتھ ساتھ دنیا کے مختلف ممالک اور قوموں میں اسلام سے خوف کے بارے میں بھی اہم گفتگو کی گئی ہے۔ کتاب کا لب لباب یہ ہے کہ مسلمان دراصل مغرب کے دشمن نہیں ہیں، بلکہ یہ مغرب ہے، جس نے انہیں اپنا دشمن قرار دے لیا ہے اور اس کی آڑ میں مسلمانوں سے برسرپیکار ہے۔

مسلمانوں اور غیر مسلم طاقتوں کے درمیان موجودہ کشمکش کے مختلف پہلوؤں اور زاویوں پر ہم نے چند کتابوں کے حوالے سے مختصراً گفتگو کی ہے تاکہ قارئین کسی نتیجے پر پہنچے اور مستقبل کے لیے اپنی رائے سازی کے لیے اگر چاہیں تو ان کتابوں کا مطالعہ کر سکیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ غیر مسلم طاقتیں ترقی پذیر ممالک خاص کر مسلم ممالک کو اپنی سیاسی اور معاشی نوآبادیوں میں تبدیل کرنا چاہتی ہیں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ معاشی وسائل پر قابض ہو سکیں۔ ایک اور اہم امریکی مصنف تھامس، پی ایم بارنٹ Thomas P.M.Barnett امریکی دفاعی پالیسی اور جنگی حکمت عملی کے پروفیسر اور تجزیہ کار کی

حیثیت سے اہم ترین مناصب پر فائز رہے ہیں۔ امریکہ کے منصوبوں پر انہوں نے اپنی اہم کتاب (The Pentagon's New Map: War and Peace in the Twenty First Century, G.P. Putman's sons New York 2003,2006) ''پینٹا گون کا تیار کردہ نیا نقشہ، اکیسویں صدی میں جنگ اور امن کی صورت حال'' میں گفتگو کی ہے۔ اس کتاب میں بنیادی طور پر امریکہ کی گلوبلائزیشن کی پالیسی، دفاعی ضرورتوں اور حکمت عملی پر گفتگو کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ مستقبل میں مغرب اور امریکہ مل کر دنیا کے نقشے کو کیا شکل دینے جا رہے ہیں اور اس کے لیے

دہشت گردی کے خلاف جنگ دراصل خلیج میں موجود تیل کے لیے جنگ ہے نیز یہ کہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد امریکہ کو ایک ''دشمن'' کی تلاش تھی، جس کی بناء پر وہ نہ صرف یہ کہ اس علاقے میں موجود رہے بلکہ خود امریکیوں کو بھی متحد رکھے۔

انہیں کیا کیا کرنا پڑے گا۔ آٹھ ابواب پر مشتمل یہ کتاب ''دنیا چلانے والوں'' کے لیے پہلے ایک ''سیاسی ودفاعی'' تجزیہ پیش کرتی ہے اور پھر ''سیاسی ودفاعی'' حکمت عملی پیش کرتی ہے۔ پہلے باب میں مصنف نے نئے نظام اور نئے دور کے لیے نئے قواعد متعارف کروائے ہیں۔ دوسرے باب میں ان امور پر توجہ دی ہے، جو امریکی حکمت عملی میں کم اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ تیسرا باب مختلف قوتوں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ اگر وہ نئے عالمی نظام سے کٹ کر رہے، تو یہ ان کے لیے نقصان دہ ہوگا۔ چوتھا باب حکمتِ عملی میں لوگوں اور ان کی جان لینے کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے، یعنی کس کے تیل کے لیے کس کا خون چاہیے؟ پانچواں باب اہداف کے تحت نئے نظام کی تشکیل، جب کہ چھٹا باب عالمی سطح پر اسلحے کی ترسیل اور فروخت نیز اس کے لیے اپنائی جانے والی حکمت عملی سے بحث کرتا ہے۔ ساتواں باب ان ''تصورات اور نظریات'' کے بارے میں ہے، جو امریکہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے دنیا میں پیدا کرتا ہے مثلاً عالمی عدم تیقن کا ہوا کھڑا کرنا، امریکہ کا دنیا کے لیے ماڈل ہونا اور پوری دنیا پر امریکی تسلط کا تاثر، امریکن ایمپائر کا بھوت وغیرہ وغیرہ۔ آٹھواں اور آخری باب ان امیدوں کے بیان پر مشتمل ہے، جن کا پورا ہونا ابھی غیر یقینی ہے۔ اس باب میں کچھ اہم تجاویز بھی دی گئی ہیں، جن کے ذریعے غیر مسلم طاقتوں کے خواب پورے ہو سکتے ہیں۔

اس مختصر مضمون میں ہم نے سینکڑوں کتابوں میں سے چند کو منتخب کر کے ''مسلم دنیا اور مغرب کی کشمکش'' کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا مقصد قارئین کی آراء سازی نہیں ہے، بلکہ دعوتِ مطالعہ وغور وفکر ہے۔

ڈاکٹر محسن مظفر نقوی اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن ہیں۔

امریکا کی ایک مسجد میں ایک مسلمان باپ اپنے بیٹے کے ساتھ۔ اسلامی میراث کی ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقلی کا یہ کام مغرب کے ہر شہر میں جاری ہے، اور اس ضرورت کے لیے بہت سے مراکز کام کر رہے ہیں۔
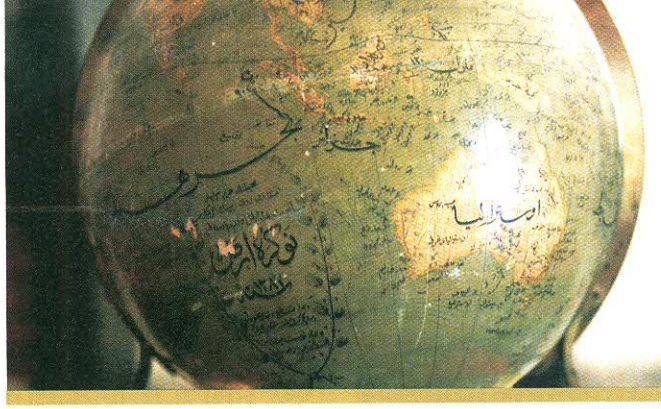
اسلام، مغرب
اور بین الاقوامی تعلقات کا مطالعہ

ڈاکٹر طاہر امین قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد میں بین الاقوامی تعلقات کے اُستاد ہیں۔

سماجیات کے باب میں جن علوم کو بیسویں صدی میں بطور خاص فروغ حاصل ہوا، ان میں ایک علم بین الاقوامی تعلقات کا مطالعہ ہے۔ اقوام کے باہمی تعلقات ہمہ جہتی ہوتے ہیں اور انسانی تمدن کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ان کی نوعیت بھی بدلتی رہتی ہے۔ قبائلی معاشرت سے لے کر قومی ریاست تک اور پھر قومی ریاست سے عالمگیریت تک انسان نے اجتماعیت کے حوالے سے جو سفر کیا، یہ علم اُس کا احاطہ کرتا ہے۔ زیرِنظر مضمون میں ڈاکٹر طاہر امین نے اُن نظریات کا ذکر کیا ہے، جن کے تحت آج مغرب میں اقوام کے باہمی تعلقات کو سمجھا جا رہا ہے۔ اس سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ مغرب کے اہلِ علم اسلام اور مغرب کے تعلقات کو کس زاویے سے دیکھ رہے ہیں۔

عالم اسلام اور مغرب کے باہمی تعلق کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ ان کے درمیان جہاں بہت سی اقدار مختلف ہیں وہاں بہت سی اقدار اور مفادات میں ہم آہنگی بھی ہے۔ سیموئیل ہنٹنگٹن کے ''تہذیبوں کے تصادم'' کے نظریہ کے برعکس یہ حقیقت ہے کہ موجودہ حالات میں دراصل ایک بین الاقوامی معاشرہ (Global Society) بن چکا ہے، جہاں لوگ اپنے تمام تر تضادات کے باوجود ایک پُرامن بقائے باہمی کے اصول پر ایک ساتھ رہنے پر مجبور ہیں۔ جب ہم عالم اسلام اور مغرب کی بات کرتے ہیں تو بالعموم ماضی کی تاریخ کے حوالہ سے اسلام اور مغرب کی طویل تاریخی کشمکش، صلیبی جنگوں کے تذکرہ سے شروع ہو کر مغرب کے موجودہ استعماری نظام تک اسی مفروضہ پر منتج ہوتی ہے کہ گویا اسلام اور مغرب میں ازل سے ایک تصادم جاری ہے جو ابد تک جاری رہے گا۔ میرے خیال میں یہ تاریخ کی ایک مسخ شدہ تصویر پیش کرنے کے مترادف ہے، جس سے نہ تو ماضی کی صحیح تاریخی تصویر سامنے آتی ہے، نہ حال کو سمجھا جاسکتا ہے اور نہ ہی مستقبل کے لیے کوئی قابلِ عمل حکمتِ عملی بنائی جاسکتی ہے۔

عالم اسلام اور مسلمانوں کو موجودہ مسائل سے نمٹنے کے لیے موجودہ عالمی نظام کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جب تک ہم موجودہ بین الاقوامی نظام کو نہیں سمجھیں گے، ہم صحیح راستہ کا تعین نہیں کرسکیں گے۔ مغربی علماء نے موجودہ عالمی نظام کے حوالے سے پانچ بڑے نظریات پیش کیے، جنہیں نہ صرف اپنے صحیح تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے بلکہ یہ نظریہ اسلام کے بارے میں ان کے رویوں کے مظہر بھی ہیں۔ یہ نظریات درج ذیل ہیں:

تاریخ کا اختتام (End of History)
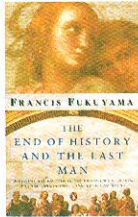
فرانسس فوکویاما نے ۱۹۸۵ء کے اوائل میں جب روس کا زوال شروع ہو چکا تھا، یہ نظریہ پیش کیا کہ مغرب کمیونزم سے جاری جنگ جیت چکا ہے۔ نظام سرمایہ داری کی فتح ہو چکی ہے اور مغربی جمہوریت اور سرمایہ دارانہ معیشت ہی دنیا کی آخری منزل ہیں، جس کے بعد کوئی ارتقا نہیں ہے۔ اس بنا پر کوئی مذہب اور کوئی نظریہ مغربی طرزِ فکر کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اسلام ایک خطرہ ہوسکتا ہے لیکن اس کی اپیل اور اثر دنیا کے ایک محدود حصہ میں ہے۔ اس لیے اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

تہذیبوں کا تصادم (Clash of Civilizations)

پروفیسر سیموئیل ہنٹنگٹن نے تاریخ کے اختتام کے نظریہ کو مسترد کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ آئندہ آنے والی صدی تہذیبوں کے تصادم کی صدی ہوگی۔ اور تاریخ کا آغاز تو ایک طرح سے اب ہوا ہے۔ کمیونزم اور سرمایہ داری کی جنگ تو دراصل دو مغربی افکار کی جنگ تھی لیکن آنے والے دنوں میں چھ یا سات تہذیبیں آپس میں نبردآزما ہوں گی اور عالمی نظام کا نقشہ بہت مختلف ہوگا۔ ہنٹنگٹن نے کنفیوشس تہذیب اور اسلام کو مغرب کے لیے سب سے بڑا ابھرتا ہوا خطرہ قرار دیا۔ اور یہ کہا کہ مغرب کو اپنا غلبہ برقرار رکھنے کے لیے ان خطرات سے نمٹنا ہوگا۔

مختلف طاقتوں کے اُبھرنے کا نظریہ (Multipolarity)

جان میر شائر نے یہ نظریہ پیش کیا کہ دنیا میں قوت اور طاقت کے کئی نئے مراکز ابھر رہے ہیں، جن میں امریکہ، روس، یورپ کے علاوہ چین، ہندوستان اور جاپان بھی قابل ذکر ہیں۔ عالمی نظام جو کہ امریکہ کے غلبہ کے تحت آئندہ مختلف طاقتوں کی باہمی کشمکش اور آویزش سے عبارت ہوگا اس میں عالم اسلام چونکہ ایک طاقت کے طور پر شریک نہیں ہے اس لیے اس کا کوئی خاص وزن نہیں ہوگا۔

باھمی رشتوں کا نظریہ (Complexion of Interdependence)

جوزف نے یہ نظریہ پیش کیا کہ موجودہ عالمی نظام نے مکڑی کے جالے کی طرح ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ سیاسی اور معاشی مفادات نے موجودہ ریاستوں کو آپس میں تعاون اور پرامن بقائے باہمی کی پالیسی پر مجبور کر رکھا ہے۔ اسلام بہرحال ایک خطرہ ہے لیکن باہمی رشتوں کے جال نے اس خطرہ کو محدود کیا ہوا ہے۔

آنے والے خلفشار کا نظریہ (Criminal Anarchy)

رابرٹ ڈی کیلانی نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ آنے والی دنیا شدید خلفشار کی دنیا ہوگی۔ ماحولیاتی مسائل، آبادی میں بے تحاشا اضافہ، پانی کی کمی، وسائل پر جنگ دنیا کو شدید انتشار کا شکار کر دیں گے۔ اس صورت حال میں اسلام ایک مثبت کردار ادا کر سکتا ہے، کیونکہ اسلام ایک مختلف نظریہ حیات ہے۔

مندرجہ بالا نظریات سے بین الاقوامی نظام کی جو تصویر ابھرتی ہے، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مغرب ساری دنیا پر اپنا تسلط چاہتا ہے اور اس تسلط کو مختلف النوع اداروں کے ذریعہ مضبوط تر کرنا چاہتا ہے۔ اسلام کے بارے میں ایک خطرہ کا تصور پایا جاتا ہے اگرچہ بعض اہم علم اسے ایک پرامن اور مثبت قوت بھی خیال کرتے ہیں۔ اس صورت حال میں عالم اسلام کو سمجھنا چاہئے کہ مغرب کے تسلط کو کس طرح اسی کے طریقوں سے پرامن بقائے باہمی کے لیے مجبور کیا جا سکتا ہے۔

امریکا: مختلف مذاہب کے پیروکار عبادت میں مصروف

عالم اسلام کو جہاں مغرب کے ساتھ پرامن بقائے باہمی کے اصولوں پر روابط استوار کرنے کی ضرورت ہے، وہاں مغرب بنائے ہوئے عالمی نظام اور اس کی حکمت عملی کو سمجھنے کی بھی ضرورت ہے۔ عالم اسلام اور مسلمانوں کو اسی سطح کے ادارے بنانے ہوں گے جو مغرب کی قوت کے مظہر ہیں۔ یا انہی اداروں میں اپنے لیے اس طرح سے جگہ بنانی ہوگی کہ جہاں ہم اپنے مفادات کا تحفظ کر سکیں۔ عالم اسلام اس وقت ایک شدید فکری بحران کا شکار ہے۔ اسلامی تحریکیں نوجوان نسل میں اپنا اثر کھو بیٹھی ہیں۔ تشدد پسندی، انتہا پسندی اور دہشت گردی آہستہ آہستہ اس نسل کو غلط راستوں کی طرف لیے جا رہی ہیں۔ فکری رہنمائی مفقود ہے اور عالم اسلام ایک ایسے رستے کی طرف جا رہا ہے جو صریحاً تباہی اور بربادی کا راستہ ہے۔ یہ صورت حال اس بات کی متقاضی ہے کہ عالم اسلام میں ایک نیا فکری انقلاب آئے جو انہیں باہم مربوط کرتے ہوئے، جہاں انہیں ایک واضح منزل کا راستہ دے وہاں ان کے اندر یہ اعتماد بھی پیدا کرے کہ وہ اس کے بین الاقوامی نظام میں اپنے تشخص کے ساتھ زندہ رہ سکتے ہیں اور ان کی صلاحیتیں منفی کاموں کے بجائے تعمیر ملت کے لیے صرف ہوں۔

اقبال اور مغرب

اکثر لوگ حکیم الامت کی منظوم اور نثری تحریروں کو الگ الگ پڑھتے ہیں اور مجموعی مطالعے کی سعی نہیں کرتے، اس لیے قارئین کے ہر طبقے کا ردعمل جزوی اور یک طرفہ ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فرنگ کی تلخ ترین تنقید، علامہ کی منظوم کتابوں میں ہے جن میں ان کا لہجہ تند و تیز بلکہ بعض اوقات بے حد احتجاجی اور تلخ ہو گیا ہے۔ اس کے بعد ان کے خطوط اور نثری مقالات آتے ہیں جن میں درشتی کم ہے مگر ہے ضرور اور آخر میں انگریزی خطبات آتے ہیں جن میں نقد و جرح تو ہے مگر استدلال کا توازن اور فکر کی گہرائی اور مغرب کے بڑے فلسفیوں کا اعتراف بھی ہے۔

فرنگ سے متعلق اقبال کی نقد و جرح کے بڑے میدان تین ہیں:

۱۔ مغربی سیاست

۲۔ مغربی معاشرت

۳۔ مغربی فکریات

دراصل پہلی دو صورتیں بھی مغربیوں کے تصورات و فکریات ہی کے علمی نتائج و آثار ہیں جن کی خارجی شکلیں ان کی سیاست اور معاشرت میں ظہور پذیر ہوئی ہیں۔

(''مطالعہ اقبال کے چند نئے رُخ'' ڈاکٹر سید عبداللہ)

اسلام اور مغربی دنیا

اصغر علی انجینئر

ایک ایسا وقت گزرا ہے جب یورپ اور شمالی امریکہ میں ایک ہی مذہب اور ایک ہی کلچر تھا، اگرچہ یورپ بہت سی لسانی اکائیوں پر مشتمل تھا۔ آج یورپ اور شمالی امریکہ دونوں میں کئی مذاہب پر عمل کیا جاتا ہے اور ان ممالک نے کثیر الثقافتی نظریہ اختیار کرلیا ہے کیونکہ ان ممالک میں مختلف مذاہب اور ثقافتوں کے لوگوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور مختلف مذاہب کے پیروکار وہاں خاصی بڑی تعداد میں اقلیتوں کے طور پر رہتے ہیں۔

دیگر مذاہب کے آباد کاروں کی طرح مسلمان بھی یورپ اور شمالی امریکہ دونوں میں سب سے بڑی اقلیت کے طور پر قیام پذیر ہیں۔ یورپی تاریخ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان سیاسی کشمکش رہی ہے۔ صلیبی جنگیں یورپی تاریخ کا حصہ ہیں اور ان جنگوں کی وجہ سے اب تک یورپی نفسیات پر مسلمانوں کے بارے میں یہ غلط تاثر غالب ہے کہ ''مسلمانوں کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قرآن تھا''۔ امریکہ اور مشرق وسطیٰ کے درمیان موجودہ کشمکش کی صورت میں یہ آویزش آج بھی جاری وساری ہے۔

موجودہ دور میں یہ کشمکش بڑھ گئی ہے اور ۹ ستمبر کے حملہ نے اس کشمکش میں زیادہ شدت پیدا کردی ہے۔ مسلمانوں کی اپنی صفوں میں موجود شدت پسند لوگ، مشرق وسطیٰ میں مغرب کی شدت پسندی کا جواب شدت پسندی سے دے رہے ہیں اور اس کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ اس خطے کے مسلمانوں اور اسلام کے خلاف مغرب میں شدید تعصب پایا جاتا ہے۔ مسلمان شدت پسند مغربی ممالک میں تشدد پھیلانے کے لیے (بلاشبہ غلط طور پر) جہاد کا نعرہ لگاتے ہیں اور اس سے یہ غلط تاثر مضبوط ہو رہا ہے کہ اسلام تشدد اور جنگ کا مذہب ہے اور دوسرے مذاہب خاص طور پر عیسائیت کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر رہنے کے لیے تیار نہیں۔

یہ تاثر اگرچہ غلط ہے مگر پوری غیر مسلم دنیا میں عام ہے۔ تاریخ میں جو کچھ بھی بیان ہوا ہے اسے اسلام سے منسوب نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ایسے بیانات اور واقعات مشاہداتی طور پر بیان کردہ ہوتے ہیں، یہ کسی مذہب کی حقیقی صورتحال پر مبنی نہیں ہوتے اور مذہبی تعلیمات کا موازنہ کسی دوسرے مذہب کی مذہبی تعلیمات سے اور تاریخ کا کسی دوسرے مذہب کی تاریخ سے موازنہ ہونا چاہئے نہ کہ تاریخ کا موازنہ تعلیمات سے کیا جائے۔ اسلام نے ہمیشہ یہودیت اور عیسائیت کے ساتھ متوازی سطح پر بقائے باہمی کے اصول کے تحت بطور مذہب اپنے آپ کو برقرار رکھا ہے۔ اگرچہ قرون وسطیٰ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جنگیں (اسلام اور عیسائیت کے درمیان نہیں) ہوتی رہیں۔ یہ جنگیں اور لڑائیاں حکمران طبقوں کے درمیان ہوتی تھیں نہ کہ مسلمان اور عیسائی عوام میں۔ (آج بھی) مغربی اخبارات مفادات کے ٹکراؤ کو مذاہب کے ٹکراؤ کے طور پر پیش کر رہے ہیں، ساتھ ساتھ مسلمان بنیاد پرست ایسا رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں جس سے ایسا تاثر مل رہا ہے کہ جیسے کوئی مذہبی ٹکراؤ فی الواقعہ موجود ہے۔

آج تہذیبوں کے درمیان کوئی تصادم موجود نہیں ہے۔ اگرچہ پروفیسر ہنٹنگٹن کی خواہش ہوگی کہ ہم اس کی بات کو سچ مان لیں۔ ہنٹنگٹن کے مقالے کا بنیادی موضوع عیسائی اور مسلمان حکمرانوں کے درمیان ہونے والی جنگیں ہیں۔ اس نے مذہبی تعلیمات کے مبینہ ٹکراؤ کو اپنے مقالے کا موضوع نہیں بنایا۔ قرون وسطیٰ میں بھی مذاہب کے درمیان کسی قسم کا تصادم موجود نہ تھا بلکہ جو لڑائیاں بھی ہوئیں وہ عیسائی اور مسلمان سلطنتوں کے درمیان لڑی گئی تھیں۔ جب مسلمان ایک غالب قوت تھے اس وقت یہودی اور عیسائی حکومت میں اہم مناصب پر فائز تھے۔ مسلمان ممالک میں یہودی اور عیسائی رعایا ہمیشہ امن وسلامتی کے ساتھ رہے جبکہ انہیں یورپ میں تنگ کیا جاتا رہا اور انہیں پسماندہ علاقوں میں رہنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ اسلامی ممالک میں انہیں کبھی ایسے جبر اور پریشانی کا سامنا نہیں ہوا۔

احمد ایم ایچ شبول اپنے مقالے ''بازنطینی مذہب اور ثقافت کے بارے میں اسلامی عربوں کا تصور'' میں لکھتے ہیں کہ ''اسلام کا وہ زمانہ جب عرب غلبہ میں تھے مذہبی، سیاسی اور فوجی صورت حال کے منظر نامہ کو سامنے رکھتے ہوئے، عرب بازنطینی کشمکش کی حقیقی تاریخ کے مطالعہ کے بعد، کیا کوئی شخص عرب فتوحات اور بعد کے ادوار میں اس کشمکش کو بغیر کسی دقت کے اور اصولی طور پر مذہبی کشمکش قرار دے سکتا ہے؟ میرے خیال میں ایسا کوئی تصور غلط اور گمراہ کن ہوگا۔'' اس کے بعد آپ نارمن ڈینئیل کے

خیالات بیان کرتے ہیں کہ ''ایسے کسی تصادم کے تصور کو تاریخی حقیقتوں میں جا کر دیکھنے اور سچ کی تلاش کیے بغیر اسے مذہبی جنگ قرار دینا ایک غلط بات ہوگی''۔

فتوحات کے حوالے سے عرب بازنطینی جنگوں میں موجود پیچیدہ معاملات کے ضمن میں جناب احمد مزید لکھتے ہیں کہ ''مذکورہ تصادم اور کشمکش کے بارے میں عرب بازنطینی معاملات کا ذکر جن کتب اور ذرائع میں موجود ہے، ان ذرائع میں اس تصادم کے معاشی، سیاسی اور قبائلی عوامل کا بھی ذکر ہے جن کی وجہ سے ماضی میں یہ تصادم واقع ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی عرب اسلامی ادب، کشمکش کو مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جنگ کے طور پر پیش کرنے کی بجائے اس کی عربوں اور بازنطینیوں کے درمیان تصادم کے طور پر تصویر کشی کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی تصدیق شامی ذرائع اور کتب سے بھی ہوتی ہے۔ شام کے عیسائی عرب جنگجوؤں کی ایک بڑی تعداد نے بازنطینیوں کے خلاف مسلمان افواج کا ساتھ دیا تھا، جبکہ کئی دوسرے عیسائیوں اور سامریوں نے (جو فلسطین کے رہنے والے تھے) پیش قدمی کرنے والے مسلمان عربوں کے ساتھ کئی طریقوں سے تعاون کیا۔ لہٰذا قرون وسطیٰ میں جو بھی جنگیں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان لڑی گئیں ان کی ماہیت مذہبی نہیں تھی بلکہ یہ جنگیں مختلف سیاسی اور نسلی وجوہات اور عوامل کی بنیاد پر لڑی گئی تھیں اور ان میں عرب عیسائیوں نے مسلمان عربوں کا ساتھ دیا تھا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہونے والی ان جنگوں کے بارے میں قائم غلط تصور کو ختم کیا جائے۔ اس غلط تصور کے خاتمہ سے موجودہ کشمکش کی ماہیت پر بھی دور رس نتائج مرتب ہوں گے۔ (حقیقت یہ ہے کہ) اسلام دیگر مذاہب بطور خاص عیسائیت اور یہودیت کے ساتھ بامقصد اور متحمل تعلقات کا حامی رہا ہے۔

آج یورپ اور شمالی امریکہ میں مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد آباد ہے۔ پوری دنیا میں مسلمان بطور اقلیت اور بہت سے ملکوں میں جمہوری نظاموں کے تحت رہتے ہیں۔ لہٰذا قرون وسطیٰ اور موجودہ دور کی حقیقی صورت حال کے درمیان ایک واضح فرق پایا جاتا ہے۔ قرون وسطیٰ میں مسلمان سلطنت دنیا کے وسیع وعریض خطوں تک پھیلی ہوئی تھی اور مسلمانوں کی کثیر تعداد اسلامی نظام حکومت کے تحت رہ رہی تھی۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی کچھ تعداد ایسے علاقوں میں بھی آباد تھی جہاں وہ اقلیت میں تھے۔ لہٰذا فقہاء نے اس دور میں جو ادب تخلیق کیا وہ مخصوص سیاق وسباق کا حامل تھا۔ (اس دور میں) اول یہ کہ مسلمان اکثریت میں تھے۔ ثانیاً حکمران مسلمان تھے اور مسلمان حکومتیں بادشاہی نظام کے تحت چلائی جارہی تھیں یعنی وہاں جمہوری نظام رائج نہ تھا۔ لہٰذا موجودہ دور میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے حوالے سے تمام فقہ پر نظر ثانی کی ضرورت ہے تا کہ ایسی نئی فقہ مرتب کی جائے جو نئے حالات اور نئے دور کے تقاضوں کو پورا کرے۔ آج دارالحرب اور دارالاسلام کے تصورات مکمل طور پر فرسودہ ہو چکے ہیں۔

آج ہمیں ایک طرف جمہوری طرز حکومت اور دوسری طرف انسانی حقوق اور غیر مسلم شہریوں کے حقوق جیسے معاملات کو سامنے رکھ کر نئی فقہ کی تشکیل کرنا ہوگی۔ ہمارے فقہاء کو مشینی انداز سے قرون وسطیٰ کے فقہاء کی رائے کو ہی نہیں دوہرانا چاہیے، جنہوں نے بہت ہی مختلف نوعیت کے سیاق وسباق کے اندر رہ کر کام کیا تھا۔ انہوں نے اپنے مخصوص تجربات وحالات کو سامنے رکھ کر مختلف قسم کے مسائل کا حل تلاش کیا تھا۔ ہمیں اپنے حالات اور سیاق وسباق کے حوالے سے اپنے مسائل ومشکلات کا حل تلاش کرنا ہے۔ اہل کتاب کے لیے قرآن پاک کا اہل الذمہ کا تصور بہت تخلیقی اور ذمہ دارانہ تھا۔ حفاظت کی ذمہ داری کو احسن طریقے سے پورا کرنے کے لیے قرآن پاک نے غیر مسلموں پر جزیہ عائد کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ تاہم اب ایسا کرنا صحیح نہیں ہوگا۔ اہل الذمہ کا تصور آج کے بدلے ہوئے حالات میں نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن کا پیش کردہ ذمی کا تصور اس وقت کے حالات سے مخصوص تھا نہ کہ یہ ابدی طور پر لاگو کیے جانے والے اصول کے طور پر تھا۔ آج تمام اقلیتوں کو اقوام متحدہ کے منشور اور بین الاقوامی قانون کے تحت یکساں سیاسی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے۔ غیر مسلم شہریوں کے بارے میں فقہ مرتب کرتے وقت اقوام متحدہ کے اس منشور کو ضرور سامنے رکھا جانا چاہیے۔ غیر مسلم اقلیتیں بھی ان حقوق کی اتنی ہی حقدار ہیں جتنی کہ مسلمان اقلیتیں غیر مسلم ممالک مثلاً یورپ، شمالی امریکہ، ہندوستان اور کئی دوسرے ممالک میں مستحق ہیں۔

> مذہبی تعلیمات کا موازنہ کسی دوسرے مذہب کی مذہبی تعلیمات سے اور تاریخ کا کسی دوسرے مذہب کی تاریخ سے موازنہ ہونا چاہئے نہ کہ تاریخ کا موازنہ تعلیمات سے کیا جائے۔

اگر کوئی مذہبی اقلیتی حکومت قائم ہو تو وہ بھی مذہبی اور ثقافتی حقوق کی ضمانت دے گی۔ قرآن پاک کے پیش کردہ اہل الذمہ کے تصور میں بھی مذہبی اور ثقافتی حقوق کی ضمانت دی گئی تھی، صرف سیاسی حقوق کی ضمانت نہیں دی گئی تھی۔ موجودہ تبدیل شدہ حالات میں سیاسی حقوق کی بھی ضمانت دینا ہوگی۔ ایک خاص حد کے بعد اقلیتوں کو نہ صرف مکمل شہری حقوق دیے جانے چاہئیں بلکہ ثقافتی اور مذہبی حقوق بھی۔ لہٰذا نئی فقہ ترتیب دیتے ہوئے ان سب باتوں کو مدنظر رکھا جانا چاہیے اور مسلمان ممالک کو بھی یہی حقوق اپنے مسیحی، یہودی یا دیگر غیر مسلم شہریوں کو دینے کا اہتمام کرنا ہوگا۔

ایک خاص مرحلے کے بعد غیر مسلموں کے ساتھ عام شہریوں جیسا سلوک کیا جانا چاہیے اور انہیں مکمل مذہبی اور ثقافتی حقوق بھی دیئے جانے چاہئیں۔ بدقسمتی سے مسلمان ممالک میں غیر مسلموں کو مکمل شہری حقوق حاصل نہیں اگرچہ انہیں وہاں اپنے مذاہب پر عمل کرنے کی آزادی دی گئی ہے۔ مسلم ممالک میں غیر مسلموں کے ساتھ

اب بھی دوسرے درجے کے شہریوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ چند مسلم ممالک میں تو انہیں اپنے مذہبی مقامات کا انتظام سنبھالنے یا عبادت کے مقامات قائم کرنے کی آزادی نہیں ہے۔

اس کے برعکس قرآن کی تعلیمات سے واضح ہوتا ہے کہ تمام مذہبی مقامات کی یکساں حفاظت کی ضمانت فراہم کی جائے اور ان کی تعداد بڑھانے کی بھی اجازت دی جانی چاہئے۔ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے "یہ وہ لوگ ہیں کہ اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے (انہوں نے کچھ قصور نہیں کیا) ہاں یہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار خدا ہے اور اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو (راہبوں کے) صومعے اور (عیسائیوں کے) گرجے اور (یہودیوں کے) عبادت خانے اور (مسلمانوں کی) مسجدیں جن میں خدا کا بہت ساذکر کیا جاتا ہے گرائی جا چکی ہوتیں۔ اور جو شخص خدا کی مدد کرتا ہے خدا اس کی ضرور مدد کرتا ہے" (۲۲:۴۰)

قرآن پاک میں نہ صرف مسلمانوں کو مکمل مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے بلکہ تمام دوسرے مذاہب مثلاً عیسائیت اور یہودیت کو بھی قرآن پاک یہ ضمانت فراہم کرتا ہے۔ [اس ضمانت کے تحت] مسجدوں کے ساتھ ساتھ یہودیوں اور عیسائیوں کی عبادت گاہوں کی بھی حفاظت کی جانی چاہئے۔ اقلیتوں کے حقوق کی دونوں صورتوں میں ضمانت دی جانی چاہئے کہ جب مسلمان خود اقلیت میں ہوں اور اس وقت بھی جب غیر مسلم اقلیت میں ہوں۔ قرآن پاک کے احکام کی اس نہایت واضح اور نمایاں روح کو قرون وسطیٰ کے فقہی ادب میں سے نکال دیا گیا تھا۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ اس وقت مسلمانوں کو اقتدار اور طاقت حاصل تھی۔

غیر مسلم شہریوں کے بارے میں فقہ پر غور وخوض کرتے ہوئے قرآن کی اس روح، جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، کو دوبارہ جگہ دی جانی چاہئے۔ اس عالمگیر اور سمٹے ہوئے فاصلوں والی دنیا میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بطور اقلیت دنیا کے دیگر ممالک میں رہائش پذیر ہے اور مغرب کے اکثر ممالک میں انہیں یکساں شہری حقوق حاصل ہیں۔ اگرچہ عملی طور پر مسلمانوں کو کافی مسائل کا سامنا ہے مگر آج اسلام سیکولر جمہوری ممالک میں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ سیکولر ڈیموکریسی ان قوانین اور اعتقاد کے نظاموں پر گہرا اثر مرتب کرتی ہے جو اس کے تابع پروان چڑھیں۔ مغربی ممالک میں سیکولر ڈیموکریسی اسلام پر بھی اثر مرتب کر رہی ہے۔ کمیونزم کے ساتھ بھی ایسا ہوا تھا۔ کمیونزم نے سوویت یونین میں استبداد پر مبنی نظام کی ترویج کی تھی۔ لوگوں کو بنیادی آزادی حاصل نہ تھی مگر یورپ میں کمیونزم پر جمہوری مغرب نے گہرا اثر ڈالا اور چند کمیونسٹوں نے "یوروکمیونزم" کا تصور اجاگر کیا جو دوسرے نظاموں کے لیے فطری طور پر زیادہ متحمل، مؤدب اور جمہوری تھا۔

اسی طرز پر یورو اسلام کا تصور اجاگر کرنے کی ضرورت ہے جو کثرت اور کثیر الثقافتی رجحانات کے حق میں ہو اور دوسرے ادیان کے لیے بردبار رویے کا حامل ہو اور ان کے لیے اپنے اندر تکریم واحترام رکھتا ہو۔ یورو اسلام کا یہ تصور مغربی طرز زندگی کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ کے لیے ہوگا مگر اس کا قبول کرنا اسلام کے لیے ضروری ہے۔ شریعت کے قوانین کو نافذ کرنے کا مسئلہ بھی نہایت اہم ہے۔ اکثر مسلمان شریعت کے قوانین کو اسی صورت میں نافذ کرنے پر زور دیتے ہیں جس صورت میں انہیں یہ ورثے میں ملے۔ اس سے پیچیدہ مسائل جنم لیتے ہیں۔

اسی طرح حجاب کے تنازعہ نے بھی بہت سے یورپی ممالک بشمول فرانس اور انگلستان کو اپنی لپیٹ میں لیا ہے۔ فرانسیسی حکومت نے تعلیمی اداروں میں حجاب پہننے پر پابندی عائد کر دی ہے، یہ پابندی بذات خود کثیر الثقافت ہونے کے تصور کے خلاف ہے۔ مگر مسلمانوں کو بھی اپنی چند رسومات پر از سر نو غور کرنا ہوگا۔ مثال کے طور پر انگلستان میں ایک اسکول کی خاتون استاد نے کلاس کے اندر بھی اپنا نقاب (جس میں سے دو آنکھیں ہی ظاہر تھیں) اتارنے سے انکار کر دیا اور زور دیا کہ یہ اس کا مذہبی عقیدہ ہے۔ یہ رویہ کسی طور بھی درست نہیں۔ قرآن پاک میں کہیں بھی یہ مطالبہ نہیں کہ عورتیں اپنا چہرہ ڈھانپیں۔ قرآن پاک میں صرف نظر نیچی رکھنے اور باوقار لباس پہننے کی تاکید ہے (ملاحظہ کیجئے ۲۴:۳۱)۔ کسی بھی فقیہ نے چہرہ ڈھانپنے پر زور نہیں دیا۔ سب فقہاء کا اتفاق ہے کہ چہرہ اور ہاتھ کھلے رکھے جا سکتے ہیں۔ یہ جاگیردارانہ

امریکا میں قرآنی پوسٹرز کی نمائش

معاشرے میں فروغ دی گئی ثقافتی رسم ہے اور طبقہ خواتین پر جبراً مسلط کی گئی ہے۔ غیر مسلم شہریوں کے بارے میں فقہ مرتب کرتے وقت ایسی ثقافتی رسومات پر نظر ثانی کرنا ہوگی جن پر مذہب کی آڑ میں عمل کیا جاتا ہے۔ ان مسائل پر از سر نو غور درکار ہے۔ آج کوئی بھی یہ مشورہ نہیں دے رہا کہ مسلمان خواتین مغربی طرز کا لباس پہنیں (جسے مردوں نے بڑی عجلت سے بغیر شرعی مسائل کی پرواہ کیے پہن لیا ہے)۔ تاہم وہ باوقار لباس پہنیں جس سے جنسی کشش پیدا نہ ہو۔

روایت پسند مسلمان قرآن پاک کے احکام پر عمل کرنے کی بجائے مختلف فقہاء کی آراء پر عمل پیرا ہیں۔ نقاب کرنا ہرگز قرآن پاک کے احکام کے مطابق نہیں، نہ ہی اس کا تعلق جنسی رویے کے بارے میں اسلامی تعلیمات سے ہے۔ یہ بعض عرب ممالک مثلاً سعودی عرب میں تہذیب وتمدن کا حصہ ہے، جس کی دوسرے ممالک میں رہنے والے مسلمان باقاعدہ لگے بندھے انداز سے نقل کرتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ سعودی عرب ایک ماڈل اسلامی ریاست ہے۔ ایسا رویہ مغرب کے اصل باشندوں اور وہاں ہجرت کے ذریعے پہنچے ہوئے لوگوں کے درمیان مسائل پیدا کر دیتا ہے۔ یورپ، شمالی امریکہ اور دیگر مغربی ممالک نے کثیر الثقافتی اور مذہبی کثرت کو قبول کر لیا

ہے۔ مگر جب ایک مذہب کو ماننے والا گروہ کسی سمجھوتے یا کچھ لو اور کچھ دو کی روح پر عمل پیرا نہیں ہوگا تو ایسی صورت میں دو مذاہب کے درمیان تناؤ لازمی طور پر ابھرے گا۔ لہٰذا کسی کو بھی بنیادی اصول وضوابط کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہئے بلکہ کچھ لو اور کچھ دو کے نظریہ پر عمل کرنا چاہئے۔

قرون وسطیٰ کے دوران مرتب کی گئی فقہ میں یقینی طور پر جاگیردارانہ ثقافت کی جھلک ملتی ہے جو جدید جمہوری کلچر کے مطابق نہیں، جس کی بنیاد انسانی حقوق اور حقوق نسواں پر ہے۔ نئی فقہ اگر صرف مسلمہ قرآنی احکام کو بنیاد بنا کر آگے بڑھائی جائے تو یہ جدید اقدار کو اپنے اندر سمونے میں مدومعاون ثابت ہوگی اور مسلمان عورتوں کو
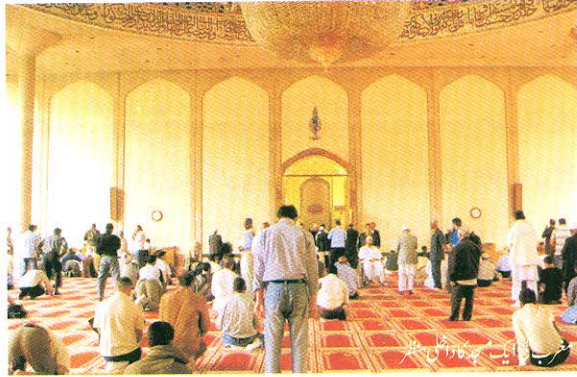
انتخاب وعمل کی آزادی حاصل ہوگی۔ مغربی معاشرے میں بنیادی آزادی بہت اہم کردار ادا کرتی ہے اور قرون وسطیٰ کا کلچر چونکہ جاگیردارانہ ہے۔ لہٰذا زندگی میں بنیادی آزادی کے پہلوؤں کو محدود کر دیتا ہے اور استبدادانہ کلچر کو خدائی قرار دے کر نافذ کرنے پر منتج ہوتا ہے۔

تاہم، یورو اسلام کے فلسفے کو مغربی معاشرے میں رائج بنیادی آزادیوں کے فلسفے کے ساتھ ہم آہنگ بنانا ہوگا اور ایک نئی فقہ کی ترویج کرنا ہوگی جو جمہوری کلچر سے ہم آہنگ ہو۔ قرآن مسلمانوں سے دوسرے مذاہب کی تکریم کا مطالبہ کرتا ہے اور یہ مطالبہ بھی کرتا ہے کہ مسلمان دوسروں کی تہذیب اور تمدن کا احترام کریں جب تک غیر مسلم بنیادی اسلامی اخلاقیات کی بے حرمتی نہ کریں۔ آج مسلمان دانشوروں کو غیر مسلم معاشروں کے لیے نئی فقہ کی تیاری کے لیے تخلیقی کردار ادا کرنا ہوگا۔ مسلم ممالک میں روایت پسند علماء بہت اثر ورسوخ رکھتے ہیں۔ لہٰذا کوئی تبدیلی لانا نہایت مشکل کام ہے۔ اس کے برعکس یورپی ممالک میں حالات مختلف ہیں۔ بلاشبہ روایت پسند علماء ان ممالک میں بھیجے جارہے ہیں اور وہ مسجدوں میں روایتی فہم دین پر مبنی خطبے دیتے ہیں اور بہت سے مسلمان ان خطبوں سے تاثر بھی قبول کر لیتے ہیں اور روایتی شریعت پر عمل کرنے کے خواہشمند ہیں۔

روایت پسند اسلام انہیں ایک اور وجہ سے بھی اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یہ بیگانگی کا احساس ہے۔ بیگانگی کا یہ احساس انہیں روایتی آبائی ثقافت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ نسلی حملے بھی اس احساس کو مزید شدید کر دیتے ہیں اور ان دونوں تہذیبوں کے درمیان سمجھوتا پیدا کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ موجودہ دور کی سیاسی صورت حال بھی اسلام اور مسلمانوں کے لیے معاندانہ بن چکی ہے۔ چند مسلمان نوجوان القاعدہ کے نیٹ ورک کی طرف کئی پیچیدہ وجوہات کی بناء پر مائل ہورہے ہیں۔ مثلاً اسلامی دنیا، خاص طور پر مشرق وسطیٰ سے روا رکھی جانے والی سیاسی پالیسیوں کی وجہ سے کئی نوجوان القاعدہ کے نیٹ ورک کا حصہ بن رہے ہیں۔ آج اسلام کو تشدد پسندی اور انتہا پسندی کا ہم معنی خیال کیا جاتا ہے۔

قرآن پاک عقل کے استعمال پر بہت زور دیتا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور جس کو دانائی ملی بے شک اس کو بڑی نعمت ملی'' (۲:۲۶۹)۔ مسلمان جس صورت حال میں گھرے ہوئے ہیں اس سے نپٹنے کے لیے عقل کا استعمال کیوں نہیں کرتے۔ تشدد آمیز جوابی اقدامات بہت بڑی تعداد میں معصوم جانوں کے زیاں کا باعث بن رہے ہیں اور دشمنی میں بھی اضافہ ہورہا ہے۔ آپ مغربی طاقتوں کی طرف سے شدت پسندی کا جواب کہیں نہ کہیں بم پھینک کردے سکتے ہیں مگر اس سے کوئی بھلائی نہیں ہوگی۔ اس کی بجائے عقل کا استعمال کر کے مغربی ممالک میں لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کی جاسکتی ہیں اور مغربی حکمرانوں کو پوری دنیا میں رائے عامہ کی نظر میں تنہا کیا جاسکتا ہے۔ عقلمندی یہ ہے کہ پرامن انداز سے میڈیا کی ہمدردی حاصل کی جائے۔ اور تشدد پسندی ذرا بھی برداشت نہ کی جائے۔ قرون وسطیٰ کی فقہ میں جہاد کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ قرون وسطیٰ میں ہی جہاد کی صورت تبدیل ہوگئی تھی۔ اسی دور میں ہر چیز کا فیصلہ تلوار سے کیا جاتا تھا اور لوگوں کے حقوق کا تصور موجود ہی نہ تھا، ہمیں اس طرح کے فہم دین کو رد کر دینا چاہئے اور نئی فقہ میں امن اور انسانی حقوق پر زور دیا جانا چاہئے۔ امن وسلامتی کو اسلام میں مرکزی مقام حاصل ہے۔ سلام (امن) اسلام کا جزو لاینفک ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا وصفی نام بھی ہے۔

لہٰذا نئی فقہ میں سلام، رحمت، حکمت اور عدل جیسی اقدار کو مرکزی مقام دیا جانا چاہئے۔ نئی فقہ کے لازمی جزو کے طور پر ان اقدار کی تعلیم تمام مدارس میں دی جانی چاہئے۔ یہ سب سے بنیادی اقدار ہیں جن کی تعلیم قرآن پاک میں دی گئی ہے۔ ایسا کرنے سے اسلام کا تاثر مکمل طور پر بدل جائے گا۔ اس طرح پیدا شدہ تاثر زیادہ کریم النفس ہوگا اور بدترین دشمن بھی اسلام کا احترام کرنے پر مجبور ہوں گے۔ نئی قیادت کو چاہیئے کہ وہ ان روایت پسند علماء کو بطور خاص پیش نظر رکھے جو نئی سوچ اپنانے میں مشکل محسوس کرتے ہیں۔

بہت سے لوگوں کو یہ بات بہت ناقابل عمل معلوم ہوگی، مگر اسلام میں یہ تبدیلی ہمارے پیچیدہ مسائل کا قابل عزت حل ثابت ہوگی اور یہ جنگ سے تباہ حال دنیا میں امن اور بقائے باہمی کو یقینی بنائے گی جبکہ اس وقت دنیا کا امن طاقتور امریکی مفادات کی زد میں ہے۔ ہمیں، یاد رکھنا چاہئے کہ تشدد کے ذریعے جواب دے کر ہم امریکہ کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔

اصغر علی انجینئر انسٹیٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز، ممبئی، انڈیا کے صدر نشین ہیں۔

ترجمہ: محمد اشرف طارق، ٹرانسلیشن آفیسر، اسلامی نظریاتی کونسل
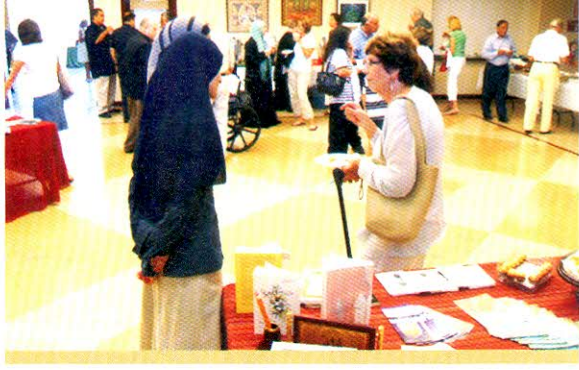
اسلام اور مغرب

حقیقی فرق کیا ہے؟

گڈرون کرامر

گڈرون کرامر ایک اسلامی سکالر ہیں۔ وہ اس مقالہ میں مسلمانوں کی برداشت اور مذہبی آزادی کے بارے میں بحث کرتی ہیں، موجودہ دور کے تنازعات میں صلیبی جنگوں اور نوآبادیات کے کردار اور مغربی ناقدین کی غلط فہمیوں کا تذکرہ بھی اس مضمون کا حصہ ہے۔

مسلم اور مغربی دنیا کے تعلقات میں کسی نہ کسی قسم کی بے وقعتی پائی جاتی ہے۔ بدگمانی اور خوف کی زہریلی سڑانڈ پھیل چکی ہے۔ بنیادی طور پر بے چینی تشدد کے معاملہ سے منسلک ہے۔ تشدد جو ماضی سے لے کر اب تک جاری ہے اور اپنی پوری آب و تاب سے غیرت کے نام پر قتل، خودکش حملوں، صلیبی جنگوں، نوآبادیات، طالبان، ابوغریب، شریعہ، سکارف، فرانس میں نوجوانوں کے ہنگاموں، جہاد، اسرائیل، پیغمبر کی توہین اور آزادی اظہار جیسے مسائل کی شکل میں موجود ہے۔ آج کی دنیا کتنی الجھنوں سے بھرپور ہے!

یورپ، مغرب اور عالم مسیحیت، بالکل اسی طرح ہم معنی الفاظ بن چکے ہیں جس طرح مشرق وسطیٰ، اسلامی دنیا اور فی نفسہ اسلام کو ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ نظریہ اور عمل، بے آمیزش نظام عقائد اور آلودہ عمل بڑی بے فکری سے باہم گڈمڈ کر دیئے جاتے ہیں۔ سیاسی تنازعات ثقافتی ٹکراؤ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ثقافتی ٹکراؤ سیاسی تنازعات کی شکل اپنا لیتے ہیں۔

اکثر اوقات قائم شدہ خیالات بھی اتنا ہی اثر انداز ہوتے ہیں جتنا کہ حقائق۔ تاہم موجودہ کشمکش کے حوالے سے صریح حقائق بہت حد تک حوصلہ شکن ہیں۔ ایک وقت تھا کہ جب 'اسلام' اور 'مغرب' کے درمیان واضح امتیاز ممکن تھا۔ مگر یہ فرق اب موجود نہیں رہا۔ سرحدیں مٹ رہی ہیں لاکھوں مسلمان مرد اور عورتیں مغرب میں قیام پذیر ہیں اور بہت سے مسلمان مغربی ممالک کی شہریت اختیار کر چکے ہیں۔ لہٰذا اب وہ مغرب کا اٹوٹ حصہ ہیں۔

تنازعات حقیقی ھیں

اسلامی دنیا کے برعکس مغرب نے اپنے سیاستدانوں، جرنیلوں، اپنی مادہ پرستی، ٹیکنالوجی کی ترقی، ذرائع ابلاغ اور تنظیمی اصول وضوابط کے ذریعے اسلامی دنیا پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہ سب ایسے لوازم ہیں جن سے صرف دنیا سے کنارہ کش لوگ ہی مکمل طور پر دور رہ سکتے ہیں۔ ماضی میں رونما ہونے والے حالات وواقعات کے نتیجے میں پیدا شدہ تنازعات بہت حقیقی ہیں۔

تاہم، استدلال کو عیسائی میراث اور اپنے آپ کی روشن خیالی کے واحد وارث خیال کرنے کے موجودہ یورپی رجحان کے تناظر میں، یورپ کے شہریوں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اس وقت استدلال کا دامن سے ہاتھ سے چھوڑ دیں جب اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے تعلقات زیر بحث ہوں۔ آیئے مذہب سے بات کا آغاز کرتے ہیں خاص طور پر جرمنی کے لوگ یہودی ونصرانی (عقلی) روایت کو یورپی شناخت اور کلچر کا لازمی اور بنیادی حصہ سمجھنے کے عادی ہیں۔ تاہم حقائق متنازعہ فیہ اور غیر واضح بھی ہو سکتے ہیں۔ ایسی علمی روایات کے ضمن میں اسلام کو (برائے نام) ذکر کا بھی حقدار نہیں سمجھا جاتا۔ فاضل مؤرخین زیادہ سے زیادہ سپین کے اسلامی دور کا سرسری حوالہ کر دیتے ہیں، جہاں مسلمان اور یہودی علماء نے یونانی کلاسیکی ادب کے ترجے کر کے عیسائی مغرب کو ارسال کیے۔ یہودی اور مسلمان علماء کے اس کارنامے کی وجہ سے یورپ کے ثقافتی ورثے میں انہیں ایک مناسب مقام دیا جاتا ہے، مگر یہ مقام انہیں مفکرین کی بجائے محض پیغام رساں کی حیثیت سے دیا جاتا ہے۔ تاہم مذہبی تناظر میں ان کی اس شناخت کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔

کئی صدیوں سے عیسائی حضرت محمد ﷺ کو ایک جھوٹا پیغمبر (نعوذ باللہ) سمجھتے رہے، حتیٰ کہ آج بھی غالباً چند عیسائی ہی آپ ﷺ کو سچا پیغمبر سمجھتے ہیں۔ یہودیت اور

عیسائیت کے لیے اسلام کا رویہ بالکل مختلف ہے۔ اسلام صریحاً اپنے آپ کو اسی توحیدی روایت سے منسلک کرتا ہے جس کو اس کے دوساتھی الہامی مذہب بھی مانتے ہیں۔ اسلام ان دو مذاہب، یہودیت اور عیسائیت، سے اپنا تعلق قائم کرتا ہے، ان سے رشتہ استوار کرتا ہے، مگر ساتھ ہی اپنے آپ کو ان سے افضل گردانتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے تورات کے بعد عیسائیوں کے لیے انجیل نازل ہوئی، مسلمانوں کا کلام [قرآن]، وحی کے سلسلہ کے خاتمہ کا دعویٰ کرتا ہے۔ اسلام میں تورات اور انجیل کا احترام کیا جاتا ہے مگر سچا پیغام صرف قرآن پاک میں موجود سمجھا جاتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو اسلام میں پیغمبر تسلیم کیا جاتا ہے، مگر محمد ﷺ ''خاتم الانبیاء'' ہیں۔

صحیح طور پر واضح نہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کی کیا حیثیت ہوتی ہے جب اسلام مؤمنین اور کفار کے درمیان امتیاز قائم کرتا ہے، اگرچہ یہ امتیازات کسی طور پر بھی ان امتیازات سے کم شد و مد سے قائم نہیں کیے جاتے جس شدت سے مغربی دنیا میں یہ یہودیوں اور غیر یہودیوں کے درمیان، یا عیسائیوں اور ملحدین کے درمیان قائم کیے جاتے ہیں۔

قرآن کے چند اقتباسات میں عیسائیوں اور یہودیوں کا بطور اہل کتاب ذکر موجود ہے، مگر قرآن میں چند دوسرے مقامات پر انہیں ایسے منکرین کی صف میں کھڑا کیا گیا ہے جن کے ساتھ مسلمانوں کو ہر دستیاب ذرائع کی مدد سے جنگ کرنی چاہیے۔ علم الٰہیات میں یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے، کیونکہ قرآن پاک کی تعلیمات اور مسلمان علماء کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ماننا (مسلمانوں کی نظر میں) کافی حد تک کثیر خداؤں کی پرستش یعنی شرک کے قریب لے آتا ہے، کیونکہ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ عیسائی ایک خدا کی عبادت نہیں کرتے۔ بہت سے دوسرے پہلوؤں کی طرح یہ نکتہ اس ضرورت کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے کہ کس حد تک قرآن تعبیر کا متقاضی ہے اور اس کی تعبیر کی ضرورت موجود رہی ہے۔ قرآن خدا کا ایک ایسا پیغام ہے کہ جس میں مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق تحریف نہیں ہوئی اور ایسے لوگ (کثیر تعداد میں موجود ہیں جو) اس کے لفظی مفہوم پر اصرار کرتے ہیں۔

قرآن پاک کی تعبیر وغیرہ کے بارے میں باتیں بنیاد پرستوں کو لازماً برہم کرتی ہیں جو صحیفے کی لفظی تعبیر پر بضد ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ اس [قرآن کے لفظ بہ لفظ] پر عمل بغیر کسی چوں چراں کے کیا جانا چاہیے۔ اس کے باوجود بھی قرآن کی تعبیر پر اصرار درست ہے اور سوچ بچار کرنے والے مسلمان ہمیشہ سے اس ضرورت کو تسلیم کرتے رہے ہیں۔

حقیقت پسندانہ رواداری

عملی طور پر صورتحال کافی حد تک تسلی بخش رہی ہے۔ یہودی اور عیسائی شہریوں کو (جو مسلمانوں کے علاقوں میں قیام پذیر تھے) مسلمان حکام کی طرف سے تحفظ حاصل تھا کیونکہ بہرحال وہ بھی وحی کے حامل تھے اور مسلمانوں کی طرح ایک خدا کو مانتے تھے۔ مسلمانوں نے یہ تحفظ اپنے اس مذہبی عقیدے کے باوجود فراہم کیا کہ یہودی اور عیسائی دینی کتب میں تحریف واقع ہو چکی ہے۔ لہٰذا ''ذمی'' کی اصطلاح کے ذریعے یہ خاص رعایت ان یہودیوں اور عیسائیوں کو حاصل تھی جو اسلامی حکومت کی عملداری میں رہتے تھے۔ یہ ایک استثنائی رعایت تھی جو ان کافروں کو، مسلمانوں کے جانی دشمن، سے الگ شناخت کرنے کے لیے استعمال کی گئی۔ جزیہ کی متعین رقم کی ادائیگی کے عوض ان کی آزادی کی ضمانت دی گئی تھی اور اس بنا پر انہیں جسمانی تشدد سے تحفظ حاصل تھا۔

جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا میں مسلمانوں کی فتوحات کے عرصہ کے دوران ہندوؤں اور بدھ مت کے پیروکاروں کو ذمیوں جیسی حیثیت دی گئی تھی، اگرچہ ان مذاہب کے لوگ بمشکل ہی توحید پر عقیدہ رکھتے تھے۔ مسلمان تمام دوسری قوموں کی طرح مذہبی اور سیاسی ضرورت کے درمیان فرق کیا کرتے تھے۔ جب مسلمانوں کی فتوحات کے نتیجہ میں اسلامی سلطنت میں وسعت پیدا ہو رہی تھی تو مسلمانوں نے اپنی تاریخ سے حاصل شدہ عملی سبق کو یاد رکھا اور تحمل کا مظاہرہ کیا۔

تمام غیر ملکی حملوں کی طرح مسلمانوں کی حاصل کردہ فتوحات میں بھی تشدد کا عنصر یا کم از کم اس کا ڈراوا شامل ہوتا تھا، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو آج کے دور کے بہت سے مسلمان تسلیم کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ مغرب کی گزشتہ نوآبادیاتی غالب قوتوں کی طرح مسلمان ترجیح دیتے ہیں کہ ان کے (ماضی کے) کردار کو انسان دوستی کے زمرے میں ظاہر کیا جائے حالانکہ حملے اور قبضے کے پس پردہ ہمیشہ مقصد یہ کارفرما ہوتا تھا کہ دوسروں کو اپنی تہذیب وثقافت کے مطابق ڈھال دیا جائے۔ تاہم اصولی طور پر تسلیم کرنا چاہیے کہ مسلم فاتحین نے اپنی رعایا کو اسلام قبول کرنے پر کبھی مجبور نہیں کیا۔ اسلام کی طرف جبری تبدیلی کے بارے میں اکثر علماء کا خیال ہے کہ قرآن پاک میں صریحاً ایسا کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ ''مذہب میں کوئی جبر نہیں'' (سورہ بقرۃ، آیت ۲۵۶)

تصویرِ حالات حوصلہ افزا نہیں

مذکورہ حالات میں برداشت مذہبی رواداری کی صورت اختیار کر گئی مگر یہ رواداری اس حد تک نہ پہنچ سکی کہ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کو مذہبی لحاظ سے برابر مان لیا جاتا یا یہ تسلیم کر لیا جاتا کہ وہ بھی انہی حقوق کے مستحق ہیں جو خود انہیں حاصل ہیں۔ مگر یہ رویہ یورپ میں بھی انیسویں صدی تک برقرار رہا۔ قانون کے ذریعے مذہبی اقلیتوں کے لیے مساوی حقوق کی فراہمی نسبتاً موجودہ دور کا تصور ہے۔ یورپ کو مجموعی طور پر اس تصور کو عملی جامہ پہناتے ہوئے متعدد مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔

اگر برداشت، مذہبی رواداری کے مفہوم میں ایک قسم کا خصوصی معیار ہے تو اسلام نے جو تاثر اس ضمن میں قائم کیا ہے مسیحی تاریخ سے کافی بہتر ہے۔ اگرچہ یہ تاثر بھی کوئی زیادہ اچھا نہیں۔ یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے دور میں شاندار ثقافتی کامیابیاں ضرور حاصل ہوئی ہوں گی، مگر یہ ثقافتی کامیابیاں ہرگز ایک جیسی خوش آئند نہ تھیں حتیٰ کہ اسلامی سپین میں بھی جسے ماضی کے ایک ایسے ''سنہری دور'' کے طور پر یاد کیا جاتا ہے جہاں مسلمان، عیسائی اور یہودی بقائے باہمی کے ساتھ رہتے تھے۔

اسلامی دور حکومت میں بھی دوسرے مذاہب کے چند پیروکاروں کو ایذا دی گئی، مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا گیا یا اجتماعی قتل عام کا نشانہ بنایا گیا۔ تاہم ایسے واقعات استثنائی تھے، حالانکہ مذہب کی طرف سے کسی اصول کے تحت ان کا کوئی جواز نہیں تھا۔ یورپ کے ساتھ کوئی بھی موازنہ کرنے کے نتیجے میں، چاہے یہ موازنہ قرون وسطیٰ سے کیا جائے کہ جب عیسائی غلبہ میں تھے، رومی کلیسا کی بدعنوانیوں کی اصلاح کے لیے اٹھنے والی اصلاحی تحریک Reformation کے دور سے موازنہ کیا جائے یا مرکزی مطلق العنانیت کے دور سے موازنہ کیا جائے، اس موازنہ کے نتیجے میں ''اسلام'' ہی ایک واضح اخلاقی فاتح کے طور پر نمودار ہوتا ہے۔

موجودہ صورت حال مختلف ہے۔ چند استثنائی واقعات کو چھوڑ کر مذہبی برداشت کا مظاہرہ اب بھی زیادہ تر اسلامی ممالک میں کیا جاتا ہے۔ تاہم اس دور میں مذہبی رواداری کی صورتحال تسلی بخش نہیں ہے۔ مذہبی اقلیتوں کو برابر قانونی حقوق یا وسیع تر مفہوم میں مذہبی آزادی دینے کے مطالبات دیگر حلقوں سے آنے کے ساتھ خاص طور پر مغرب کی طرف سے بھی لائے جاتے ہیں۔ خاص طور پر اسلامی معاشروں میں قرآن پاک سے ماخوذ مذہبی اور قانونی تصورات نافذ ہیں۔ نتیجتاً غیر مسلموں کو زندگی کے چند شعبوں میں مساوی حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ انہیں اپنے گرجوں، خانقاہوں، یہودیوں کے عبادت خانوں اور مندروں کا انتظام کرنے اور ان کی تعمیر نو سے روکا جاتا ہے۔ انہیں اپنے مذہب کی اشاعت کرنے کی بھی آزادی نہیں دی جاتی اور کبھی کبھار انہیں بعض تقریبات اور دفتروں میں جانے سے بھی روکا جاتا ہے۔

ایسے واقعات نہ صرف سعودی عرب جیسے ممالک میں ہوتے ہیں جہاں شریعت کے قوانین نافذ ہیں اور حکام دوسرے مذاہب کی پیروی سے روکتے ہیں بلکہ یہ واقعات ترکی جیسے ملک میں بھی ہوتے ہیں جو ایک سیکولر ملک ہونے کا دعویدار ہے۔ ایسا اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اکثر اوقات اصطلاح ''ترک شہری'' کو ''(سنی) مسلمان'' کے مترادف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس قسم کی چیزیں مذہب کو سیاسی رنگ دیتی ہیں۔ اس فعل کو ترکی سے باہر دوسرے ممالک کے مسلمان رد کرتے ہیں۔

اکثر ملحدین اور موجودات کے علم کے علاوہ کسی اور حسی علم مثلاً خدا کے وجود کا انکار کرنے والے لوگ کھلے عام اپنے اعتقادات اور خیالات کا اظہار نہیں کر سکتے۔ کئی مسلمان ممالک میں دوسرے مذاہب کو قبول کرنے والے مسلمانوں پر قانونی دفعات (ارتداد) کا اطلاق کر دیا جاتا ہے۔ چند ایک ممالک میں (تبدیلی مذہب کو روکنے کے لیے) موت کی سزا دی جاتی ہے، مگر دیوانی قانون کے تحت دی جانے والی سزائیں بھی اکثر بہت سخت ہوتی ہیں۔

مذہبی فرقے مثلاً علوی، کئی صدیوں سے اپنے مسلک پر کاربند ہیں، یا احمدی تحریک اور بہائی فرقہ، جس نے اسلامی برادری سے اپنا تعلق ۱۹ویں صدی میں ختم کر لیا تھا کئی اسلامی معاشروں میں امتیاز یا سنگین ایذا رسانی کا شکار ہیں۔ اس طرح کے واقعات سے مسلمان اور مغربی دنیا کے درمیان تعلقات مزید کشیدہ ہو جاتے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب مذہبی آزادی کو کسی روشن خیال معاشرے کا بنیادی جزء سمجھتا ہے۔

مسلمان دنیا نے کبھی بھی مغربی طرز کی روشن خیالی نہیں اپنائی حالانکہ روشن خیالی کے نفاذ سے جمہوریت، قانون کی حکمرانی، انسانی حقوق کے احترام کی لازمی ضمانت نہیں

> اسلامی دور حکومت میں بھی دوسرے مذاہب کے چند پیروکاروں کو ایذا دی گئی، مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا گیا یا اجتماعی قتل عام کا نشانہ بنایا گیا۔ تاہم ایسے واقعات استثنائی تھے اور مذہب کی طرف سے کسی اصول کے تحت ان کا کوئی جواز نہیں تھا۔

ملتی جیسا کہ یورپ کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے، مگر پھر بھی روشن خیالی کا نفاذ کرنے پر زور نہیں دیا جاتا۔ روشن خیالی کسی قوم کی طرف سے اپنے مذہب (نہ کہ کسی قوم کا یہ دعویٰ کہ اس کا مخصوص مذہب ہی مطلق سچائی ہے) اور اپنی تاریخ کو افضل قرار دینے کے جواب میں دانشمندانہ رویے کا لازمی مطلوب جزء ہے۔ اکثر مسلمان غیر جانبدار تجزیہ نہیں کر پاتے، جب ان کی ثقافت اور ورثہ زیر بحث آ رہے ہوں۔ تاہم روشن خیالی کا ان کے اندر سے ظہور ہونا چاہئے اور اس کے مخصوص خدوخال سامنے آنے چاہئیں۔

اصلاح کی تحریک کے علمبردار

یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسلمان اصلاح کار، مارٹن لوتھر کے جذبہ سے اصلاح کی تحریک نہیں چلا سکتے کیونکہ اسلام میں مذہبی پیشوائی کے ایسے سلسلہ وار مدارج نہیں ہیں جن کے پاس گناہ سے توبہ کے بعد دنیوی سزا کی معافی کے اختیارات ہوں۔ اسلام میں اصطباغ، توثیق، عشائے ربانی، استغفار، مسح بالزیت، عطائے منصب اور مناکحت جیسی مقدس رسومات نہیں ہیں اور نہ مذہبی پیشواؤں کے تقرر کا کوئی باقاعدہ سلسلہ ہے۔ ''عام اشخاص'' کو مقدس صحیفوں کی تلاوت ممنوع نہیں۔ عرصہ پہلے قرآن پاک کے تراجم کو ناجائز سمجھا جاتا تھا مگر اب ایک لچکدار رویہ پایا جاتا ہے۔ مسلمان اب تراجم سے استفادہ کر سکتے ہیں، جن کو محتاط انداز سے قرآن کی ''تفاسیر'' سے موسوم کیا جاتا ہے، مگر اصل عربی صحیفہ کی تلاوت عبادت وغیرہ کے وقت ضروری ہوتی ہے۔

ایران اصلاح کی تحریک کا سب سے زیادہ ممکنہ علمبردار ہے۔ ۱۹۷۹ء کے اسلامی انقلاب سے شیعہ مذہبی پیشواؤں نے سیاسی قیادت پر اپنی بالادستی قائم کی ہے۔ سیاسی قیادت پر مذہبی پیشواؤں کی یہ بالادستی شیعہ کی اپنی صفوں میں متنازعہ فیہ ہونے کے ساتھ، مسلم دنیا کی سنی اکثریت کی نظروں میں بھی واضح طور پر غیر اسلامی ہونے کی بناء پر رد کردی گئی ہے۔ سنیوں کے نزدیک حکمران مذہبی گروہ نامی کسی چیز کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ (اس بنا پر) مسلمان جدید دنیا کا حصہ بننا چاہتے ہیں مگر ان سے اپنے اندر اصلاح کی تحریک شروع کرنے اور روشن خیالی اپنانے کا تقاضا کرنا ہی بے معنی اور سعی لاحاصل ہے۔ اسی طرح دیدہ ودانستہ اشتعال انگیزی کی مہمات بھی بے نتیجہ ثابت ہوئی ہیں مثلاً جسے توہے، پیغمبر، کہا جاتا ہے پیغمبر کے خاکوں کی سادہ اشاعت کے عمل سے آگے کچھ نہیں۔ لوگوں کے عام عقیدے کے برعکس، ایسے نقوش اسلامی آرٹ میں موجود ہیں۔

(مسلمانوں کی حساسیت کے) اس خاص زخم کو کریدے بغیر آزادی اظہار، فنی آزادی اور آزادی دانش جیسے حقوق کا تحفظ اور دفاع یقینی طور پر ممکن ہے۔ اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ جوشیلے متشدد مجنونوں کے آگے ہتھیار ڈالے جا رہے ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی احساسات کو مناسب اور جائز تکریم دی جا رہی ہے۔ پیغمبر کی توہین اسلام کو اپنا ناقدانہ اور روشن خیال جائزہ لینے کے لیے آمادہ کرنے میں بالکل کارآمد نہ ہوگی۔ بلکہ اس کا اثر بالکل الٹ ہوگا۔

ایک دھماکہ خیز موضوع

یہ کوئی اتفاق نہیں کہ (مسلمانوں کے اندر) اصلاح پسند اور لبرل حلقے اکثر اپنے آپ کو امریکہ، اسرائیل، حتیٰ کہ یورپی پالیسیوں کے نہایت پرجوش ناقدین کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اسلام کے بارے میں موجودہ سوچ کی وجہ بہرحال یہ ہے کہ مسلمان اور مغربی دنیا کے درمیان سیاسی طاقت کا توازن موجود نہیں۔ یہ نقطہ ہماری توجہ ایک اہم مسئلہ کی طرف مبذول کراتا ہے جو اپنے تاریخی تناظر کی روشنی میں غور کا متقاضی ہے۔

آج اسلام کے مغرب کے ساتھ تعلقات ایک ایسا دھماکہ خیز موضوع ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ معاملات کبھی اس کے برخلاف نہیں رہے۔ درحقیقت دور جدید تک مغرب اسلامی دنیا کے لیے کبھی اتنا بڑا حوالہ نہیں رہا۔ اسلام مشرق وسطیٰ میں پھلا پھولا جہاں یہودیوں عیسائیوں اور زرتشت مذہب کے ماننے والوں کے ساتھ اختلاف چلتا رہا اور یہ مذاہب کبھی بھی مغرب یا یورپ کی نمائندگی نہیں کرتے تھے۔

اسلام کا بطور دین، آرٹ اور تہذیب کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو ان مذاہب کے ساتھ اشتراک عمل کو ملحوظ رکھے بغیر قابل فہم ہو، چاہے یہ تفسیر الٰہیات، قانون وفقہ، تصوف، ادب، موسیقی، تعمیرات یا سیاسی نظریہ کے کسی شعبہ سے متعلق ہو۔ تاہم آج مسلمانوں کے لیے یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ اسلامی تہذیب بہت سے متنوع اثرات کا مجموعہ ہے، کیونکہ اسلامسٹ راہنما یہ نقطہ نظر پیش کرتے ہیں کہ اسلام خالصتاً قرآن اور نبی ﷺ کی سنت پر مبنی ہے۔ جدید سیاست دان تمام فریقوں کو اس اختلاط اور باہمی اثرات کے بارے میں متوجہ کرتے رہتے ہیں۔ یہی روابط ہیں جن میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ مذہبی وسیاسی اختلافات کو ہوا دیں۔ مذہبی مباحث نے اب مناظرانہ رخ اختیار کرلیا ہے جن میں دوسرے فریق کو غلط ثابت کر کے خود کو فاتح قرار دیا جاتا ہے۔
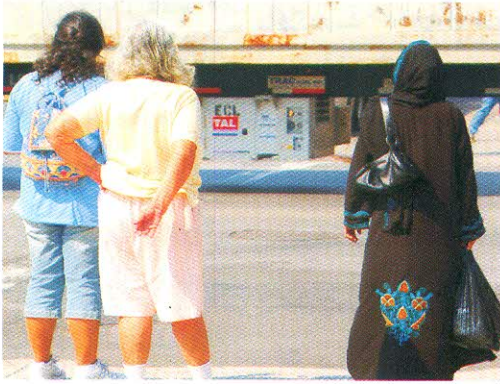
عسکری مہمات کے نتیجے میں مادی کلچر کے عناصر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ بہت سے تعمیراتی شاہکار ماہرین نے بنائے جنہیں قابض افواج نے گرفتار کیا۔ عیسائی بازنطین اور یورپ دو خطے تھے جو اس میں شامل تھے۔ ایران اور وسطی ایشیا صدیوں سے ایک اہم کردار ادا کر رہے ہیں جس طرح کہ انڈیا نے بعض شعبوں میں ادا کیا۔ خلافت بغداد کے لیے سسلی اور آئبیریا کے علاقے یعنی سپین، پرتگال اور جبرالٹر بہت دور کے علاقے تھے۔ اندلس-اسلامی سپین، کی اہمیت اسلامی دنیا کے مقابلہ میں اہل یورپ کے لیے زیادہ تھی، اس حوالے سے کہ ماضی میں امور کیسے تھے اور وہ آئندہ کیسے باقی رہ سکتے تھے۔

صلیبی جنگیں

آج صلیبی جنگیں (اس حوالہ سے) بہت زیادہ زیر بحث ہیں۔ اپنے عہد میں ان جنگوں نے اسلامی دنیا سے زیادہ یورپ کو متاثر کیا، سوائے ان مسلمانوں کے جو جنوبی اناٹولیا، شام اور مصر میں تھے۔ انہی علاقوں میں مسلمان شہزادوں اور علماء نے جہاد کے نام پر لوگوں کو صلیبیوں کے خلاف متحرک کیا۔ یہ ایک مقدس جنگ تھی جو بنیادی طور پر دفاعی تھی۔ تاہم خلافت بغداد نے اس میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ خلیفہ کی نظر مشرق میں ایران اور ازبکستان، تاجکستان اور جنوب مغربی قازقستان کی طرف تھی۔ صلیبی جنگوں نے اسلامی دنیا کو تہہ وبالا نہیں کیا۔ یہ کام تیرھویں اور چودھویں صدی کے منگولوں پر چھوڑ دیا گیا، جنہوں نے چنگیز خان اور تیمور کی قیادت میں یہ کام کیا۔ انہوں نے سمرقند سے بغداد اور دمشق تک تباہی پھیر دی (مغرب کی طرف انہوں نے توجہ نہیں دی)۔

اس کے برخلاف یورپی نوآبادیات کے اثرات گہرے تھے اور شدید بھی اور آج بھی موجود ہیں۔ یورپ کی نوآبادیاتی قوتوں نے اسلامی دنیا کو فتح کرنے کا کام اٹھارہویں صدی میں شروع کیا۔ انہوں نے انڈیا اور انڈونیشیا کو بھی زیرنگیں کیا۔

انیسویں صدی میں وہ خلافت عثمانیہ کے زیر کنٹرول عرب علاقوں تک بھی پہنچ گئے۔ عرب دنیا اور ایران دونوں میں نوآبادیاتی دور ماضی قریب کا حصہ ہے۔ یورپ کا نوآبادیاتی تسلط پہلی جنگ عظیم کے بعد اپنی انتہا کو پہنچا جب اس نے سابقہ خلافت عثمانیہ میں محفوظ پناہ گاہیں قائم کرلیں۔

جرمنی اسلامی دنیا کے لیے آبادیاتی قوت نہیں لیکن فرانس مغرب، شام اور لبنان میں، برطانیہ مصر، فلسطین، عراق، انڈیا اور ملائیشیا میں، اٹلی لیبیا پر اور سپین مراکش اور موریطانیہ پر، ہالینڈ انڈونیشیا پر قابض تھے۔ ترکی واحد ملک تھا جس نے جنگ کے بعد آزادی حاصل کی۔ تمام عملی حوالوں سے ایران غیر ملکی تسلط میں تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد نوآبادیاتی دور کے خاتمے کا اعلان ہوا۔ انڈیا ۱۹۴۷ء، الجیریا ۱۹۶۲ء، اور قدیم Trucial State (موجودہ متحدہ عرب امارات) ایک عشرے کے بعد آزاد ہوئے۔ واقعاتی ترتیب سے دیکھیے تو نوآبادیاتی دور اپنے شکار سے زیادہ دور دکھائی دیتا ہے نسبتاً ان علاقوں کے جو جرمنی کے قریب تھے۔

آج نوآبادیاتی دور کے اثرات متنوع ہیں۔ نوآبادیت مغربی پالیسیوں کے بنیادی تصورات پر اثر ڈالتی ہے، خاص طور پر اسرائیلی اور یورپی اقلیتوں کے تحفظ کے حوالے سے۔ یہ ایسا حق ہے جس پر یورپی قوتیں روایتی طور پر یہ دعویٰ رکھتی ہیں۔ اس کے ساتھ یہ ان قریبی تعلقات کی بنیادیں استوار کرنے کے لیے بھی اہم ہیں جو ترک وطن کے طریقے طے کرنے میں بنیاد ہیں۔ اس طرح سٹریٹجک اور سیاسی تعلقات اور کلچرل تبادلے کے فروغ کے لیے بھی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ اس کی واضح مثالیں ہیں۔

آج مغربی اور اسلامی دنیا ماضی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ باہم مربوط ہیں۔ یہ قرب جہاں یکسانیت کو نمایاں کرتا ہے وہاں فرق کو بھی واضح کرتا ہے۔ عیسائی خدا کے بارے میں ایک ہندو کی نسبت مسلمانوں سے بہتر طور پر مکالمہ کر سکتے ہیں۔ اس طرح مسلمان عیسائی اور یہودی ایک مشترکہ ورثہ تشکیل دے سکتے ہیں۔ ایک مشترکہ تناظر سامنے لاسکتے ہیں جو اصولی طور پر اقدار سے متعلق بحث کو آسان بنا سکتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسانی حقوق کا تصور سب سے پہلے یورپ اور امریکا میں پروان چڑھا جہاں کا غالب مذہب عیسائیت ہے۔ تاہم جو اصول سامنے آئے ہیں وہ اپنی اصل میں عالمگیر بتائے جاتے ہیں۔ انہیں صرف یہودی عیسائی تہذیبی حوالے نہیں سمجھا جاسکتا۔ انسانی حقوق پر مغرب کی اجارہ داری نہیں ہے۔ اس طرح مساوات، انصاف، انسانی وقار، ماحول، تحفظ، غربت اور تشدد کا خاتمہ جیسی اقدار بھی مشترکہ ہیں۔

اب یہ کچھ فیشن سا بن گیا ہے کہ بین المذاہب اور بین الثقافتی مکالمہ کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے اور اسے غیر متعلق قرار دیا جاتا ہے۔ تاہم مکالمہ ایک مفید عمل ہے اگر یہ کسی واضح مقصد کے لیے ہو۔ مکالمہ دوسروں اور ''خود'' کو قریب لانے میں معاون ہوتا ہے۔ اس سے اسلام، اسلام ازم اور اسلام کے نام پر روا رکھے جانے والے تشدد کے فرق کو سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ مکالمہ مغرب کے لیے داخلی سطح پر فرق کو سمجھنے کے لیے بھی مفید ہوسکتا ہے۔ اس کا سب سے بہتر نتیجہ یہ سامنے آسکتا ہے کہ اس سے اسلامی دہشت گردی کے خطرے کو کم کیا جاسکتا ہے۔ تاہم یہ یقیناً مشرق وسطیٰ میں نیوکلیئر ہتھیاروں کو نہیں روک سکتا، ترک وطن کی پالیسیوں کو نرم نہیں کرسکتا یا فلسطینی تنازعہ کو حل نہیں کرسکتا ہے۔ تاہم ان میں سے کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو بنیادی طور پر مذہبی ہو۔

> آج صلیبی جنگیں بہت زیادہ زیر بحث ہیں۔ اپنے عہد میں ان جنگوں نے اسلامی دنیا سے زیادہ یورپ کو متاثر کیا، سوائے ان مسلمانوں کے جو جنوبی انڈونیشیا، شام اور مصر میں تھے۔

☆ پروفیسر ڈاکٹر گڈرون کرامر فری یونیورسٹی برلن (جرمنی) اسلامی علوم کی پروفیسر ہیں، اسلامی تاریخ ان کا خصوصی موضوع ہے، اور مصر، انڈونیشیا اور اسلامی ممالک کی متعدد یونیورسٹیوں میں لیکچر دے چکی ہیں۔ حال ہی میں ۲۰۰۲ء میں جرمن زبان میں فلسطین کی تاریخ پر کتاب شائع کی ہے جس میں عثمانی دور سے آج تک کے واقعات کا علمی تجزیہ پیش کیا ہے۔ کتاب بہت مقبول ہوئی ہے۔

ترجمہ: محمد اشرف طارق

مارٹن لوتھر اور میلکم ایکس، مغرب میں عیسائیت اور اسلام کی نمائندہ تاریخ ساز شخصیات (۱۹۶۴ء)

مغرب اور مسلمان — ثقافتی ٹکراؤ؟

جان ایل ایسپوسیٹو

مغربی اخبارات میں شائع ہونے والے حضرت محمد ﷺ کے خاکوں سے ایک ایسے بین الاقوامی تنازعے کا آغاز ہوا، جس کے فوری اور طویل المیعاد خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ یہ متنازعہ خاکے پہلے ڈنمارک اور بعد میں یورپ کے دیگر اخبارات نے شائع کیے، جن کا نشانہ حضرت محمد ﷺ اور اسلام تھے اور ان دونوں کا ربط انتہا پسندی یا پھر دہشت گردی سے قائم کرنا تھا۔ تمام مسلم دنیا میں ہونے والے احتجاج اور مظاہروں کے جواب میں (مغربی) میڈیا نے ان خاکوں کو اظہار رائے کی آزادی کے عنوان سے جائز قرار دیا۔ فرانس کے ''فرانس سوئیر'' اور جرمنی کے ڈائے ویلٹ نے یہاں تک کہا کہ وہ خدا کا عکس بنانے اور مذاہب کی بے حرمتی کا حق رکھتے ہیں۔ (اس تنازعہ کے حوالے سے) یورپ، امریکہ اور لاطینی امریکہ کے میڈیا نے مجھ سے سب سے پہلے یہ سوال پوچھا کہ کیا اسلام مغربی روایات سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا؟ کیا ہم تہذیبی ٹکراؤ کی جانب گامزن ہیں؟ میرا خیال ہے کہ کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے پہلے ہمیں یہ ضرور پوچھنا چاہیے کہ ہم کون سی مغربی جمہوری اور سیکولر اقدار کی بات کر رہے ہیں؟ کیا یہ مغربی سیکولرازم ہے، جو یہ نہیں کہتا کہ تمام مذاہب کے لیے گنجائش فراہم کی جائے اور اعتقاد اور بے اعتقادی کو ایک جیسا تحفظ فراہم کیا جائے؟ کیا یہ مغربی ''سیکولر بنیاد پرستی'' ہے جو مذہب کے خلاف ہے اور ۹ ستمبر کے بعد اسلام دشمن بھی بن گئی ہے؟

آج ہم جو کچھ مشاہدہ کر رہے ہیں، اس کا مغربی جمہوری اقدار سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ مغربی میڈیا کا پھیلایا ہوا تاثر ہے، جو مغرب کو ایک غیر ملکیوں سے نفرت کرنے والا اور اسلام سے خوفزدہ معاشرے کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ ان خاکوں کا مقصد (مسلمانوں کی) قوت برداشت کی آزمائش اور اشتعال ہے۔ ان خاکوں کے ذریعے اسامہ بن لادن اور ابو مصعب الزرقاوی کا مذاق نہیں اڑایا گیا ہے، بلکہ آزادی اظہار کے بناوٹی دکھاوے کے پردے کے پیچھے ان خاکوں کا مقصد مسلمانوں کی انتہائی مقدس علامات اور اقدار کا مذاق اڑانا ہے۔ ایسے واقعات کو سنسنی خیز شہ سرخیوں کے ذریعے پیش کرنا، ان کی رپورٹنگ اور تخلیق، میڈیا کی آمدنی میں اضافے کا باعث بنے

ہمارے ہاں بالعموم یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ اسلام اور مغرب کے بارے میں اہل مغرب یک زباں ہیں اور ان کی رائے منفی ہے۔ یہ مضمون اس تاثر کی نفی کر رہا ہے اور اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مغرب میں اگر ایک طرف رسالت مآب ﷺ کے کارٹون کی اشاعت جیسا مکروہ کام ہو رہا ہے تو دوسری طرف جان ایسپوسیٹو جیسے لوگ بھی موجود ہیں جو حق بات کہنے کی جرأت رکھتے ہیں اور ان اقدامات کی مذمت کرتے ہیں۔

ہیں۔ ڈنمارک میں چھپنے والے خاکوں کی دوبارہ اشاعت کے ذریعے نفع حاصل کرنے کے بارے میں اتنا ہی جوش و خروش پایا گیا، جتنا جوش و خروش حضرت محمد ﷺ کے بارے میں پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں معروف یورپی اخبارات نے ڈمی اخباروں کا کردار ادا کیا۔

مسلمانوں کے جذبات کو کیا چیز تحریک دے رہی ہے؟ مسلمانوں کے حالیہ احتجاج سے ۹ ستمبر کے بعد بعض پنڈتوں کی جانب سے کیے جانے والے اس سوال کو بظاہر تقویت ملتی ہے کہ مسلمان ہم سے کیوں نفرت کرتے ہیں؟ اس سوال کا ایک جواب دیا جاتا ہے اور اس جواب کو ''روایتی دانشمندی'' کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ ''مسلمان ہماری کامیابی، جمہوریت اور آزادی سے متنفر ہیں۔۔۔۔۔۔'' یہ جواب سہل، آسان اور غلط ہے۔ یہ جوابات اس ثقافتی ٹکراؤ کے اہم مسائل کی نشاندہی کرنے میں ناکام رہے ہیں، جو عقیدہ، اسلام میں حضرت محمد ﷺ کے مرکزی کردار اور آپ ﷺ کے اصولی احترام و تعظیم سے متعلق ہیں۔ یہ اہم مسائل واضح طور سے شناخت، احترام یا فقدان احترام اور عوام میں کی جانے والی تذلیل سے متعلق ہیں۔ کیا مغربی مرکزی میڈیا یا نازیوں کے ہاتھوں یہودیوں کے قتل عام (ہالوکاسٹ) اور یہودیوں کے خاکے شائع کر سکتا ہے؟ فرض کیجیے کہ اہم مغربی میڈیا یہودیوں اور ہالوکاسٹ کے خاکے شائع کرنے کی جسارت کرے، تو کیا میڈیا سزا سے بری الذمہ

ہوسکتا ہے؟ فرانس کے ربی اعلیٰ جوزف سترک کے مطابق مذاہب کی تضحیک وتذلیل کرنے اور خاکے بنانے سے مغرب کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ ایمانداری اور احترام کے فقدان کے مظاہر ہیں اور آزادی اظہار ایک ایسا حق نہیں ہے، جس کی حدود مقرر نہ کی گئی ہوں۔ حال ہی میں مکمل کی گئی گیلپ ورلڈ کی رائے

حضرت محمدﷺ اور اسلام کے توہین آمیز خاکے، جن میں محمدﷺ اور اسلام کا ربط دہشت گردی کے ساتھ قائم کرنے کی ناپاک کوشش کی گئی ہے، ان خاکوں نے مسلمانوں کے جذبات مجروح کیے ہیں۔

شماری، جس میں مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک مسلمانوں کا سروے پیش کیا گیا ہے، کروڑوں مسلمانوں کی آوازوں کو سننے کے بعد اسلام سے متعلق اعداد وشمار پر مبنی جوابات ہمیں فراہم کیے گئے ہیں۔ اس اہم اور ابتدائی گیلپ سروے میں حقائق اور بڑے پیمانے پر اثر انداز ہونے والے غم وغصہ کے اسباب کا حقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جب یہ سوال کیا گیا کہ وضاحت کریں کہ عرب/مسلم دنیا کے ساتھ تعلقات میں بہتری لانے کے لیے مغربی معاشرے کس قسم کے اقدامات کرسکتے ہیں؟ تو ایران سے ۴۷ فیصد، سعودی عرب سے ۴۶ فیصد، مصر سے ۴۳ فیصد، ترکی وغیرہ سے ۴۱ فیصد لوگوں کا اکثریتی جواب یہ تھا کہ مغربی معاشرے اسلام کے بارے میں مزید فہم اور احترام کا مظاہرہ کریں، کم تعصب ظاہر کریں اور اسلام کو بدنام نہ کریں۔ اس سروے کے مطابق بڑی تعداد میں مسلمان ٹیکنالوجی کے میدان میں مغرب کی کامیابی، ان کی حریت اور آزادی اظہار کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ مثال کے طور پر اگر آپ کسی نئے ملک کے لیے آئین کا مسودہ تیار کر رہے ہوں اور اگر آپ سے کہا جائے کہ اس آئین میں ایک ایسی دفعہ شامل کریں، جس کی رو سے تمام شہریوں کو آج کے زمانے کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل پر اظہار رائے کی آزادی حاصل ہو، تو مصر سے ۹۴ فیصد، بنگلہ دیش سے ۹۷ فیصد، لبنان وغیرہ سے ۹۸ فیصد غالب اکثریت کا جواب مثبت تھا۔

حضرت محمدﷺ اور اسلام کے توہین آمیز خاکے، جن میں محمدﷺ اور اسلام کا ربط دہشت گردی کے ساتھ قائم کرنے کی ناپاک کوشش کی گئی ہے، ان خاکوں نے مسلمانوں کے جذبات مجروح کیے ہیں۔ اور ان کے ذریعے مسلمانوں کی تکالیف میں اضافہ کیا گیا ہے، ان کی تذلیل کی گئی ہے اور انہیں سماجی طور پر تنہا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ان خاکوں کے نتیجے میں مغرب اور اعتدال پسند مسلمانوں کے درمیان فاصلہ بڑھا ہے اور نادانستہ طور پر یہ ایک ایسی کوشش ہے، جس کے نتیجے میں اعتدال پسند مسلمان انتہا پسندوں کے ہاتھوں میں کھیلنے پر مجبور ہوں گے۔ ان خاکوں سے ان مطلق العنان حکمرانوں کو تقویت ملی ہے، جو یہ الزام لگاتے ہیں کہ جمہوریت مذہب کے خلاف ہے اور جمہوریت اسلام سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی۔

ہماری منزل کیا ہے؟

مسلم دنیا میں امریکی بالادستی کے منصوبوں میں یورپ کی مزید شمولیت کی امریکی خواہش اور اس سلسلے میں یورپ کی بظاہر رضامندی کے نتیجے میں مغرب اس غالب نقطۂ نظر کو کافی حد تک تقویت بخش دے گا اور اکثریت کو اس نقطہ نظر کا قائل کردے گا کہ فی الحقیقت یہ تہذیبوں کا ٹکراؤ اور اسلام کے خلاف ایک صلیبی جنگ ہے، جس کی رہنمائی اسلام سے خوفزدہ مغرب کر رہا ہے۔ گوانتاناموبے میں امریکی تفتیش کاروں کی جانب سے قرآن پاک کی بے حرمتی اور حالیہ متنازعہ خاکے جن کی وجہ سے مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکایا گیا، ان خاکوں کے بارے میں یورپی یونین کی جانب سے ڈنمارک کے ساتھ یکجہتی کے بیہودہ مظاہرے سے متعلق حالیہ انکشافات کے نتیجے میں کئی مسلمانوں اور مغربی لوگوں کو اس بات کا یقین ہوگیا کہ مغرب تہذیبوں کے ٹکراؤ کے نظریے کو تقویت بخش رہا ہے۔ اس نقطۂ نظر کو مزید تقویت میونخ کانفرنس کے دوران رمزفیلڈ کی جانب سے یورپ اور امریکہ کے تذکرہ سے ہوئی ہے۔ رمزفیلڈ کے مطابق یورپ اور امریکہ نہ صرف مشترکہ جنگی مفادات رکھنے والے اتحادی ہیں، بلکہ یہ دونوں طاقتیں ''ایک ایسی کمیونٹی پر مشتمل ہیں جو مشترکہ تاریخ، مشترکہ اقدار اور جمہوریت پر غیر متزلزل یقین رکھتی ہیں'' اور یہ دونوں طاقتیں ''مہذب دنیا'' پر مشتمل ہیں اور انہیں ایک ایسی جنگ کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، جس کا اعلان ایسی قوتوں نے کیا ہے جو ''ایک عالمگیر انتہا پسند اسلامی سلطنت'' قائم کرنا چاہتی ہیں۔
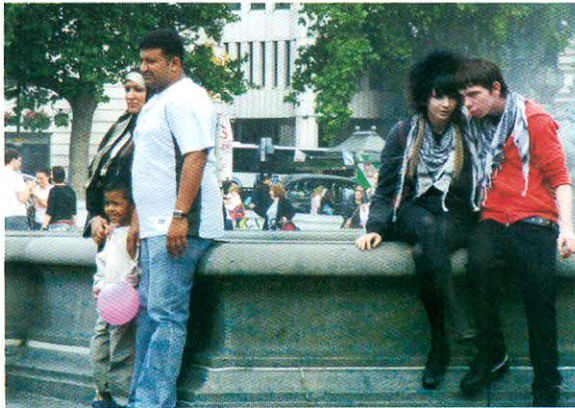
اس تصادم کے بارے میں رمزفیلڈ کی جانب سے عجیب وغریب اور من پسند انداز میں کی گئی تصویرکشی میں مغرب پر تنقید کرنے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی گئی ہے۔ فی الحقیقت میونخ کانفرنس کے موقع پر رمزفیلڈ کی تقریر میں مختلف اسلامی تحریکوں کے مقاصد کے درمیان فرق واضح کرنے کی کوئی کوشش ہمیں نظر نہیں آتی اور نہ ہی اس تقریر میں عراق میں امریکہ کی ناکام پالیسیوں کا کوئی اعتراف نظر آتا ہے اور مسلمانوں کے بہت سے جائز مسائل جن کا مسلمان بار بار ذکر کرتے ہیں، ان مسائل کو پیدا کرنے کے سلسلے میں مغرب نے جو تاریخی کردار ادا کیا، اس تقریر میں

اس تاریخی کردار کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ اس کی بجائے، رمز فیلڈ نے اس تقریر میں مہمل اور اپنی خواہش کی تکمیل کرنے والے اس فرسودہ فقرے کا اعادہ کیا کہ تصادم مسلم دنیا کے اندر موجود ہے اور اس تقریر میں مسلمانوں کی ایک ایسی تصویر کشی کی گئی ہے، جس کے مطابق مسلمان آزادی کے بارے میں خیر سگالی پر مبنی مغربی پیغام کو

> آج ہم جو کچھ مشاہدہ کر رہے ہیں، اس کا مغربی جمہوری اقدار سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ مغربی میڈیا کا پھیلایا ہوا تأثر ہے، جو مغرب کو ایک غیر ملکیوں سے نفرت کرنے والا اور اسلام سے خوفزدہ معاشرے کے طور پر پیش کر رہا ہے۔

ماننے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہے ہیں اور مغرب آزادی کے بارے میں خیر سگالی کے اس پیغام کا پرچار کرنے میں مصروف ہے۔

آزادئ تقریر جیسے اہم اصول اور اقدار پر سمجھوتہ نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم آزادی کا وجود خلا میں نہیں ہوتا اور حدود و قیود کے بغیر آزادی قابل عمل نہیں ہوتی۔ کئی ممالک میں نفرت پر مبنی تقریر (جیسا کہ نازیوں کے ہاتھوں یہودیوں کے قتل عام (ہالوکاسٹ) سے انکار، نسلی منافرت پر اکسانا، نسل کشی کی حمایت کرنا) ایک فوجداری جرم ہے، جو نفرت پر اکسانے سے متعلق قانون کے تحت منع ہے۔ ہماری مغربی سیکولر جمہوریتیں نہ صرف آزادی اظہار کی نمائندگی کرتی ہیں، بلکہ آزادی مذہب کی بھی ترجمانی کرتی ہیں۔ اعتقاد اور بے اعتقادی کو یکساں تحفظ دینے کی ضرورت ہے۔ ایک کثیر المذہبی معاشرے میں آزادی مذہب کے معنی یہ ہونے چاہئیں کہ بعض چیزیں جو مقدس ہوتی ہیں، انہیں مقدس ہی سمجھا جائے۔ اسلام سے خوف جو مغرب میں ایک سماجی ناسور بنتا جا رہا ہے، مغرب جس طرح یہود کی مخالفت برداشت نہیں کرتا، بالکل اسی طرح اسلام سے خوف بھی مغرب میں ناقابل قبول ہونا چاہئے کیونکہ اسلام سے خوف ہماری کثیر الثقافتی جمہوری طرز زندگی کے لیے ایک خطرہ ہے۔ یوں سیاسی و مذہبی رہنماؤں، تبصرہ نگاروں، ماہرین اور میڈیا پر یہ لازم ہے کہ وہ ہماری عمدہ اقدار کو فروغ دینے اور ان کے تحفظ کے سلسلہ میں رہنما کردار ادا کرے۔

مسلمانوں کے ردعمل کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے؟ مسلمان رہنماؤں پر شدید دباؤ ڈالا گیا ہے کہ وہ بحیثیت شہری اپنے عقیدے اور حقوق کا اعلان کرتے ہوئے، اظہار رائے کی آزادی کی پرزور تائید کرتے ہوئے اور تعصب کی آڑ میں آزادئ اظہار رائے کے غلط استعمال کو مسترد کرتے ہوئے، نئے سرے سے بحث کا آغاز کریں۔ اختلاف رائے کی جائز صورتوں اور پرتشدد مظاہروں یا سفارتخانوں پر حملے جس سے صورتحال خراب ہوتی ہے اور جس سے روایتی نظریات کے حامل بعض مغربی لوگوں کو تقویت ملتی ہے، کے درمیان فرق واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ امریکہ اور یورپ سے لے کر مسلم دنیا تک کئی مسلمان رہنما جو عوام کے سامنے، ضبط اور صبر کرنے کی پرزور حمایت کرتے ہیں اور تشدد کی سختی سے مذمت کرتے ہیں، ایسے رہنما ایک اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

عالمگیریت، کثیر الثقافتی اور کثیر المذہبی میدان میں آگے بڑھتا ہوا مغرب ہماری عمدہ جمہوری اقدار کے جوہر کا امتحان لے رہا ہے۔ حالیہ خاکوں کے تنازعے کے نتیجے میں برداشت اور ایسا معاشرتی نظام جس میں مختلف ثقافتی اقلیتوں کو اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کا حق حاصل ہو (pluralism)، کی اہمیت بڑھی ہے۔ غیر مسلموں اور مسلمانوں کی جانب سے یکساں احترام اور عظیم تر باہمی مفاہمت وقت کی اہم ضرورت ہے۔

ترجمہ: سید مراد علی شاہ

یورپ: بوسنیا کے ایک شہر کا خوبصورت منظر
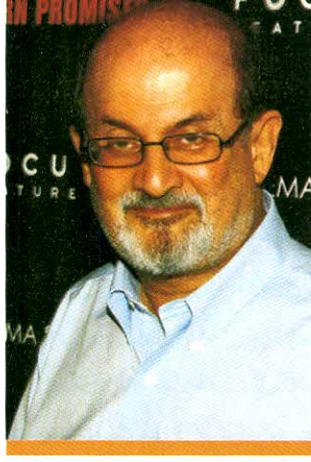
سلمان رشدی کا قصہ

خورشید احمد ندیم

انگریزی ادب کی بے بضاعتی اور انگریز قیادت کی بے بصیرتی کا یہ عالم میرے گمان میں نہیں تھا۔ انگریزی زبان پر اس وقت کا آنا کہ سلمان رشدی جیسا لکھاری اس کے ادب کا ایک بڑا نام قرار پائے، خود اس زبان کے لکھنے والوں کے لیے باعث شرم ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس پر سب سے زیادہ احتجاج خود انگریز ادیبوں کو کرنا چاہیے۔ جب "شیطانی آیات" شائع ہوئی تو ایک انگریز نقاد آبروں واف (Auberon Waugh) نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا Mr Salman Rushdi deserves to be punished for bad English. (رشدی اپنی خراب انگریزی پر سزا کا مستحق ہے)۔ انگریزی کے ممتاز بھارتی لکھاری خوشونت سنگھ نے اس کتاب کے بارے میں لکھا: Even as a novel the Satanic Verses is not readable. (بطور ایک ناول بھی یہ کوئی قابل مطالعہ کتاب نہیں)۔ ایک ہندوستانی صحافی ارن شرما نے لکھا: "Third rate theme by a second rate author". (تیسرے درجے کی تھیم دوسرے درجے کا مصنف)۔ زبان و بیان کے اعتبار سے اس شہرت کا حامل قلم کار اگر انگریزی ادب کا ایک بڑا نام قرار دیا جارہا ہے، تو یہ بات انگریزوں کے لیے باعث ندامت ہونی چاہیے۔ اس واقعے سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ برطانیہ کیوں ایک عالمی قوت کے منصب سے معزول ہوا۔ معلوم ہوتا ہے اس وقت بھی انگریزوں کی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو عالمی حالات سے بے خبر یا اس پست ذہنی سطح کے مالک تھے کہ حالات کا درست تجزیہ نہیں کر سکے۔ آج مغرب میں رہنے والا کوئی شخص جو عالم اسلام اور مغرب میں بہتر تعلقات کا مخلصانہ داعیہ رکھتا ہے، وہ جان بوجھ کر ایسا قدم نہیں اٹھا سکتا، جس سے مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہوتا ہو یا ان کیلیے باعث تکدر ہو۔ تہذیبوں کے درمیان ہم آہنگی کی کوئی کوشش اس وقت تک نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی، جب تک اس کا داعی خود ان تہذیبوں کی مبادیات سے واقف نہ ہو۔ مسلمان معاشرے رسالت مآب ﷺ اور انبیاء کرام کی عزت وحرمت کے بارے میں کیسے حساس ہیں، جو شخص اس سے بے خبر ہے، وہ اس میدان میں پہلا قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ ۱۹۸۹ء میں "شیطانی آیات" کی اشاعت سے لے کر کارٹونوں کے تنازع تک، جو واقعات ہوئے محض ان پر ایک نظر ڈالنے سے ہی یہ جانا جاسکتا ہے کہ آج مغرب اور اسلامی تہذیب میں اقدار کا جو فرق ہے، اس میں ایک طرف انسانی آزادی کی کوئی حد نہیں، حتیٰ کہ وہ چاہے تو پیغمبروں پر بھی سب وشتم کر سکتا ہے اور دوسری طرف یہ جسارت کسی طرح بھی قابل معافی نہیں۔ ٹونی بلیئر یا مغرب میں قیادت

رشدی افیئر

اسلام اور مغرب کے مابین کشیدگی کی تاریخ میں رشدی افیئر کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ رشدی افیئر سے مراد واقعات کا وہ سلسلہ ہے، جو سلمان رشدی کی کتاب دی سیٹانک ورسز (شیطانی آیات) کی اشاعت کے بعد شروع ہوا۔ یہ کتاب ۲۶ رستمبر ۱۹۸۸ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ کتاب میں اسلام کی تاریخ اور مذہب اسلام کی محترم شخصیات کا ذکر توہین آمیز طریقے سے کیا گیا تھا۔ عالم اسلام میں اس کتاب کے خلاف سخت احتجاج نے اشتعالی انداز اختیار کیا اور بہت سے مسلم ممالک میں خود مسلمانوں کی جانیں اس اشتعال کی نذر ہوئیں۔ مسلمانوں کے اس غم وغصے کے برعکس مغرب میں اس کتاب کو بہت پذیرائی ملی۔ اسے انعام دیے گئے اور سرکاری طور پر رشدی اور اس کی کتاب کی حمایت کی گئی۔ واقعات کا یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ حال ہی میں حکومت برطانیہ نے سلمان رشدی کو نائٹ کے خطاب سے نوازا ہے۔ واقعات کی یہ کڑیاں جو اسلام اور مغرب کے مابین منافرت کو بڑھاتی ہیں ''رشدی افیئر'' کے نام سے معروف ہیں۔ رشدی افیئر کے موضوع پر بے شمار کتابیں شائع ہوچکی ہیں، جن میں ان واقعات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے جو کتابیں رشدی افیئر کے عنوان سے لکھی گئی ہیں ان میں مندرجہ ذیل مغربی مصنفین قابل ذکر ہیں: لیزا آبی گانے سی (لندن ۱۹۸۹ء)، اوبیر ریفائیل (پیرس ۱۹۹۰ء)۔

کے منصب پر فائز کسی شخص کے بارے میں یہ باور کرنا مشکل ہے، وہ اس فرق سے واقف نہیں۔ آج مغرب میں بیٹھے کسی آدمی کو مسلمانوں کے ردعمل پر حیرت ہے تو اس کی عقل کا ماتم کرنا چاہیے۔

ہم مسلمانوں کے لیے البتہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر کوئی ہمیں اشتعال دلانے کی کوشش کرے، تو اس پر ہمارا ردعمل کیا ہونا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح کی صورت حال میں ہمیں چند باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں۔

۱۔ جس طرح مغرب کے لیے یہ ضروری ہے کہ مسلمان تہذیب سے مکالمہ کرتے وقت اس کی مبادیات سے واقف ہو، اسی طرح ہمیں بھی یہ جاننا چاہیے کہ مغربی تہذیب کی اساسات کیا ہیں اور مغرب میں جب کوئی آدمی ایک اقدام کرتا ہے تو اسے اس تہذیب کے پس منظر میں سمجھنا چاہیے۔ جناب جاوید احمد غامدی کے نزدیک ان کے اور ہمارے درمیان تہذیبی سطح پر تین بنیادی فرق ہیں: ایک یہ کہ مسلمان تہذیب کی اساس عبودیت ہے اور مغربی تہذیب کی اساس آزادی۔ ہماری تہذیب میں انسان اللہ کا بندہ ہے اور اس اعتبار سے وہ اپنے پروردگار کے احکام کا پابند ہے، مطلق آزاد نہیں۔ مغربی تہذیب انسان کو مطلق آزاد سمجھتی ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ مسلمان تہذیب حفظ مراتب پر کھڑی ہے۔ یہ ماں ہے یہ باپ ہے، یہ میاں ہے یہ بیوی ہے۔ ہر ایک کے حقوق و فرائض اس کے رشتے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ مغرب میں سب برابر ہیں اور کوئی رشتہ کسی کو پابند نہیں کر سکتا۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ مسلمان تہذیب حفظ فروج کے اصول پر قائم ہے۔ جنسی

شیطانی آیات سے قبل سلمان رشدی اپنے متعدد ناولوں میں عالم اسلام کی شخصیات پر طنز وتمسخر کی وجہ سے شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اس کتاب کی اشاعت کے چند ہی روز بعد اکتوبر ۱۹۸۸ میں لندن میں اس کتاب کے خلاف بہت بڑا مظاہرہ ہوا، جس میں ڈیڑھ لاکھ لوگوں نے شرکت کی۔ بعد میں بریڈ فورڈ کے مظاہرے میں کتاب کے نسخے نذر آتش کیے گیے۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد بھارت، پاکستان، مصر اور اسلامی دنیا میں احتجاجوں اور مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ بھارت اور پاکستان میں ان مظاہروں کے دوران بہت سے لوگ زخمی اور شہید ہوئے۔ ۱۴/ فروری ۱۹۸۹ء میں آیت اللہ روح اللہ خمینی نے فتویٰ جاری کیا، جس میں مسلمانوں کو دعوت دی کہ اس کتاب کے مصنف اور ناشر کو موت کی سزا دیں۔ ۱۳/ مارچ ۱۹۸۹ء کو او آئی سی کے وزرائے خارجہ نے ریاض میں ایک اجلاس میں اس کتاب کو توہین آمیز قرار دیا۔ ۳/ جون ۱۹۸۹ء کو حجۃ الاسلام ہاشمی رفسنجانی نے آیت اللہ خمینی کی وفات کے بعد ان کے فتویٰ کی توثیق کر دی۔

عالم اسلام کے ان احتجاجات کے برعکس ۸/ نومبر ۱۹۸۸ کو برطانیہ میں اس کتاب کو وہٹ بریڈ کا انعام دیا گیا۔ برطانیہ کے مسلمانوں نے توہین مذہب کے برطانوی قانون کے تحت سلمان رشدی کو سزا دینے کا مطالبہ کیا تھا، لیکن برطانوی وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر نے اس مطالبے کو رد کر دیا۔ حکومت نے کہا کہ توہین مذہب کا قانون صرف عیسائیت کی توہین پر لاگو ہوتا ہے۔ ۲۲/ جولائی ۱۹۸۹ء کو پیرس کی ایک عدالت نے اس کتاب کے خلاف مسلمانوں کی درخواست مسترد کر دی۔ ۲/ مارچ ۱۹۸۹ء کو اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے بیان دیا کہ تمام مذاہب کا یکساں احترام ضروری ہے، تاہم آزادی رائے کی حرمت کو ترجیح حاصل ہے۔ ۴/ مارچ ۱۹۸۹ء کو روم کے ہولی سی نے ایک بیان میں اس کتاب کے مندرجات کو ''توہین آمیز'' اور ''کفریہ'' قرار دیا گیا، تاہم بیان میں اس پر زور دیا گیا کہ مذہبی شعور کی حرمت اپنی جگہ لیکن اس کتاب کے مصنف کی جان کی حرمت بھی اتنی ہی اہم ہے۔ ۶/ مارچ ۱۹۸۹ء کو جارج بش نے خمینی کے فتوے کی مذمت میں بیان جاری کیا۔ مغربی ممالک کی حکومتوں اور اہم شخصیات نے سلمان رشدی سے ہمدردی اور

تعلقات ایک اخلاقی ضابطے کے پابند ہیں، جس سے ایک خاندان کی بنیاد اٹھتی ہے اور ایک پاکیزہ معاشرت وجود میں آتی ہے۔ اس کے برخلاف مغربی تہذیب میں یہ تعلقات کسی سماجی ضابطے کے پابند نہیں، یہ ایک فرد کا نجی معاملہ ہے۔

ایک تہذیب کے تصورات جب عملی مظاہر کی صورت میں سامنے آتے ہیں تو وہ انسان کے محسوسات کو بدل دیتے ہیں۔ میں نے امریکہ اور برطانیہ میں اپنے مختصر قیام کے دوران میں اس بات کو بہتر طور پر سمجھا۔ اسی حفظ مراتب کے اصول کو دیکھیے: نیو یارک کے ایک بڑے کلیسا میں، میں نے دیکھا کہ وہاں جگہ جگہ فرش پر سیدنا مسیح کا نام (Jesus) لکھا ہوا تھا اور لوگ بے تکلفی سے اس فرش پر چل رہے تھے۔ اسی طرح میں نے سالٹ لیک سٹی میں فٹ پاتھوں پر لکھا دیکھا (In Jesus we Trust) یعنی ہم حضرت مسیح پر ایمان رکھتے ہیں۔ اب کلیسا مسیحی لوگوں کی عبادت گاہ ہے، وہاں سیدنا مسیح کی توہین کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح اگر فٹ پاتھ پر یہ جملہ لکھا گیا تو کسی توہین کے پہلو سے نہیں بلکہ یہ اظہار محبت و عقیدت ہے۔ ہمارے تہذیبی پس منظر میں یہ بات ناقابل تصور کہ کسی پیغمبر کا نام کسی فرش پر لکھا ہو چاہے وہ مسجد ہی کا کیوں نہ ہو۔

۲۔ اخلاقی اور قانونی پہلو سے ہمیں احتجاج کا حق حاصل ہے، تاہم ہمیں اپنی اخلاقی برتری کو ہر صورت برقرار رکھنا چاہیے۔ آج ہماری اسمبلیوں نے قرارداد ہائے مذمت منظور کیں۔ برطانوی سفارت کار کو دفتر خارجہ طلب کر کے اسے اپنے جذبات سے آگاہ کیا گیا۔ اسی طرح ہم

احتجاج کے دیگر راستے بھی اختیار کر سکتے ہیں جن کی اجازت ہمارا قانون اور ہماری دینی تعلیمات دیتی ہیں۔

۳۔ برطانیہ اور مغرب میں اس وقت کروڑوں مسلمان مقیم ہیں۔ ہمیں ان کے مفادات کو بھی مد نظر رکھنا ہوگا اور ایسے اقدامات سے گریز کرنا ہوگا، جن سے ان کے لیے وہاں مذہبی آزادی کے ساتھ زندگی گزارنا مشکل ہو جائے۔

۴۔ ہمیں اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ ایک واقعے پر کمیت کے اعتبار سے کیسا رد عمل ہونا چاہیے۔ اگر معاملہ ایک کتاب کا ہے، تو ہمیں اسی دائرے میں اپنے ردعمل کا اظہار کرنا چاہیے۔ سچ یہ ہے کہ ۱۹۸۹ء میں سلمان رشدی جیسے معمولی لکھاری کو ہمارے غیر معمولی ردعمل نے عالمی شہرت دے دی اور ہمارے بارے میں ایک منفی پروپگنڈے کی بنیاد فراہم کر دی۔ رسالت مآب ﷺ کے بارے میں یہ انسانی نہیں الٰہی فیصلہ ہے کہ ان کا ذکر قیامت کی صبح تک بلند رہے گا۔ اگر ہم سلمان رشدی کا فکری شجرہ نسب تلاش کریں تو یہ سلسلہ صدیوں پر دراز ہے۔ آج آفتاب محمدی اسی آب وتاب کے ساتھ لو دے رہا ہے اور اس آفتاب پر تھوکنے والے اپنا چہرہ خاک آلود کرنے کے بعد تاریخ کی دھول بن چکے ہیں۔ شرق وغرب میں گونجنے والی ایک صدا اشهد ان محمدا رسول الله اس طرح کے کرداروں کو پیغام اجل دیتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ تاریخ کی مسلمہ حقیقتوں کا انکار خود ایک آدمی کو قابل ملامت بنا دیتا ہے۔ میرا تاثر ہے کہ ۱۹۸۹ء میں اگر ہم رشدی کے ساتھ یہی سلوک کرتے، تو آج وہ ایک ناقابل ذکر آدمی ہوتا، جسے سر کا خطاب کیا ملتا، آج لندن کے کسی بار میں بیٹھا گمنامی کی زندگی گزار رہا ہوتا۔

۵۔ اس نوعیت کا واقعہ ہمیں یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ ہم دنیا کو یہ باور کرائیں کہ اسلام اللہ کا آخری دین ہے اور یہی انسانوں کی بھلائی کا ضامن ہے۔ ہم ایک حادثے کو چاہیں تو دعوت کا ایک موقع بنا سکتے ہیں۔ میرے آقا کا اسوہ یہ ہے کہ ان کا ہر فعل اور ہر قدم لوگوں کے دلوں پر اسلام کی دستک تھا۔ اگر کوئی قتل کے ارادے سے بھی آتا تو دل میں ایمان لیے رخصت ہوتا برطانوی حکومت کے ایک اقدام نے ہمارے دل پر زخم لگایا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میرا ردعمل ان دلوں میں محبت رسول کی شمع روشن کر دے، جہاں ابھی تک اندھیرا ہے۔ سلمان رشدی اور برطانوی حکومت کو سزا دینے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا۔

بھی یہی موقف اختیار کیا۔ کفریہ کلمات کے بارے میں رشدی کا موقف یہ تھا کہ وہ کبھی مسلمان نہیں رہا اس لیے ارتداد کا مرتکب نہیں ہوا۔ تاہم ۱۹۹۰ء میں اس نے اسلام قبول کرنے کا دعویٰ کیا اور تھوڑے ہی عرصہ بعد اس نے پھر سے غیر مسلم ہونے پر اصرار کیا۔

رشدی افیئر کے بارے میں عالم اسلام اور مغرب ہی نے نہیں، بلکہ اسلامی ممالک اور مغربی ممالک میں بسنے والے مسلمانوں نے بھی مختلف رویے اختیار کیے۔ ان میں سے بہت سوں نے آیت اللہ خمینی کے فتویٰ سے اختلاف کیا اور آزادی رائے کی حمایت کرتے ہوئے ''شیطانی آیات'' کے خلاف احتجاج کو غیر ضروری قرار دیا۔ عالم اسلام میں اکثر لوگوں نے اس کتاب کو توہین آمیز قرار دیتے ہوئے سلمان رشدی کو واجب القتل قرار دیا۔ تاہم عالم اسلام اور مغربی ممالک میں بعض مسلمان ایسے بھی ہیں، جو سلمان رشدی کی اس کتاب کو توہین آمیز سمجھتے ہیں، تاہم اس کے خلاف احتجاج میں مسلمانوں نے اشتعال کا جو رویہ اختیار کیا اور اس کے نتیجہ میں اپنی ہی املاک اور جانوں کو ضائع کیا، وہ اس پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں اس بات کا افسوس ہے کہ رشدی افیئر کی وجہ سے اسلام اور مغرب کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کو مغربی ممالک مسلسل نظرانداز کر رہے ہیں۔

ادارہ تحریر

مغرب میں اسلاموفوبیا کے خلاف مسلمانوں کا ایک مظاہرہ

مذہبی رہنماؤں پر مشتمل یورپین کونسل کے اجلاس کا اعلامیہ

مذہبی رہنماؤں پر مشتمل مذاہب برائے امن کی یورپین کونسل تاریخ مذاہب سے تعلق رکھنے والے سنیئر مذہبی رہنماؤں پر مشتمل ادارہ ہے جس میں یورپ میں رہنے والے عیسائیت، یہودیت، اسلام، بدھ مت، ہندوازم، سکھ مذہب اور زرتشت مذہب کے ماننے والے شامل ہیں، جنھوں نے یہ ذمہ داری لی ہے کہ وہ مذہبی تنازعات کو روکنے میں تعاون کریں گے، پرامن بقائے باہمی کو فروغ دیں گے اور مصالحتی کردار ادا کریں گے، ECRL ورلڈ کانفرنس برائے امن کا ایک شراکتی ادارہ ہے

ہم تمام مذاہب کے ذمہ دار راہنماؤں سے پرزور اپیل کرتے ہیں کہ وہ موجودہ دور میں ہونے والے تشدد اور دہشت گردی، جو مذہب کے نام پر کیے جا رہے ہیں، کی بھر پور مذمت کریں اور ایسے واقعات کو روکنے کے لیے اپنی تمام کوششیں بروئے کار لائیں ہم اظہار رائے کی آزادی کے ایسے غلط استعمال کی مذمت کرتے ہیں، جس کے ذریعے اس چیز کی توہین کی جاتی ہو جو اہل ایمان کے نزدیک مقدس ہو۔ تمام مذاہب کی اپنی مقدس علامتیں اور عقیدے ہوتے ہیں اور ان کے بارے میں وہ بہت حساس ہوتے ہیں۔ ان احساسات کا تمام لوگوں کو احترام کرنا چاہیے خواہ وہ کسی بھی عقیدے کے ہوں۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے کارٹونز کی اشاعت حد سے زیادہ مشتعل کرنے والا سلسلہ ہے، جو دنیا کی ۱.۳ بلین مسلمان آبادی کے جذبات کی سنگین توہین ہے۔ اس قسم کا اقدام دیگر مذہبی گروہوں کے لیے بھی بہت زیادہ مشتعل کرنے کا باعث بنا ہے۔

ہم جمہوریت اور انسانی حقوق کے لئے اظہار رائے کے حق کو ضروری سمجھتے ہیں اور اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ مذہب کی آزادی کا اظہار رائے کی آزادی پر کلی طور پر انحصار ہے اور اس سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ اگر ایسی آزادی کو، خصوصاً مائل بہ تشدد صورتحال میں، افراد اور جماعتوں پر ممکنہ نقصان دہ اثرات کا لحاظ کیے بغیر استعمال کیا جائے تو ایسی صورت میں ہم اسے آزادی کا ناجائز استعمال تصور کریں گے۔

حالیہ واقعات سے جسے زیادہ تر لوگ توہین آمیز سمجھتے ہیں، ایسے افراد کو جن کا مقصد لوگوں کو مشتعل کرنا ہے یا بات چیت اور تعاون کے امید افزا عمل کو روکنا ہے، فائدہ اٹھانے نہیں دینا چاہیے۔ مذہب کو انتہا پسندوں کے ہاتھوں کسی بھی مذہبی یا سیاسی تحریک کے ذریعے یرغمال بننے نہیں دینا چاہیئے۔ حال ہی میں سفارتخانوں اور گرجا گھر کو آگ لگانے اور فسادات کے دیگر واقعات نہ صرف شہری حقوق کے حوالے سے بلکہ مذہبی نقطہ نظر سے بھی مکمل طور پر ناقابل قبول ہیں۔

اس قسم کے المناک واقعات کو جو متعدد ممالک میں ہو رہے ہیں، صرف اسی صورت میں روکا جا سکتا ہے، جب تمام اہل ایمان، اپنی ثقافت، سماجی و قومی ماحول میں رہتے ہوئے ایک ذمہ دار شہری کے طور پر اپنے ہم عقیدہ گروہ میں قیام امن اور فراہمی انصاف کی پوری ذمہ داری لیں۔ تمام مذاہب میں یہ مشترک اخلاقی فرض موجود ہے کہ ایک شخص کو خدا اور اپنے پڑوسی سے اسی طرح محبت کرنا چاہیئے، جیسا کہ وہ اپنی ذات سے کرتا ہے، اس لیے یہ حکم مشترکہ روحانی میراث ہے کہ دوسرے کے ساتھ اسی طرح کا سلوک کرو جیسا کہ تم دوسرے سے اپنے لیے توقع کرتے ہو۔ یہ مذہبی تحریک پیدا کرنے والے احکام زمانہ کیساتھ روحانی روایات کے احترام کا درس دیتے ہیں اور ان روایات کا تعلق ہمارے زمانہ سے بھی بہت گہرا ہے۔ یہ ہماری معیاری مذہبی، نسلی، سماجی اور ثقافتی حدود کو متعین کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ یہ ہمیں اس بات کی بہت زیادہ ترغیب دیتے ہیں کہ ثقافتوں کے درمیان جو فرق موجود ہے اس کو کیسے ختم کیا جا سکتا ہے خصوصاً ایسے حالات میں جب بہت شدید قسم کی بے چینی پائی جاتی ہو اور ان مسائل پر تنازعہ ہو جن کا تعلق کلی طور پر یا جزوی طور پر مذہب سے ہو۔

ہم تمام حکومتوں سے پرزور طور پر یہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ تمام ایسے افعال اور بیانات سے باز رہیں جو تنازعہ کو مزید بڑھانے کا سبب بنتے ہوں اور پھر مشترکہ عالمی ذمہ داری کے جذبے کے تحت سفارتی طور پر ایسے تنازعات کا حل تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ قانون کی کسی خلاف ورزی کا تصفیہ (عوام کے ذریعے) سڑک کی عدالت میں نہ کروایا جائے بلکہ اس کا تصفیہ ہر ملک کے عدالتی نظام کے اندر رہتے ہوئے اور بین الاقوامی قوانین اور روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے موزوں اتھارٹی کے ذریعہ کروایا جائے۔

ممالک جہاں ذرائع ابلاغ آزاد ہو، ان کی حکومتوں سے توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ میڈیا میں شائع ہونے والے مواد سے متعلق معذرت کریں گے۔ یہ انتہائی افسوسناک صورتحال کثیر المذاہب مفاہمت اور باہمی استحکام کی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔ مذہبی رہنماؤں کی یورپی کونسل اور اس کا عالمی ادارہ برائے مذہبی امن کسی بھی حکومت اور سول سوسائٹی کے ساتھ مل کر کام کرنے کے لیے تیار ہے جو مخلصانہ طور پر انسانی وقار اور انسانی حقوق کو اور مذہبی عقائد و علامات کے احترام کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ ہم اس وقت باہمی مفاہمت اور مصالحت کے فروغ کے لیے باقاعدہ کوشش کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں شراکت اطلاعات، مشورہ اور اپیلوں سے کام لے رہے ہیں۔ ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ہر ایک مذہبی رہنما کا مصالحت کار کے طور پر کردار بہت اہمیت کا حامل ہے اور یہ راہنما دوسری مذہبی جماعتوں کیساتھ اپنی ذمہ داری اور استحکام کا مظاہرہ کرنے کے حوالے سے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اس لیے ایک مذہب پر حملہ تمام مذاہب پر حملہ کے مترادف ہے۔ (اوسلو، ۶ فروری ۲۰۰۶ء)

فقه الاقليات

سفر کی طاقت نہیں رکھتے تھے، مکہ مکرمہ میں باقی رہ گئے تھے۔ دوسرے مکہ سے مدینہ کی ہجرت اہل مدینہ کے ساتھ ایک باقاعدہ معاہدے کے تحت عمل میں آئی تھی۔ جب کہ حبشہ کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے برعکس صلح حدیبیہ (۶۲۸ء) کے معاہدے کی شرائط کے تحت یہ طے پایا تھا کہ اسلام قبول کرنے کے باوجود مکہ سے لوگ مدینہ کی طرف ہجرت نہیں کریں گے۔ اس دور کی خصوصیت یہ تھی کہ ہجرت کے ان تمام واقعات میں مرد اور عورت دونوں شامل تھے۔ اہل مدینہ کے ساتھ بیعت کے جو دو معاہدے ہوئے تھے ان میں بھی خواتین برابر شامل تھیں حتی کہ ان میں سے پہلے معاہدے کا نام بیعت النساء تھا کیونکہ ان میں اہل مدینہ کی طرف سے عورتیں بھی وفد میں شامل تھیں اور سب سے پہلے جس نے بیعت کی وہ حضرت عفرہ تھیں (۱)۔ دوسرے معاہدے میں بھی مدینہ کی جانب سے بیعت کرنے والوں میں ام عمارہؓ اور ام منیعؓ شامل تھیں (۲)۔ ہجرت کے ان معاہدوں نے ولاء یا موالات (وفاداری اور تعلقات) کی ایک نئی شکل مؤاخات کو جنم دیا، جو قدیم قبائلی خونی رشتوں کی بجائے دین کی بنیاد پر استوار ہوئی تھی اور ایسے لوگوں سے قطع تعلق پر مبنی تھی، جو اس دین میں شامل ہونے سے انکار کرتے تھے (القرآن: سورہ انفال: ۷۵)۔

قرآن کریم میں ''ہجرت'' کا لفظ بہت سے مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے، جن میں ''کسی چیز کو ترک کرنا'' (۷۴:۵)، ''چھوڑ دینا'' (۱۹: ۴۶) اور ''نکال دینا'' (۴:۳۴)۔ ان مختلف مفاہیم میں ایک مشترک معنی ہے: کسی چیز خصوصاً برائی سے دور ہو جانا۔ ھاجر (۲:۲۱۸، ۳:۱۹۵، ۹:۵۹) اور مھاجر (۸:۷۲، ۹:۱۰۰، ۱۱۷، ۳۳:۶، ۵۹:۸، ۶۰:۱۰) نقل مکانی کے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ بعض آیات میں ھاجروا وجاھدوا اکٹھے استعمال ہوئے ہیں، جس سے واضح ہوتا ہے کہ ہجرت محض نقل مکانی کا نام نہیں، بلکہ یہ نقل مکانی کسی مقصد کے لیے ہوتی ہے۔ ان تمام آیات کا، جن میں لفظ ہجرت یا اس کے مشتقات استعمال ہوئے ہیں، احاطہ یہاں ممکن نہیں۔ موضوع کے تعلق سے صرف دو آیات کا ذکر کافی ہوگا:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ تَوَفّٰىهُمُ الۡمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ قَالُوۡا فِیۡمَ كُنۡتُمۡ قَالُوۡا كُنَّا مُسۡتَضۡعَفِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ. قَالُوۡۤا اَلَمۡ تَكُنۡ اَرۡضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوۡا فِیۡهَا. فَاُولٰٓئِكَ مَاۡوٰىهُمۡ جَهَنَّمُ. وَسَآءَتۡ مَصِیۡرًا ○ اِلَّا الۡمُسۡتَضۡعَفِیۡنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالۡوِلۡدَانِ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ حِیۡلَةً وَّلَا یَهۡتَدُوۡنَ سَبِیۡلًا ○ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنۡ یَّعۡفُوَ عَنۡهُمۡ. وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوۡرًا ○ وَمَنۡ یُّهَاجِرۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ یَجِدۡ فِی الۡاَرۡضِ مُرٰغَمًا كَثِیۡرًا وَّسَعَةً. وَمَنۡ یَّخۡرُجۡ مِنۡۢ بَیۡتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ ثُمَّ یُدۡرِكۡهُ الۡمَوۡتُ فَقَدۡ وَقَعَ اَجۡرُهٗ عَلَى اللّٰهِ. وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ○﴾ (النسآء: ۹۷-۱۰۰)

(جو لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں تو جب فرشتے ان کی جان قبض کرنے لگتے ہیں تو ان سے پوچھتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے۔ وہ کہتے ہیں ہم ملک میں عاجز و ناتواں تھے۔ فرشتے کہتے ہیں کیا اللہ کی زمین وسیع نہیں تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے۔ ایسے لوگوں کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔ ہاں جو مرد، عورتیں اور بچے بے بس ہیں کہ نہ کوئی چارہ کر سکتے ہیں نہ راستہ جانتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہو سکتا ہے انہیں معاف کر دے۔ اللہ تعالیٰ معاف کرنے اور بخشنے والا ہے۔ جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت کرتا ہے وہ زمین پر بہت سی جگہ کشائش پائے گا۔ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی طرف اپنے گھر سے ہجرت کرتا ہے اور اس کو موت آجائے، تو اس کا ثواب اللہ کے ذمے ہے۔ اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔)

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَهَاجَرُوۡا وَجٰهَدُوۡا بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَالَّذِیۡنَ اٰوَوۡا وَّنَصَرُوۡۤا اُولٰٓئِكَ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ. وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَمۡ یُهَاجِرُوۡا مَا لَكُمۡ مِّنۡ وَّلَایَتِهِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ حَتّٰى یُهَاجِرُوۡا. وَاِنِ اسۡتَنۡصَرُوۡكُمۡ فِی الدِّیۡنِ فَعَلَیۡكُمُ النَّصۡرُ اِلَّا عَلٰى قَوۡمٍۢ بَیۡنَكُمۡ وَبَیۡنَهُمۡ مِّیۡثَاقٌ. وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ﴾ (الانفال: ۷۲)

(جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے کوشش کی، جنہوں نے رہنے کو جگہ دی اور مدد کی وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ جو لوگ ایمان لائے مگر ہجرت نہیں کی تو ان کی تمہارے ساتھ اس وقت تک کوئی دوستی نہیں، جب تک وہ ہجرت نہ کریں۔ اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد طلب کریں تو تم پر ان کی مدد فرض ہے۔ البتہ اگر ان لوگوں کے مقابلہ میں کسی قوم سے تمہارا معاہدہ ہو تو تمہیں ان مسلمانوں کی مدد نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو دیکھ رہا ہے۔)

قرآنی آیات کے مجموعی مطالعہ سے ہجرت کے بارے میں مندرجہ ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

۱- مسلم معاشرت کے ابتدائی دور میں ہجرت یعنی گھر بار چھوڑ کر مدینہ میں آکر بسنا ایک ایسا فریضہ تھا جو اس معاشرت کی تکمیل کے لیے لازمی تھا۔

۲- ہجرت کا جہاد سے گہرا تعلق ہے۔

۳- ہجرت کی بنیاد پر مہاجرین اور انصار کے درمیان ایک نئی قسم کا رشتہ مؤاخات عمل میں آیا، جس کی بنیاد خونی رشتہ کی بجائے دینی رشتہ پر تھی۔

۴- جو مسلمان ہجرت نہ کریں یا نہ کر سکیں تو ان کی مدد مشروط ہوگی۔ اگر ان لوگوں سے جن میں یہ مسلمان رہ رہے ہیں، مسلمانوں کا معاہدہ ہو تو وہ اس معاہدے کی پاسداری کرتے ہوئے، ان مسلمانوں کی مدد سے گریز نہ کریں گے۔

متعدد احادیث میں ہجرت کی اہمیت کا ذکر ہے، مثلاً مسند احمد بن حنبل میں ایک حدیث ہے:

''مجھے اللہ کی طرف سے پانچ احکام کے ساتھ بھیجا گیا ہے سمع (توجہ)، اطاعت، ہجرت، جہاد اور جماعت'' (۳)۔

احادیث میں عموماً قرآنی احکام کی تفصیل دی گئی ہے، تاہم احادیث کے مطالعہ سے ہجرت کا ایک نیا پہلو بھی سامنے آتا ہے۔ کتب احادیث میں **لا ھجرۃ بعد الفتح** (۴) (فتح کے بعد ہجرت فرض نہیں) کے عنوان سے جو روایات درج ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں ہجرت کے احکام ایک خاص وقت سے تعلق رکھتے تھے۔ تاہم ایسی روایات بھی ملتی ہیں، جن کی رو سے ہجرت کی فرضیت کا حکم جاری ہے (۵)۔ روایت احادیث میں اس بظاہر تضاد کی وضاحت میں ماہرین احادیث نے مختلف آراء قائم کی ہیں۔

ابوسلیمان حامد بن محمد الخطابی البستی (م ۹۹۶ء) کا کہنا ہے کہ ابتدائی دور میں ہجرت کا مقصد دارالاسلام مدینہ کو مضبوط کرنا تھا۔ فتح مکہ (۶۳۰ء) کے بعد دارالاسلام مضبوط و مستحکم ہو گیا، اس لیے اب ہجرت کی ضرورت نہیں رہی۔ البتہ اگر آئندہ ایسے ہی حالات پھر سے پیش آئیں تو ہجرت واجب ہو جائے گی (۶)۔ ابن حجر عسقلانی (م ۱۴۴۹ء) نے بہت تفصیل سے اس مسئلہ پر بحث کی اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ حضرت ابن عباس (م ۶۸۷ء) اور ان کے ہم عصر صحابہ اور تابعین کے نزدیک فتح مکہ کے بعد ہجرت واجب نہیں رہی تھی (۷)۔

تاریخ اسلام کے ابتدائی دور میں اسلام، کفر، ایمان اور ہجرت کے بارے میں سیاسی گروہوں نے کئی نئی تعبیریں پیش کیں۔ اس طرح دارالاسلام اور دارالکفر پر کلامی بحثیں شروع ہوئیں، یہ سوال کہ دارالاسلام کب دارالکفر میں تبدیل ہو جاتا ہے اور ان مسلمانوں کے بارے میں کیا حکم ہے، جو دارالکفر سے ہجرت نہیں کرتے، اسی دور میں موضوع بحث بنے۔

سب سے پہلے خوارج نے ان مسائل پر کلامی بحثوں کا آغاز کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اصل میں ساری دنیا دارالکفر ہے۔ جب تک اسلام قائم نہ ہو جائے یہ دارالکفر رہتی ہے۔ دارالاسلام میں حکمران جب اللہ کی حاکمیت قائم نہ کریں یا اس کا انکار کر دیں یا کبیرہ گناہ کا ارتکاب کریں تو حکمران کافر اور ملک دارالکفر ہو جاتا ہے اور ایسے علاقے سے ہجرت واجب ہو جاتی ہے۔ خوارج کے بہت سے فرقوں میں ازارقہ اور صرفیہ اسی اصول کے قائل تھے۔ خوارج عام طور پر اپنے علاقوں کے علاوہ ساری دنیا کو دارالکفر قرار دیتے تھے۔ البتہ خوارج کے ایک فرقہ اباضیہ نے بیچ کی راہ اختیار کی ہے۔ ان کے نزدیک صرف وہ علاقہ، جس کے امیر کے ساتھ ان کی جنگ ہو دارالکفر ہے۔ ان کے نزدیک ہجرت ہر حال میں فرض ہے۔ ہجرت کی استطاعت نہ ہونا ایسا عذر تھا، جسے دور کرنا مسلمان کا فرض تھا۔ خوارج کا ایک اور گروہ عونیہ اس بات کا قائل تھا کہ جب حکمران کفر کا ارتکاب کریں تو اس سے پوری رعایا کافر اور ان کا علاقہ دارالکفر ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ ہجرت اور جہاد کو لازم و ملزوم گردانتے تھے۔ جو لوگ جہاد سے بچنے کے لیے ہجرت کرتے تھے وہ ان سے ترک تعلق لازم قرار دیتے تھے (۸)۔

معتزلہ میں سے امام جبائی (م ۹۱۶ء) کا کہنا تھا کہ جب تک کسی علاقے میں مسلمان کفر اختیار کرنے یا کفریہ اعمال پر مجبور نہ ہوں تو وہ علاقہ دارالایمان ہے اور وہاں سے ہجرت فرض نہیں۔ تاہم ان کی رائے میں بغداد میں ایسی صورت حال نہیں تھی (۹)۔

صوفیاء کے نزدیک ہجرت کے مفہوم میں وسعت تھی۔ احادیث میں برائی سے نمٹنے کے تین درجے بتائے گئے ہیں، اول اگر استطاعت ہو تو ہاتھ سے، دوسرے زبان سے اور تیسرے دل سے (۱۰)۔ پہلے درجے کی آخری شکل جہاد تھی جو فرض کفایہ یعنی اجتماعی ذمہ داری تھی۔ یہ نہ تو انفرادی فریضہ تھا اور نہ ہی ہر فرد پر واجب۔ اس کے لیے اجتماعی تنظیم ضروری تھی۔ دوسرا درجہ دعوت و تبلیغ کا تھا۔ تیسرا درجہ دل میں برا سمجھنے کا تھا۔ صوفیاء کے نزدیک ہجرت کا ایک مفہوم یہ بھی تھا کہ برائی سے دستبردار (ہجرت) ہو جائے۔ ابوالقاسم القشیری (م ۱۰۷۴ء) کے نزدیک ہجرت سے مراد ''نفس کی خواہشات سے الگ ہو کر قربت الٰہی کی چھاؤں کی طرف ہجرت ہے''۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نفس کی خواہشات کی مخالفت کر کے نفس سے
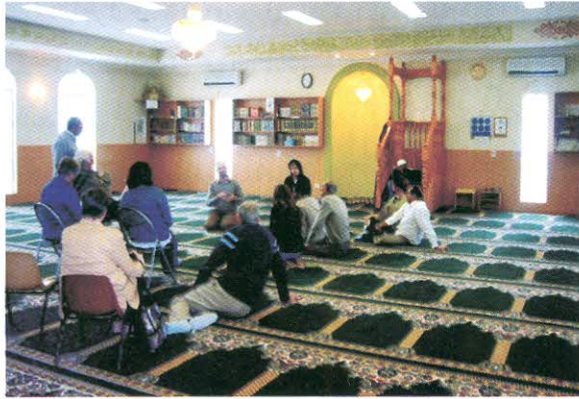
دستبردار ہونے اور پھر حقوق کی دنیا سے رضائے الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کی دنیا میں منتقل ہونے کو ہجرت کہتے ہیں (۱۱)۔ میبذی (م ۱۱۲۵ء) کے نزدیک ہجرت تین طرح کی ہوتی ہے۔ اہل دنیا کی ہجرت جو تجارت اور مالی منفعت کے لیے ہجرت کرتے ہیں۔ دوسرے زاہد کی ہجرت جو آخرت کے لیے ترک دنیا کرتا ہے، تاہم عبادات اور مراقبہ کا اہتمام کرتا ہے۔ تیسرے عارفین کی ہجرت جو نفس کے حجابات سے دل کی طرف اور پھر دل سے روح کی طرف اور بالآخر روح سے محبوب کی طرف ہجرت کرتے ہیں (۱۲)۔ نجم الدین کبری (م ۱۲۲۹ء) کے الفاظ میں ہجرت انسانوں کی زمین سے باری تعالیٰ کے حضور میں حاضری کے سفر کا نام ہے (۱۳)۔

ان مختلف تعبیروں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ تعبیریں اپنے اپنے عہد کے سیاسی حالات کی عکاس ہیں۔ خوارج کے عزائم سیاسی تھے، اس لیے انہوں نے انتہاء پسندی کا انتخاب کیا۔ باقی گروہ میانہ روی کے قائل تھے۔ ان میں سب کے سب حکمرانوں کے حامی نہیں تھے، تاہم ان کے نزدیک اگر حکومت دینی معاملات میں دخل نہیں دیتی تو اس کی مخالفت غیر ضروری ہے۔ صوفیاء نے ہجرت کو باطنی تعبیر دی کیونکہ ان کے نزدیک صالح معاشرے کے لیے فرد کی ذات میں تبدیلی ضروری ہے۔

فقہاء کی تعبیرات

یہی وہ دور تھا، جب فقہاء کا گروہ بھی اپنے طور پر شریعت کی تعبیر کا کام کر رہا تھا۔ ان کے لیے قرآن اور سنت اصلی مصادر کی حیثیت رکھتے تھے۔ قرآن کریم کی آیات کے لیے عہد نبوی اور عہد خلفائے راشدین کا تعامل وضاحت اور بیان کا درجہ رکھتا تھا۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا عہد نبوی میں ہجرت حبشہ، صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے حوالے سے ہجرت کی مختلف تعبیریں موجود ہیں، مکہ اور مدینہ کے مضافات میں بسنے والے بدوؤں کو کہیں ہجرت کا حکم نہیں دیا گیا۔ بقول طبری عہد رسالت میں مسلمان آبادی تین طرح کی تھی: مہاجر، انصار اور اعراب۔ اعراب کی اصطلاح ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتی تھی، جنہوں نے ہجرت نہیں کی تھی۔ اموال غنیمت میں اعراب کا حصہ تھا لیکن باقی اموال میں نہیں (۱۴)۔ تاہم خلفائے راشدین اور بعد کے زمانوں میں یہ تقسیم معدوم ہوتی گئی۔ فقہاء نے احکام ہجرت کو بہتر طریقے سے سمجھنے کے لیے دار الاسلام (اسلام کا علاقہ)، دار الحرب (وہ علاقہ جس سے مسلمان حالت جنگ میں ہیں)، دار الکفر (کفر کا علاقہ) اور دوسری اصطلاحیں وضع کیں۔ امام شافعیؒ (م ۸۲۰ء) نے مسئلہ ہجرت کی تشریح میں ان تاریخی حالات کو پیش نظر رکھا۔ ان کے نزدیک ہجرت ہر مسلمان پر فرض نہیں تھی کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے بدو قبائل کو اجازت دی تھی کہ وہ ہجرت نہ کریں۔ ان کے نزدیک ہجرت اعلان جہاد کے بعد فرض ہوتی ہے اور وہ بھی ان لوگوں پر جو ہجرت اور جہاد کی استطاعت رکھتے ہوں۔ امام شافعی کے نزدیک ایک مسلمان دار الکفر حتی کہ دار الحرب میں رہ سکتا ہے بشرطیکہ اسے اپنے مذہب کی مکمل آزادی ہو (۱۵)۔

امام شافعی کے نزدیک ایک مسلمان دار الکفر حتی کہ دار الحرب میں بھی رہ سکتا ہے بشرطیکہ اسے اپنے مذہب کی مکمل آزادی ہو۔

امام مالکؒ کے نزدیک فتح مکہ کے بعد ہجرت فرض نہیں رہی تھی۔ بعد کے مالکی فقہاء اس مسئلہ کی تفصیلات میں گئے کیونکہ مالکی مذہب یورپ کے ممالک میں پھیل گیا تھا اور وہاں کی سیاسی صورت حال بدلتی رہتی تھی۔ ہسپانیہ زیادہ تر مسلمانوں کے زیر نگین رہا لیکن کئی مرتبہ عیسائی بادشاہ بعض مسلمان علاقوں پر قبضہ کر لیتے تھے، جس کے بعد وہاں کی مسلمان آبادی کے لیے یہ مسئلہ پیش آتا تھا کہ وہ وہیں آباد رہیں یا مسلمان علاقوں کی طرف ہجرت کر لیں۔ مالکی فقیہ المازری (م ۱۱۴۱ء) کا کہنا تھا کہ ایک مسلمان کسی شرعی عذر کے تحت یا تبلیغ اسلام کے ارادے سے دار الکفر میں قیام کر سکتا ہے اور اس کے شرعی حقوق میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ دار الکفر میں اگر غیر مسلم حکمران کسی مسلمان کو قاضی مقرر کر دیں، تو اس کا فیصلہ شرعی طور پر جائز اور نافذ ہوگا (۱۶)۔ ابو الحسن المنوفی (م ۱۵۳۱ء) کے بقول صلح حدیبیہ کے بعد ہجرت واجب نہیں رہی تھی (۱۷)۔ ابن عربی (م ۱۱۴۸ء) ہجرت کے وجوب کے تو قائل تھے، لیکن ان کے نزدیک ہجرت چھ طرح کی ہے۔ ایسے علاقوں سے جہاں کفر، فتنہ اور ظلم کی حکمرانی ہو ہجرت فرض ہے لیکن ایسے علاقوں سے جہاں کوئی مرض پھیل جائے، اقتصادی حالات خراب ہو جائیں یا قید و بند کا سامنا ہو، ہجرت فرض نہیں (۱۸)۔

افریقہ کے شمالی اور مغربی علاقوں میں مالکی مذہب رائج تھا۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں یہاں اصلاحی تحریکیں اٹھیں۔ ان مصلحین میں نائیجیریا کے شیخو عثمان دان فودیو بہت نمایاں ہیں۔ ان کی تعلیمات سے افریقہ کے دوسرے رہنما بھی متاثر ہوئے، جن میں الجزائر کے امیر عبدالقادر، موریطانیا کے ماء العینین القلقمی اور صومالیہ کے عبداللہ حسن شامل ہیں۔ ان مصلحین نے بدعات اور تقلید کے خلاف آواز بلند کی اور اصلاح احوال کے لیے اس وقت کے مسلمان حکمرانوں کے خلاف جہاد کی دعوت دی۔ جہاد کی تنظیم کے لیے انہوں نے ایک مرتبہ پھر ہجرت کے وجوب کا مسئلہ اٹھایا (۱۹)۔

حنفی فقہ میں مسئلہ ہجرت پر بحث زیادہ تر علاقے اور جغرافیائی حدود کے حوالے سے ہے۔ ایک مسلمان جو دار الحرب سے ہجرت نہیں کرتا، اس کی حیثیت حربی کی ہے اور اس کے حقوق بھی حربی کے ہیں، جو دار الاسلام میں مقیم مسلمان سے مختلف ہیں۔ چنانچہ اکثر معاملات میں دار الاسلام اور دار الحرب کے مابین ایسے مالی معاملات، مثلاً سودی لین دین وغیرہ جائز ہیں، جو دار الاسلام میں جائز نہیں (۲۰)۔ حنفی فقہاء کے نزدیک دار الحرب وہ علاقہ ہے، جہاں اسلامی احکام جاری نہ ہوں، جہاں دار الاسلام کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ ہو۔ چنانچہ مندرجہ ذیل حالات میں دار الاسلام بھی دار الحرب میں تبدیل ہو جاتا ہے:

۱۔ جس مسلمان علاقے پر غیر مسلموں کو غلبہ حاصل ہو جائے اور اسلام کے احکام جاری نہ رہیں۔

۲۔ جس علاقے میں مسلمان اور غیر مسلم ایک معاہدے کے تحت رہ رہے ہوں اور غیر مسلم قبضہ کے بعد وہ معاہدہ باقی نہ رہے۔

۳۔ دونوں صورتوں میں شرط یہ ہے کہ یہ علاقہ دوسرے دار الحرب کے علاقے سے متصل ہو۔ بیچ میں دار الاسلام کا علاقہ نہ پڑتا ہو (۲۱)۔

حنبلی فقیہ ابن قدامہ (م ۹۷۰ء) نے ''المغنی'' میں ہجرت کے احکام بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہجرت کا حکم تا قیامت جاری ہے۔ جب تک جہاد کا حکم ہے ہجرت فرض ہے۔ تاہم انہوں نے ہجرت کے احکام کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، اول ایسا ملک جہاں دین کا اظہار اور واجبات کی ادائیگی ممکن نہ ہو، وہاں سے ہجرت فرض ہے۔ دوم ایسے لوگ جو ہجرت سے معذور ہوں، بیماری کی وجہ سے یا جنہیں دار الکفر میں اقامت کے لیے مجبور کر دیا گیا یا عورتیں اور بچے جو ہجرت کی استطاعت نہیں رکھتے، ان پر ہجرت فرض نہیں ہے۔ سوم ایسے لوگ جو ہجرت کی قدرت تو رکھتے ہیں، لیکن انہیں دار الکفر میں دین کے اظہار اور اقامت میں کوئی پابندی نہیں، تو ایسے لوگوں پر

ہجرت فرض نہیں، صرف مستحب ہے۔ کیونکہ یہ لوگ کفار کے ساتھ میل جول سے برائی کی روک تھام اور اسلام کی تقویت کا باعث بن سکتے ہیں (۲۲)۔

شیعہ ائمہ کا موقف خوارج سے بنیادی اختلافات پر مبنی تھا۔ زیدی شیعہ کا خوارج سے اختلاف بہت کم تھا۔ ان کے نزدیک عہد اموی اور عباسی میں ملک دارالکفر بن چکا تھا اور یہاں سے ہجرت لازمی تھی۔ البتہ اثنا عشری شیعہ کے نزدیک ملک دارالہدنہ (صلح اور معاہدے کا علاقہ) تھا، جہاں سے ہجرت فرض نہیں تھی۔

دور استعمار اور احکام ہجرت

انیسویں صدی کے آغاز میں اکثر مسلمان علاقے یورپی استعمار کے زیر اثر آ گئے اور ان علاقوں کے بارے میں سوال اٹھا کہ وہ دارالاسلام ہیں یا دارالحرب؟ کیا ان سے ہجرت کرنا واجب ہے؟ شاہ عبدالعزیز (م۱۸۲۴ء) کے فتاویٰ میں یہ سوالات ہندوستان کے بارے میں ہیں کہ انگریزوں کی حکمرانی میں اس ملک کی کیا حیثیت ہے؟ شاہ صاحب نے ان سب سوالات کے جواب میں یہی کہا کہ ہندوستان دار الحرب ہے، لیکن نہ ہندوستان سے ہجرت کا حکم دیا نہ جہاد کا۔ سوال کرنے والوں نے خاص طور پر دارالحرب کے ان احکام کے بارے میں سوالات کیے، جو حنفی فقہ کی رو سے دارالحرب میں سود کے کاروبار اور لونڈی غلام کی خرید وفروخت کو جائز قرار دیتے ہیں۔ جب خاص طور پر ہجرت کے بارے میں پوچھا گیا تو شاہ عبدالعزیزؒ نے کہا کہ ہجرت تب فرض ہوتی ہے، جب اس کی استطاعت ہو، موجودہ حالات میں یہ ممکن نہیں ہے (۲۳)۔ سید احمد بریلویؒ نے جب جہاد کا اعلان کیا، تو اس کے ساتھ ہجرت کا حکم بھی دیا۔ عام طور پر حنفی موقف یہ رہا کہ اگر جمعہ، عیدین اور دیگر عبادات کے قیام میں رکاوٹ نہ ہو، تو ملک دارالاسلام کہلائے گا۔ غیر مسلم حکمران مسلمان والی اور قاضی مقرر کریں، تو ان کے فیصلے شرعی طور پر نافذ العمل ہوں گے (۲۴)۔ ہندوستان کے دوسرے مکاتب فکر کے اصحاب مثلاً کرامت علی جونپوری، سید احمد خان، نذیر حسین محدث دہلویؒ بھی ہندوستان کو دارالاسلام قرار دیتے تھے (۲۵)۔

اس ضمن میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے مشیر ہندوستان کو دارالحرب قرار دینے میں فائدہ سمجھتے تھے۔ ولیم ہنٹر کا کہنا تھا کہ اگر ہندوستان دارالحرب قرار دے دیا جائے، تو یہاں انگریزی قوانین رائج کرنے میں آسانی ہوگی، کیونکہ مسلمانوں کے نزدیک دارالحرب میں شرعی احکام رائج نہیں رہتے۔ اس مقصد کے لیے ولیم ہنٹر نے بہت سے علماء سے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے بارے میں فتاویٰ بھی جمع کیے (۲۶)۔

ہجرت کے حوالے سے برصغیر کی تاریخ کا ایک بہت ہی اہم واقعہ ۱۹۲۰ء میں ہندوستان سے افغانستان کی طرف ہجرت کا مسئلہ ہے۔ ہجرت کی تحریک کا سلسلہ تحریک خلافت سے جڑا ہوا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے عالم اسلام اور ہندوستان کے حالات اور فقہی احکام کا حوالہ دیتے ہوئے اعلان کیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر ہجرت فرض ہو گئی ہے (۲۷)۔ ہمسایہ ملک افغانستان نے مہاجرین کی نصرت اور مدد کا وعدہ کیا۔ تحریک خلافت کے رہنماؤں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی نے اس کی تائید کی اور تحریک ہجرت شروع ہوگئی۔ اس تحریک کی بنیاد شاہ عبدالعزیز اور مولانا عبد الباری فرنگی محلی کے فتاویٰ پر تھی، لیکن جیسا کہ ذکر ہوا شاہ عبدالعزیز نے ہجرت کی فرضیت کے لیے استطاعت شرط رکھی تھی، اسی طرح مولانا عبدالباری نے بھی وضاحت کی کہ انہوں نے ہجرت کی فرضیت کا حکم نہیں دیا تھا۔ درحقیقت تحریک ہجرت اور تحریک خلافت دینی سے زیادہ سیاسی تحریکات تھیں۔ جید علماء مثلاً مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا عبدالرؤف داناپوری، احمد رضا خان بریلوی اور پیر مہر علی شاہ نے ۱۹۲۰ء کی ہجرت سے منع کیا (۲۸)۔ تاہم تحریک نے زور پکڑا اور ہزاروں ہندوستانی مسلمان اپنی جائیداد بیچ کر افغانستان روانہ ہو گئے۔ یہ تحریک ناکام ہوئی اور ہجرت کرنے والوں کو مالی اور بدنی نقصانات کے علاوہ دینی طور پر بہت مایوسی ہوئی۔

دور استعمار میں ہجرت کے حوالے سے دارالحرب اور دارالاسلام پر جو فقہی بحثیں ہوئی ان کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ استعمار کے ابتدائی دور میں یعنی انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ان مسائل کی نوعیت خالصتاً فقہی تھی یعنی دارالاسلام کے دارالحرب بن جانے سے کیا احکام مرتب ہوتے ہیں، مسلمانوں کے کونسے حقوق متاثر ہوتے ہیں۔ دوسرا دور بیسویں صدی کے نصف سے شروع ہوتا ہے، جب قومیت اور آزادی کی تحریکیں شروع ہوئیں اس دور میں ان مسائل کی نوعیت فقہی سے زیادہ سیاسی ہوگئی۔ اس دور میں پرانے فتاویٰ کو بھی اس دور کے سیاسی تناظر میں دیکھا گیا چنانچہ شاہ عبدالعزیز کے دارالحرب کے فتویٰ کو آزادی کی تحریک کی ایک دستاویز کی حیثیت میں پیش کیا گیا۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں سیاسی بیداری کے ساتھ ساتھ تعلیم اور ذرائع رسل ورسائل میں بھی ترقی ہوئی۔ ابھی تک مسلمان اپنے اپنے علاقوں تک محدود تھے۔ دوسرے ممالک میں کیا ہو رہا ہے اس کا انہیں بہت کم علم تھا۔ اب ذرائع معلومات کی ترقی کے ساتھ ان کی معلومات میں بھی اضافہ ہوا۔ مسلمانوں کے رابطے بڑھے تو ایک دوسرے کے مسائل سے آگاہی ہوئی۔ استعماری پابندیوں کے بارے میں تبادلہ خیال ہوا، تو مسلمانوں میں باہمی تعاون کی بات شروع ہوئی۔ اسے پان اسلامزم کا نام دیا گیا اور مغرب نے اسے جہاد اور ہجرت کے نظریات سے وابستہ کر کے خطرہ قرار دے دیا۔

عصر جدید

اس عہد جدید میں سیاسی تحریکوں کی قیادت اکثر غیر علماء کے ہاتھ میں تھی، یا ایسے علماء کے ہاتھ میں تھی، جو کسی فقہی مذہب یا روایت سے وابستہ نہیں تھے۔ تاہم استعمار کے خلاف آزادی کی جدوجہد میں اور انتخابات میں عوام تک رسائی کے لیے مذہب اہمیت اختیار کر گیا۔ نئی قیادت نے بھی خلافت، جہاد، ترک موالات اور ہجرت جیسے دینی تصورات اور فقہی احکام کو نئے سیاسی سیاق وسباق میں پیش کیا۔ ان فقہی

تصورات نے مسلمانوں کو یکجا کرنے کا کام تو کر دیا، لیکن نئے دور میں ان کے اطلاق سے جو عملی مشکلات پیش آئیں، اس سے ایک طرف تو ان کے نئے مفاہیم سامنے آئے اور دوسرے ان تصورات کے نعم البدل کی تلاش بھی شروع ہوئی۔

ہجرت کے نئے مسائل میں اعلیٰ تعلیم، سیاسی پناہ اور ملازمت کے لیے غیر مسلم ممالک میں قیام کے علاوہ ایک بہت بڑا مسئلہ ان مسلمانوں کا تھا، جو قومی ریاستوں کے قیام کے بعد مستقل اقلیت بن گئے تھے۔ ان کے لیے اپنے ملکوں میں اسلامی ریاست کا قیام یا دوسرے ممالک میں ہجرت ممکن نہیں رہی تھی۔ ہجرت کے یہ مسائل بالکل نئے تھے اور قدیم فقہ ان میں براہ راست رہنمائی نہیں کرسکتی تھی۔

بعض فقہاء نے مسلم علاقے میں وبائی امراض کے پھیلنے پر، یا جان و مال کو خطرے کی وجہ سے غیر مسلم علاقوں میں ہجرت کی اجازت دی (۲۹)۔ دوسرے فقہاء کے نزدیک غیر مسلم ممالک میں دعوت وتبلیغ کے مقصد سے قیام جائز تھا۔ دور جدید میں اس اقامت کے جواز کے اور پہلو بھی سامنے آئے۔ ۱۹۸۵ء میں بعض الجزائری طلبہ نے طنجہ کے ایک مفتی عبدالعزیز الصدیق سے امریکہ اور یورپ میں مسلمانوں کے قیام کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ بعض حالات میں مسلمانوں کے لیے ان

> ہجرت کے نئے مسائل میں اعلیٰ تعلیم، سیاسی پناہ اور ملازمت کے لیے غیر مسلم ممالک میں قیام کے علاوہ ایک بہت بڑا مسئلہ ان مسلمانوں کا تھا، جو قومی ریاستوں کے قیام کے بعد مستقل اقلیت بن گئے تھے۔

ملکوں میں قیام واجب ہوجاتا ہے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ آج کے حالات میں مسلمانوں کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم اور تربیت واجب ہے، اس لیے جن ممالک میں یہ تعلیم معیاری درجہ پر ملتی ہے، وہاں قیام واجب ہے۔ قرآن اور سنت میں مسلمانوں کے لیے حکم ہے کہ وہ علم اور معاشی ضرورتوں کے لیے دارالکفر کی طرف ہجرت اور وہاں قیام کرسکتے ہیں (۳۰)۔ انہوں نے مزید کہا کہ یورپ اور امریکہ میں اپنے مذہب پر عمل کی آزادی اکثر اوقات مسلم ممالک کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ خصوصاً وہ ممالک جن کے مسلمان ممالک کے ساتھ معاہدے ہیں، وہ تو ہرگز دارالکفر قرار نہیں دیئے جاسکتے۔ عالم اسلام کے دوسرے نامور فقہاء مثلاً مصر سے عبدالقادر عودہ (م ۱۹۵۴ء)، شیخ ابوزہرہ (م ۱۹۷۴ء) اور شام سے وہبہ زحیلی نے بھی ایسے ہی دلائل کے ساتھ غیر مسلم ممالک میں قیام کے حق میں فتویٰ دیا ہے (۳۱)۔

عہد جدید میں قومی ریاستوں کے قیام کے بعد دارالاسلام اور دارالکفر یا دارالحرب کی مباحث نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ گذشتہ ادوار میں مسلمان عالم اسلام کو ایک اکائی کے طور پر دیکھتے تھے، جو اپنے معاملات میں خودمختار تھا۔ آج کے دور میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد پر اس اکائی کے تصور کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اب ریاست کی اکائی کی بنیاد جغرافیائی حدود پر استوار ہے۔ مسلمانوں کے لیے ایک مسلم ملک سے دوسرے میں آزادانہ سفر بھی بعض قوانین کا پابند ہوگیا۔ تجارت اور معیشت کے لیے بھی پہلی سی صورت حال نہیں رہی، ہجرت اور قیام تو دور کی بات ہے۔ فقہا کے نزدیک ہجرت کے احکام دارالاسلام اور دارالکفر کے تصورات سے وابستہ تھے۔ صدر اسلام میں ہجرت کے مسائل میں سوال تھا کہ کونسے علاقے سے کس علاقہ کی طرف ہجرت کی جائے۔ قرون وسطیٰ میں جب دارالاسلام وسعت اختیار کرگیا تھا تو سوال یہ بنا کہ کس علاقہ سے مسلمان ہجرت نہ کریں۔ اس سوال کا جواب دارالاسلام کی تعریف پر مبنی تھا۔ اگر کسی علاقہ سے ہجرت کا حکم دے دیا جائے تو وہ علاقہ دارالاسلام نہیں رہتا تھا۔ جب تیرہویں صدی عیسوی میں یورپ میں عیسائیوں نے اور وسط ایشیا میں تاتاریوں نے مسلمانوں کے علاقے فتح کرلیے، تو اب سوال یہ اٹھا کہ کیا دارالاسلام کو دارالحرب قرار دیا جاسکتا ہے؟ اور کن حالات اور شرائط میں یہ تبدیلی آتی ہے؟ فقہاء مسلسل دارالاسلام اور دارالحرب کی تعریفوں پر نظرثانی کرتے رہے اور ہجرت کے احکامات واضح کرتے رہے۔ لیکن قومی ریاستوں کے وجود میں آنے کے بعد دارالاسلام کی تعریف بہت پیچیدہ ہوگئی۔ ہجرت کے بارے میں اب سوال صرف یہ نہیں رہا کہ کس علاقہ سے ہجرت واجب ہے، بلکہ مشکل یہ پیش آئی کہ کس علاقہ کی طرف ہجرت کی جائے۔

ان سوالوں کے جواب میں اب نئی اصطلاحات سامنے آئیں یا یوں کہیے کہ بہت سی قدیم اصطلاحات نئے معانی کے ساتھ استعمال ہوئیں، ان میں دارالعہد، دارالامان اور دارالصلح کی اصطلاحات اہم تھیں، کیونکہ ان اصطلاحات کے ذریعے یہ تصور دیا گیا کہ ملکوں کے درمیان جنگ اور امن کی حالت مستقل نہیں۔ تمام غیر مسلم ممالک کو ہمیشہ کے لیے دارالحرب قرار نہیں دیا جاسکتا۔ خصوصاً جن ممالک کے ساتھ بین الاقوامی معاہدے ہیں ان کو دارالحرب میں شامل کرنا شرعی طور پر صحیح نہیں۔ امت مسلمہ کے علماء کی اکثریت غیر مسلم ممالک میں رہائش پذیر مسلمانوں کو اقلیت قرار دیتی ہے۔ ان کے مسائل کو اسی حیثیت سے دیکھتی ہے۔ اہل علم کی ایک بہت بڑی تعداد اس بات کی قائل ہے کہ ان مسلمانوں کے لیے فقہی مذاہب کی تقلید لازمی ہے، بالکل اسی طرح جیسے وہ ان ممالک میں ہجرت سے پہلے کرتے تھے۔ اس سوچ کے مطابق امت کا ایک لغوی معنی مادر وطن کے مفہوم میں ابھرا ہے، یعنی غیر مسلم ممالک میں رہائش پذیر مسلمانوں کا مادر وطن سے تعلق۔ اکثر اوقات اس سے مراد وہ ملک یا ممالک ہیں، جہاں سے ہجرت کرکے یہ لوگ ان غیر مسلم ممالک میں آئے ہیں اور بعض اوقات اس سے مراد پڑوس کے مسلم ممالک ہیں، جو تاریخی طور پر مادر وطن قرار پاتے ہیں اور بالعموم اس سے مراد فکری وثقافتی امومت کا رشتہ ہے، جو جغرافیائی حدود سے بالاتر رہتا ہے۔

ان مادرِ وطن مسلم ممالک سے، خواہ ان کا یہ مادرانہ رشتہ نسلی و ثقافتی ہو یا تاریخی، توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان اقلیات کو اسلامی طرز سے زندگی گزارنے میں سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی مدد فراہم کریں۔ اس توقع سے مسائل میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ اس کا ایک مظہر تو عید کے تہوار وغیرہ کا اختلاف ہے کہ مسلمان آبادیاں مقامی رؤیت ہلال کی بجائے اپنے مادرِ وطن کی رؤیت کو زیادہ معتبر سمجھتی ہیں۔

اس سے یہ تأثر بھی ابھرتا ہے کہ یہ مسلمان آبادیاں دراصل ان مختلف مسلم ممالک کی نوآبادیات ہیں اور وہیں کی ثقافت اور قوانین پر عمل پیرا ہیں۔ حتیٰ کہ بعض ممالک میں تین تین نسلیں گزرنے پر بھی مادرِ وطن سے وابستگی اپنی پوری گہرائی کے ساتھ موجود ہے۔ یہ تأثر اس تصور کے ساتھ جڑا رہتا ہے کہ ان کا قیام عارضی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ یہ احساس کہ مسلمان کبھی بھی غیر مسلم ملک میں مستقل طور پر رہائش اختیار نہیں کر سکتا، اس عقیدے کو تقویت بخشتا ہے کہ دنیا واضح طور پر دارالاسلام اور دارالکفر دو حصوں میں تقسیم ہے۔

اس بات سے قطع نظر کہ آیا دارالکفر میں رہائش پذیر یہ مسلمان آبادیاں دارالاسلام کی طرف ہجرت کرنے کے لیے تیار ہیں اور آیا دارالاسلام ان آبادیوں کو سنبھال لینے کی صلاحیت رکھتا ہے اور آیا مسلمان دارالاسلام کے مختلف ممالک میں مکمل آزادی سے نقل و حرکت کر سکتے ہیں، اس طرزِ فکر نے اس سے بھی زیادہ اہم، پیچیدہ اور فکر طلب سوالات پیدا کیے ہیں۔

جدید سیاسی اور اقتصادی بین الاقوامی حالات ان حالات سے یقیناً مختلف ہیں، جن کے تناظر میں فقہاء نے دارالاسلام اور دارالکفر کی اصطلاحات اور ہجرت کے احکام ترتیب دیئے تھے۔ آج کے دور میں یہ اصطلاحات اور احکام مبہم ہو کر رہ گئے ہیں، لیکن اس ابہام کے باوجود بعض مفتیان کرام ان مسلم آبادیوں کو قرونِ وسطیٰ کے ان مسلمانوں سے مماثل قرار دیتے ہیں، جن کے علاقوں پر غیر مسلموں نے قبضہ کر لیا ہو، وہاں کی اکثریت اسلامی علاقوں میں منتقل ہو گئی ہو اور چند لوگ پیچھے رہ گئے ہوں۔ ان پر قیاس کرتے ہوئے آج کے مفتیان کرام اس مفروضہ توقع کے ساتھ کہ یہ لوگ بھی مسلم ممالک میں ہجرت کر جائیں گے، ان کی صورتِ حال کو عارضی قیام قرار دیتے ہیں اور اسی اعتبار سے یہ حکم جاری کرتے ہیں کہ یہ مسلمان اپنے دینی اور ثقافتی تشخص کو صرف اسی صورت میں قائم رکھ سکتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو مقامی قانون، ثقافت اور اقدار سے الگ رکھیں۔ مقامی سیاسیات میں حصہ نہ لیں کہ یہ نظامِ کفر کے ساتھ تعاون بھی ہے اور اپنے انفرادی تشخص کی نفی بھی۔ اس طرزِ فکر کی نمایاں مثال سعودی عرب کے دو ممتاز مفتیان کرام شیخ عبدالعزیز بن باز اور شیخ ابن عثیمین کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو ''مسلمان اقلیات کے بارے میں فتاویٰ'' کے عنوان سے انگریزی میں لندن سے ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا (۳۲)۔

ان فتاویٰ میں مسلمانوں پر واضح کیا گیا ہے کہ عقیدہ صحیحہ کی حفاظت اور شریعت مقدسہ کے احکام کی پابندی تمام مسلمانوں کی بالعموم اور غیر مسلم معاشروں میں رہائش پذیر مسلم اقلیتوں کی بالخصوص بنیادی ذمہ داری ہے۔ ان فتاویٰ سے ان مسائل و مشکلات کا پتہ چلتا ہے، جن کا مسلم اقلیات کو سامنا ہے۔ مفتیان کرام سے جو سوال کیے گیے ہیں، ان میں قانونی، اقتصادی اور سیاسی مشکلات کے بارے میں رہنمائی طلب کی گئی ہے۔ مفتیان نے سائلین کو صبر اور تحمل کی ہدایت کی ہے، تاہم ان کو یہ ہدایت بھی کی ہے کہ ''اگر روزی کمانے کے سلسلہ میں ایسے امور مثلاً مردوں اور عورتوں میں اختلاط سے، جو محرمات میں سے ہیں، اجتناب ممکن نہ ہو تو ایسی روزی کو ترک کر دینا واجب ہے'' (۳۳)۔ ان فتاویٰ میں مسلمانوں کو غیر مسلم عورتوں سے شادی کرنے سے منع کیا گیا ہے (۳۴)۔ عیسائیوں سے دعا سلام خصوصاً کرسمس اور دوسرے مذہبی تہواروں پر غیر مسلموں سے میل جول کو ممنوع بتایا ہے (۳۵)۔ شادی بیاہ کے سلسلہ میں

مسلمان غیر مسلم عدالتوں میں جا سکتے ہیں، لیکن صرف طلاق کی رجسٹریشن کی حد تک اور صرف اس صورت میں کہ اس میں شریعت اسلامی کی خلاف ورزی نہ ہو (۳۶)۔ ان فتاویٰ میں عام طور پر قدیم فقہ اسلامی کی پابندی کی تلقین کی گئی ہے۔ بعض صورتوں میں جہاں بعض رخصتوں کی اجازت ہے، تو وہ صرف عارضی طور پر اضطراری حیثیت سے۔ مثلاً تصویر اتروانا یا اس کی اشاعت یا غیر مسلم حکومتوں کے ہاں فوجی خدمات کی اجازت محض اضطراری ہے۔

شریعت کی پابندی کا ایک تقاضا یہ ہے کہ مسلمان ایک مخصوص طریقے سے مذہبی تنظیم قائم کریں اور اس مقصد کے لیے مفتی حضرات کی خدمات کو رسمی شکل دیں۔ ایسی تنظیم میزبان غیر مسلم حکومت کی اجازت کے بغیر عام طور پر ممکن نہیں۔ چنانچہ کتاب میں بار بار علماء اور مفتیان کرام پر زور دیا گیا ہے کہ وہ مسلم اقلیات کے باقاعدگی سے دورے کریں'' شیخ ابن باز مسلمان حکمرانوں اور دولت مندوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ ''وہ دامے درمے سخنے جس قدر ہو سکے مسلم اقلیتوں کی حفاظت کی کوشش کریں، یہ دین کے واجبات میں سے ہے'' (۳۷)۔

دونوں مفتیان عظام قدیم اصولِ فقہ اور تصورِ کائنات میں کتنے محدود ہیں، اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ وہ ان ممالک کو جن میں مسلم اقلیتیں رہائش پذیر ہیں ''دشمن ممالک'' گردانتے ہیں (۳۸)۔ یقیناً وہ ان ممالک کو واقعی دشمن نہیں سمجھتے بلکہ غالباً یہ ''حربی'' کا ترجمہ ہے، لیکن یہ طرزِ استدلال اس تصورِ کائنات پر مبنی ہے، جس کی رو سے پوری دنیا دارالاسلام اور دارالکفر میں تقسیم ہے۔

دور جدید میں مسلم فقہاء عموماً قرون وسطیٰ کی ان اصطلاحات کو اہمیت نہیں دیتے۔ اس لیے ان کے نزدیک مسلم اقلیت کی صورت حال کو قدیم فقہ میں مذکور احکام پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ جدید فقہاء مسلم اقلیت کو دور جدید کے نئے مسائل میں شمار کرتے ہیں۔ اس لیے وہ اس صورت حال سے پیدا شدہ تمام مسائل مثلاً ذبیحہ کی حلت وحرمت، یورپی لباس، یورپ میں نکاح وطلاق، مخلوط تعلیم اور غیر مسلموں کے ساتھ باہمی تعلقات کو حوادث اور نوازل یا مسائل جدیدہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ تاہم ان کے حل کی تلاش میں، وہ بھی ضرورت اور اضطرار کے اصولوں سے مدد لیتے ہیں۔ اس لحاظ سے مفتیوں کے نقطہ ہائے نظر میں اختلاف بھی نظر آتا ہے مثلاً بعض مفتیوں کے نزدیک یورپ کے لوگ اہل کتاب شمار ہوتے ہیں اور دوسروں کے نزدیک نہیں۔ جدید فقہاء میں ایک تیسرا گروہ ہے، جو اس صورت حال کو استثنائی قرار نہیں دیتا بلکہ یہ ایک ایسی صورت ہے، جو مسلم ممالک کو بھی درپیش ہے اور اس کے لیے نئے قواعد واصول کی ضرورت ہے، مصلحہ، روح قانون، رخصت، تیسیر، عموم بلویٰ اور سد ذرائع وغیرہ کے اصول، جو محض مخصوص حالت کے لیے وضع تھے، ان فقہاء کے نزدیک اب ان اصولوں کی حیثیت اضطراری یا عارضی نہیں بلکہ مسلم اقلیات کے لیے یہ بنیادی اصولوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے تمام مسائل انہی اصولوں سے طے ہوں گے، گویا یہ استثنائی قواعد اب فقہ اقلیات کے لیے اصول فقہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ آراء فتاویٰ کی شکل میں شائع ہوچکی ہیں۔

اقلیات کے بارے میں فتاویٰ عام طور پر فقہ یا فتاویٰ کی کتب میں جگہ نہیں پاتے تھے، محض ضمنی مسائل کے طور پر ذکر ہوتا تھا، اب تو اسے ایک مستقل موضوع کی حیثیت دے دی گئی ہے اور اس نام سے کتابیں شائع ہونے لگی ہیں۔

اقلیات کے مسائل اور موضوع پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، تاہم امریکہ میں مسلمانوں کو احساس تھا کہ ان تمام مباحث اور تصانیف میں اقلیات کے مسائل کو صحیح طور پر سمجھا نہیں جارہا۔ ۱۹۹۴ء میں شمالی امریکہ کی فقہ کونسل نے ایک منصوبے کا اعلان کیا، جس کا مقصد غیر مسلم معاشروں میں سکونت پذیر مسلمانوں کیلئے فقہ کی تشکیل تھا۔ جناب یوسف طلال دی لورنزو نے جو کونسل کے سیکرٹری تھے، منصوبے کی تفصیلات بتاتے ہوئے لکھا کہ ''فقہ اقلیات کیلئے اضطرار کے روایتی قواعد سے ہٹ کر نئے اصول فقہ کی ضرورت ہے''۔ اس کے لیے انہوں نے کئی مثالیں دیں۔ مثلاً روایتی فقہ میں نکاح کا معاہدہ محض خاوند کی جانب سے طلاق کے یک طرفہ اعلان سے ختم ہوجاتا ہے۔ نئی فقہ میں اس بات پر زور ہے کہ نکاح کا معاہدہ عدالتی نظام کے ذریعے ختم ہو(۳۹)۔

طٰہٰ جابر العلوانی نے، جو کونسل کے چیئرمین ہیں، غالباً سب سے پہلے فقہ الاقلیات کی اصطلاح استعمال کی(۴۰)۔

فقہ الاقلیات کی اصطلاح اب خاصی مقبول ہوچکی ہے۔ خالد عبدالقادر غالباً پہلے فقیہ ہیں، جنہوں نے ۱۹۹۸ء میں لبنان سے ''فی فقہ الاقلیات المسلمۃ'' کے نام سے کتاب شائع کی اور اس میں اقلیات سے متعلق تمام فقہی احکام جمع کیے(۴۱)۔ علامہ یوسف القرضاوی جنہوں نے اس موضوع پر غالباً سب سے زیادہ لکھا، ان کی کتاب ''فقہ الاقلیات المسلمۃ، حیاۃ المسلمین وسط المجتمعات الاخری'' کے عنوان سے ۲۰۰۱ء میں قاہرہ سے شائع ہوچکی ہے، اس کا انگریزی ترجمہ دو جلدوں میں ۲۰۰۲ء اور ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا۔ انگریزی ایڈیشن میں وہ اس فقہ کو ''پروگریسو فقہ'' یا ترقی پسند فقہ کے نام سے بیان کرتے ہیں(۴۲)۔

نکاح و طلاق کے مسائل

امریکہ اور یورپ میں مسلمان معاشرتوں میں مناکحات کے بارے میں بھی نئے اور اہم سوالات پیدا ہوئے ہیں۔ المجلس الاوربی للافتاء والبحوث (یورپی مجلس برائے افتاء وتحقیق) کے جولائی ۲۰۰۱ء کے اجلاس میں یہ مسئلہ سامنے آیا کہ اگر میاں بیوی اہل کتاب ہوں، مثلاً یہودی یا عیسائی اور بیوی مسلمان ہوجائے تو کیا ان کا نکاح ٹوٹ جائے گا۔ شیخ یوسف قرضاوی کی صدارت میں مجلس نے مسلسل بحث وتمحیص کے بعد یہ رائے دی کہ: اگر بیوی مسلمان ہوئی اور شوہر اپنے مذہب پر قائم رہا، تو اگر اس کا اسلام لانا اس کے شوہر کے اس کے ساتھ مباشرت کرنے سے پہلے ہو تو دونوں کے درمیان علیحدگی فوراً واجب ہوگی۔ اگر وہ عورت اس شوہر سے مباشرت کرنے کے بعد اسلام لائی مگر اس کا شوہر عدت گزرنے سے پہلے مسلمان ہوجائے، تو ان دونوں کا رشتہ نکاح باقی رہے گا۔ اگر اس عورت کا اسلام لانا شوہر کے اس کے ساتھ مباشرت کرنے کے بعد ہوا اور عدت کی مدت بھی گزر گئی، تو اسے اختیار ہے کہ اس شوہر کے اسلام لانے کا انتظار کرے، چاہے یہ انتظار کتنا ہی طویل ہو۔ پھر اگر شوہر اسلام لے آیا، تو دونوں اپنے پہلے نکاح پر باقی سمجھے جائیں گے۔ نکاح کی تجدید کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ عورت عدت گزرنے کے بعد اپنے اس شوہر کے علاوہ کسی اور سے نکاح کرنا چاہے، تو اسے عدالت کے ذریعے اس نکاح کو فسخ کرانا ہوگا۔ اس رائے کی تائید میں مفتیوں نے احادیث، خلفائے راشدین کے فیصلوں اور تابعی فقہاء ابراہیم نخعی، شعبی، اور حماد بن ابی سلیمان کے حوالے دیئے ہیں۔ یہ رائے کئی لحاظ سے اجتہادی ہے کیونکہ فقہاء کا عمومی موقف یہی رہا ہے کہ تبدیل مذہب سے نکاح فسخ ہوجاتا ہے، تاہم آج کے دور میں فقہاء اس رائے پر نظر ثانی کر رہے ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں ملائیشیا کی فتویٰ کونسل نے یہ فیصلہ دیا کہ ''جب عیسائی میاں بیوی میں سے کوئی ایک اسلام لائے، تو وہ دونوں اس شرط کے ساتھ اپنے نکاح پر قائم رہ سکیں گے کہ خاندان کی زندگی اسلامی رہے'' (۴۳)۔

موالات کے مسائل

موالات کے مسئلہ کا ایک نیا پہلو یہ تھا کہ آیا مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کو سیاست میں حصہ لینا چاہیے۔ عام طور پر موقف یہی تھا کہ مغربی ممالک میں کفر کا نظام رائج

ہے اور سیاست میں حصہ لینے سے اسے تقویت ملے گی۔ ۱۹۹۲ء میں فرانس میں منعقدہ ایک فقہی سیمینار میں شیخ مصطفیٰ زرقا، شیخ عبدالفتاح ابوغدہ اور شیخ یوسف قرضاوی وغیرہ علماء نے اس سلسلہ میں یہی موقف اختیار کیا کہ مسلمانوں کو سیاست میں حصہ لے کر مثبت کردار ادا کرنا چاہئے۔ فرانس میں مقیم مسلمان دانشور طارق رمضان کا کہنا ہے کہ مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کو شہری کی حیثیت سے اپنے فرائض ادا کرنا لازم ہیں۔ ان فرائض میں عدل وانصاف کا قیام ایک اسلامی شہری فریضہ ہے، جس کے لیے سیاست میں حصہ لینا ضروری ہے۔ جرمنی میں مقیم مسلم صاحب فکر احمدی صدقی دجانی نے ۲۰۰۲ء میں اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔ تونس کے مسلمان دانشور راشد غنوشی جو فرانس میں مقیم ہیں، لکھتے ہیں ''بہترین راستہ یہ ہے کہ وہ (مسلمان) سیکولر جمہوری جماعتوں کے ساتھ مل کر ایک ایسے جمہوری نظام کے قیام کے لیے جدوجہد کریں جس میں انسانی حقوق کا احترام کیا جائے...... ایسا کرنا جائز بلکہ واجب ہے''۔

اسی طرح کا ایک نازک مسئلہ غیر مسلم ممالک کی فوج میں ملازمت کا ہے۔ ۲۷ ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکی فوج میں ملازم محمد عبدالرشید کے سوال کا جواب دیتے ہوئے علامہ یوسف القرضاوی نے ایک صحیح حدیث کا حوالہ دیا، جس میں دو مسلمان ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار اٹھائیں اور ان میں سے ایک دوسرے کو قتل کردے تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جائیں گے۔ اس صحیح حدیث کی تشریح کرتے ہوئے علامہ نے لکھا کہ یہ حدیث اس صورت حال پر منطبق ہوتی ہے، جہاں دونوں مسلمان اپنی مرضی سے برسرپیکار ہوں۔ جب مسلمان کسی مملکت کی باضابطہ فوج میں سپاہی ہو تو وہ اپنے فیصلے میں آزاد نہیں ہوتا۔ جو احکام صادر ہوں ان کی تعمیل فرض ہے، ورنہ وہ قانون کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوگا۔ اس کے علاوہ ایسے عمل سے صرف اس کی وفاداری ہی نہیں، بلکہ اس ملک میں بسنے والے دوسرے مسلمانوں کی وفاداری بھی مشتبہ قرار پائے گی اور سب کو نقصان پہنچے گا (۴۴)۔

> فرانس میں مقیم مسلمان دانشور طارق رمضان کا کہنا ہے کہ مغربی ممالک میں رہنے والے مسلمانوں پر شہری کی حیثیت سے اپنے فرائض ادا کرنا لازم ہے۔

۱۹۹۴ء میں طٰہٰ جابر العلوانی نے ایک فتویٰ دیا، جس میں مسلمانوں کو امریکہ کی سیکولر سیاست میں حصہ لینے کو جائز قرار دیا۔ امریکہ میں بعض مسلمانوں کے اس بارے میں تحفظات تھے، ان کا کہنا تھا کہ امریکی سیاسیات میں حصہ لینے سے مسلمان گویا غیر مسلموں کے ساتھ تعاون اور اشتراک یا فقہی اصطلاح میں موالات کی تائید کرتے ہیں۔ اس سے مسلمان تقسیم ہوتے ہیں اور ایک غیر اسلامی طاغوتی نظام کی اطاعت کا اعلان کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس سے یہ غلط امید بھی پیدا ہوتی ہے کہ امریکہ دارالاسلام بن گیا ہے۔

کونسل سے استفسار کے جواب میں علوانی نے ان تمام خدشات کی تردید کی۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ امریکی سیکولرزم، مذہب کے معاملہ میں مکمل طور پر غیر جانبدار ہے، اسے لادینی نہیں کہا جاسکتا۔ انہوں نے کہا کہ ان ممالک میں جہاں مسلم اقلیتیں سکونت پذیر ہیں، ان ممالک سے مختلف ہیں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ دونوں ممالک میں صورت حالات مختلف ہے، اس لیے احکام بھی مختلف ہیں۔ مسلم اکثریت کے علاقوں میں مسلمان اپنی ریاست میں رائج شریعت اسلامی کے پابند ہیں۔ امریکہ میں رہائش پذیر مسلمان فقہ اسلامی کے اعتبار سے بھی اور عقلی طور پر بھی ایک سیکولر ریاست میں اسلامی شعائر کے پابند نہیں۔ یہ پابندی صرف اسی صورت تک ہے، جہاں تک مقامی ریاست ان کی اجازت دیتی ہے (۴۵)۔

اس فتویٰ سے اسلامی دنیا میں کھلبلی مچ گئی۔ اکثر علماء نے اس کی مخالفت کی اور بحث ومناظرے کا دروازہ کھل گیا۔ شام کے ایک عالم شیخ سعید رمضان البوطی نے اس فتویٰ کی شدت سے تردید کی۔ انہوں نے اسے اسلام میں تفرقہ پیدا کرنے کی سازش قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمیں تو مغرب میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد دیکھ کر خوشی تھی اور یہ امید ہو چلی تھی کہ اسلام سے وابستگی اور احکام اسلام کی اطاعت سے وہ برف پگھل جائے گی، جو مغرب کی گمراہ تہذیب کی اسلام کے خلاف سرد مہری نے پیدا کی ہے اور امریکی تہذیب اسلامی تہذیب میں شامل ہوجائے گی، لیکن آج فقہ الاقلیات کی دعوت کی یہ آواز سن کر معلوم ہوتا ہے کہ ہماری امیدوں کے برخلاف امریکہ تو آفات کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ اس سے تو یہ خدشہ پیدا ہوچلا ہے کہ امریکہ کی گمراہ تہذیب میں خود اسلام کا وجود پگھلنے کو ہے اور یہ نئی فقہ اس خدشے کو یقین میں بدل رہی ہے (۴۶)۔

اس تنقید کا جواب دیتے ہوئے طٰہٰ جابر علوانی نے واضح کیا کہ فقہ الاقلیات ایک مستقل فقہ کا نام ہے۔ اس کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ شریعت کے اصول اس بات کی ضمانت دیتے ہیں کہ قانون میں ہر معاشرت کی مخصوص زمانی اور مکانی صورت حال اور ضرورتوں کی رعایت رکھی جائے گی۔ شریعت اس بات پر زور دیتی ہے کہ ایک فقیہ اور مفتی کے لیے مقامی عادات کا جاننا ضروری ہے۔ اس کے لیے سماجیات مثلاً معاشرتی علوم، اقتصادیات، سیاسیات اور بین الاقوامی قوانین سے آگاہی لازمی ہے۔ روایتی فقہ جس نے واقعہ بہ واقعہ مسائل کے حل کی بنیاد پر نشوونما پائی ہے، ایک جامع نظام قانون نہیں ہے، جو تمام واقعات کا حل پیش کرسکے۔ فقہ الاقلیات استثنائی یا اضطراری فقہ نہیں ہے، جو محض ہنگامی طور پر بعض رخصتوں پر تعمیر ہوئی ہے۔ علوانی کا کہنا ہے کہ دارالاسلام اور دارالحرب کی تقسیم آج کی دنیا میں بے معنی ہے۔ مسلمان جہاں کہیں بھی ہیں ان کو ایک مستقل اور زندہ متحرک معاشروں کی حیثیت دینا لازمی ہے۔

فقہ الاقلیات نے بہت سے نئے سوالات کو جنم دیا ہے۔ سب سے پہلے تو اقلیت کی
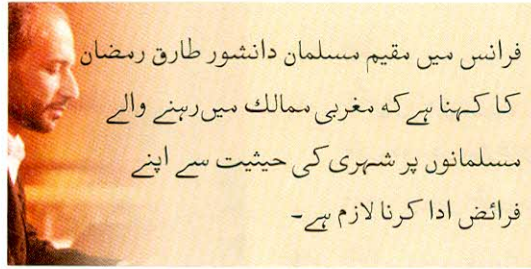
اصطلاح ہے جسے فقہ الاقلیات نے مستقل حیثیت دے دی ہے۔ یہ اصطلاح اسلامی، تاریخی، بین الاقوامی قوانین اور اسلامی تعلیمات کے سیاق میں بہت سی وضاحتوں کا تقاضا کرتی ہے۔ ایک ریاست میں جو قومیت کی بنیاد پر قائم ہو، اقلیت کی اصطلاح ایک قوم در قوم یا دوسرے درجے کی اقوام کا تصور فراہم کرتی ہے۔ لسانی قومیتیں پھر بھی کوئی سیاسی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن مذہبی قومیتیں تو بے حد کمزور ہوتی ہیں، کیونکہ جغرافیائی وحدت نہ ہونے کی بناء پر وہ یکجا نہیں ہوتیں، پھر مذہب اور فرقہ کی بنیاد پر وہ مزید تقسیم ہوتی ہیں۔

دوسرے امریکہ اور یورپ میں نسلی اور لسانی اقلیت کا تصور معروف ہے اور اسے بعض اوقات قانونی حیثیت اور مراعات بھی حاصل ہیں۔ مذہبی اقلیت نہ صرف غیر مقبول ہے، بلکہ اس تصور سے بہت سے خدشات اور تحفظات وابستہ ہیں، اسے قانونی اعتبار حاصل ہونا مشکل ہے۔

تیسرے مسلم اقلیات خود بھی ایک واضح تصور نہیں۔ عام طور پر مسلم اقلیات کا جب ذکر آتا ہے، تو صرف امریکہ یا یورپ میں سکونت پذیر مسلمان مراد لیے جاتے ہیں۔ مسلم
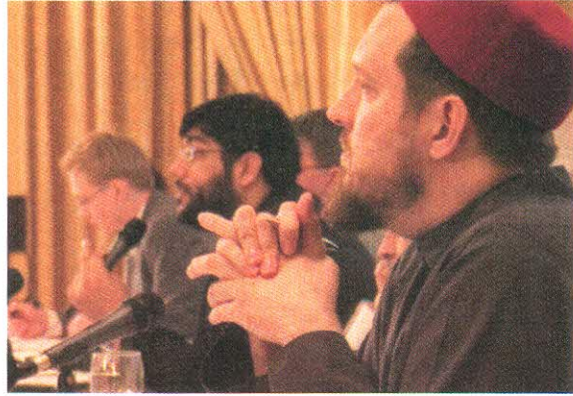
اقلیات کی زیادہ تعداد امریکہ اور یورپ سے باہر غیر مسلم ممالک میں موجود ہے۔ مثلاً بھارت، تھائی لینڈ وغیرہ۔ کیا امریکہ کی فقہ اقلیات ان ممالک کے مسلمانوں کے لیے کافی ہوگی؟ یا ان میں سے ہر ملک کو اپنی فقہ الاقلیات مرتب کرنا ہوگی؟

سب سے اہم بات یہ ہے کہ فقہ اقلیات کے مسائل ایسے مسائل نہیں ہیں، جو مسلم اقلیتوں کے مسائل ہیں، نہ ہی یہ ان مسلمانوں تک محدود ہیں، جو غیر مسلم ممالک میں رہائش پذیر ہیں اور نہ ہی اقلیتی مسائل ہیں اور نہ ہی یہ مغرب یا مشرق کے مسائل ہیں۔ یہ مسائل دراصل بدلتی دنیا کے مسائل ہیں، جو روز بروز عالمی ہوتی جارہی ہے۔ رسل و رسائل اور مواصلات میں تبدیلیوں نے علم اور خبر کی وسعتوں کو سمیٹ دیا ہے۔ زمین کی طنابیں کھنچ رہی ہیں، مغرب اور مشرق میں فاصلے ختم ہوتے جارہے ہیں، جو مسائل کل تک اقلیتوں کے مسائل تھے، وہ اب اکثریت کے مسائل بھی بن چکے ہیں، ان کے عارضی حل ڈھونڈنا کافی نہیں۔ مثلاً پاکستان میں رہنے والا ایک مسلمان صرف پاکستان کا ہی شہری نہیں بلکہ ایک عالمی نظام کا حصہ بھی ہے۔ پاکستان صرف ایک اسلامی ملک ہی نہیں، بلکہ اقوام عالم کا ایک رکن بھی ہے، جو مختلف بین الاقوامی معاہدوں کے تحت اقتصادی، قانونی اور بہت سے دیگر قوانین کا پابند ہے۔ ایک پاکستانی شہری ان معاہدات کے تحت ایک بین الاقوامی شہری بھی ہے۔ فقہ اسلامی دارالاسلام میں رہنے والے ایک مسلمان اور ذمی کے احکام تو بتا سکتی ہے یا ایک حربی اور مستامن کے حقوق پر تو روشنی ڈال سکتی ہے، لیکن اس نئے بین الاقوامی شہری کے کیا حقوق و فرائض ہوں گے ان کا تعین ابھی باقی ہے۔

حواشی

۱- ابن ہشام، سیرۃ النبی، تحقیق محمد عبدالحمید (قاہرہ: محمود علی صبیح، ۱۹۶۳ء)، جلد دوم، ص ۲۹۳

۲- ایضاً، صفحات ۳۱۹-۳۲۱

۴- احمد بن حنبل، مسند (بیروت: دارالفکر، ۱۹۹۱ء)، جلد چہارم، ص ۱۳۰

۵- ابوداؤد، سنن (حلب: المطبعہ العلمیہ، ۱۹۳۳ء) جلد دوم، ص ۲۳۴

۶- بحوالہ ابن حجر العسقلانی، فتح الباری (قاہرہ: مصطفیٰ البابی ۱۹۵۹ء)، جلد ششم، ص ۳۷۸

۷- ایضاً

۸- ابوالحسن علی اشعری، مقالات الاسلامیین (قاہرہ: نہضہ، ۱۹۵۰ء)، جلد اول، صفحات ۱۶۲-۱۷۹ اور محمد شہرستانی، الملل والنحل (قاہرہ: المطبعہ الادبیہ، ۱۸۹۹ء)، جلد اول، صفحات ۱۷۰-۱۸۴

۹- اشعری، مقالات، جلد دو، ص ۱۳۷

۱۰- مسلم، صحیح (بیروت: دارالتراث العربی، ۱۹۵۴ء)، جلد اول، ص ۶۹

۱۱- ابوالقاسم القشیری، لطائف الاشارات (قاہرہ: دارالکتب العربی، ت ن)، جلد اول، ص ۵۱۰

۱۲- ابوالفضل رشید الدین المیبذی، کشف الاسرار وعدۃ الابرار (تہران: دانشگاہ تہران، ۱۳۳۸ھ)، جلد دوم، ص ۶۶۲

۱۳- بحوالہ اسماعیل حقی برصوی: روح البیان (استانبول: مطبوعات عثمانیہ، ۱۹۱۱ء)، جلد دوم، ص ۲۷۲

۱۴- ابوجعفر محمد بن جریر الطبری، جامع البیان عن تأویل آی القرآن (قاہرہ: دارالمعارف، ۱۹۵۸ء) جلد ۲۴، صفحات ۱۴-۷۸

۱۵- ابوادریس محمد الشافعی، کتاب الام (قاہرہ: مطبعہ البرید، ۱۹۰۳ء)، جلد چہارم، ص ۸۴

۱۶- بحوالہ عبدالواحد احمد بن یحییٰ الونشریسی، المعیار المعرب والجامع المغرب عن فتاویٰ علماء افریقیہ والاندلس والغرب (بیروت: دارالغرب، ۱۹۸۱ء)، جلد اول، ص ۱۰۰

۱۷- ابوالحسن المنوفی المالکی، کفایۃ الطالبۃ الربانی (قاہرہ: مشہد الحسینی، ت ن)، جلد دوم، ص ۵

۱۸- ابن العربی، احکام القرآن (بیروت: دارالمعرفہ، ۱۹۷۲ء)، جلد اول، ص ۴۸۶

۱۹- تفصیلات کے لیے مندرجہ ذیل تحقیقی مقالات ملاحظہ ہوں:

Muhammad Khalid Masud, "Shehu Usmuan dan Fodio's Restatement of the doctrine of Hijra", *Islamic Studies*, Vol.25(1986), 1:56-77

B. G. Martin, *Muslim Brotherhood in Nineteenth Century Africa* (Cambridge: Cambridge University Press, 1976)

۲۰- فتاویٰ عالمگیری، اردو ترجمہ: سید امیر علی (لکھنؤ، نولکشور، ۱۹۳۲ء)، جلد سوم، ص ۴۲۳

۲۱- ایضاً، ص ۴۱۵

۲۲- ابن قدامہ، المغنی (بیروت: دارالکتب العلمیہ، ت ن)، جلد ۱۰، ص ۵۱۵

۲۳- صدیق حسن القنوجی، العبرة مما جاء فی الغزو والھجرة (بیروت: اسلامیہ، ۱۹۸۵ء)، ص ۲۳۸

۲۴- ایضاً، ص ۲۳۱

۲۵- تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: محمد نعیم قریشی، ''برٹش انڈیا کے علماء اور ہجرت ۱۹۲۰ء'' (انگریزی)، ماڈرن ایشین سٹڈیز، جلد ۱۳ (۱۹۷۹ء)، شمارہ: ۱، صفحات ۴۱-۵۹

۲۶- ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر لی، دی انڈین مسلمانز (لاہور: ۱۹۶۴ء، اصل ایڈیشن ۱۸۷۱)

۲۷- ابوالکلام آزاد، مسئلہ خلافت (لاہور: خیابان عرفان، ت ن)

۲۸- راجا رشید محمود، تحریک ہجرت ۱۹۲۰ء (لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۶ء)، صفحات ۲۵۸-۲۶۹

۲۹- ابن العربی، احکام القرآن، جلد اول، ص ۴۸۶

۳۰- عبدالعزیز بن محمد الصدیق، حکم اقامة ببلاد الکفار وبیان وجوبھا فی بعض الاحوال (طنجہ، بغاز، ۱۹۸۵ء)

۳۱- شیخ ابوزہرہ، العلاقات الدولیة فی الاسلام (قاہرہ: دارالفکر العربی، ت ن)، ص ۵۵؛ عبدالقادر عودہ، التشریع الجنائی الاسلامی (قاہرہ: دار العربیہ، ۱۹۵۹ء)، جلد اول، ص ۲۷۵؛

وہبہ الزحیلی، آثار الحرب فی الفقہ الاسلامی (دمشق: ۱۹۶۲ء)، ص ۱۴۹

۳۲- Sheikh Ibn Baz and Sheikh Ibn Uthaymeen, *Muslim Minorities, Fatawas Regarding Muslims Living as Minorities* (London: Message of Islam, 1998)

۳۳- ایضاً، ص ۷۵

۳۴- ایضاً، ص ۲۹

۳۵- ایضاً، ص ۸۳

۳۶- ایضاً، ص ۴۷

۳۷- ایضاً، ص ۱۹

۳۸- ایضاً، ص ۳۹

۳۹- John L. Esposipo (ed) Muslims on the Americanizatiton path (Atlanta, Ga: Scholars Press, 1998)

۴۰- Taha Jabir Al-Alwani "Muqaddima Fi Fiqh Al-Aqalliyat"

www.amconline.org/newamc/imam/fatwa.html

۴۱- خالد عبدالقادر، فی فقہ الاقلیات المسلمة (طرابلس، لبنان: دارالایمان، ۱۹۹۸ء)

۴۲- http://www.awakeningusa.com/public.html/books/s19 html

۴۳- ملاحظہ ہو: محمد نجات اللہ صدیقی ''مقاصد شریعت کی روشنی میں اجتہاد کی حالیہ کوششیں''، فکر و نظر، جلد ۴۴ (۲۰۰۷ء)، شمارہ ۴، صفحات ۳-۲۴

۴۴- ایضاً

۴۵- Taha Jabir Al-Alwani

www.amconline.org/newamc/imam/fatwa.html

۴۶- www.bouti.com/ulamaa/bouti/bouti_monthly 15.html (June, 2001)

کرہ ارض کو، جسے جنگی تکنیک میں ہونے والی ترقی اور وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں نے جن میں سے اکثر دنیا کے جدید ترین ممالک کے صنعتی پلانٹس ہی میں تیار کیے گئے ہیں، پہلے ہی رہنے کے لیے نسبتاً کم محفوظ جگہ بنا دیا تھا، اب دہشت گرد تنظیموں کے اقدامات سے مزید حقیقی خطرہ لاحق ہے۔ اسی طرح وہ ممالک جو وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں سے لیس ہیں اور کسی بھی وجہ سے اقوام متحدہ کے چارٹر اور بین الاقوامی قانون کی پابندی نہیں کرتے، ان سے بھی خطرات لاحق ہیں۔ اس صورت حال میں دنیا میں موجود ریاستوں کا ایک ایسا مضبوط گروہ قائم کرنا ضروری نظر آتا ہے جو انسانی حقوق کے لیے کام کرے اور ہر ایسے اقدام کی مخالفت سنجیدگی سے کرے، جس سے انسانی حقوق متاثر ہوتے ہوں، چاہے وہ خلاف ورزی کہیں بھی ہو رہی ہو۔ عالمی امن کے قیام کا انحصار عالمی برادری کی موجودہ خطرات اور ان خطرات کے پیدا ہونے کی وجوہات پر قابو پانے کی صلاحیت پر ہے۔

(جیمز یٹزل، سربراہ شعبہ ڈویلپمنٹ سٹڈیز، لندن سکول آف اکنامکس، لندن)

یورو اسلام

عصری مذہبی مباحث کے تناظر میں جنم لینے والی ایک اہم اصطلاح کا تعارف

''یورواسلام'' کی اصطلاح غالباً سب سے پہلے ۱۹۹۶ء میں سویڈن کے ایک پروگرام میں استعمال ہوئی۔ اس پروگرام کا مقصد یہ تھا کہ یورپ اور مسلم ہمسایوں کے درمیان مذہبی اور ثقافتی تناؤ کو کیسے کم کیا جائے۔ یہ پروگرام یورپی یونین کے ایک بڑے منصوبے کا حصہ تھا جو بارسلونا میں طے پایا تھا اور اسے بارسلونا پروسس کا نام دیا گیا تھا۔ بارسلونا پروسس کے مقاصد میں اور باتوں کے علاوہ یہ ہدف بھی شامل تھا کہ یورپ ایسی خارجہ، اقتصادی اور سماجی پالیسیاں اختیار کرے گا جن میں اسلام کو بہتر طریقے سے سمجھنے پر زور دیا جائے گا اور یورپ میں اسلام کے بامعنی کردار کو یقینی بنایا جائے گا (یورواسلام-یادداشت ۱۹/نومبر ۱۹۹۶ء)۔ یہاں خاص بات یہ تھی کہ اسلام سے صرف یورپ میں بسنے والے مسلمان مراد نہیں بلکہ اس میں پورا عالم اسلام شامل تھا اور یورپ کے مستقبل میں اسلام کے مثبت کردار کو تسلیم کیا گیا تھا۔

''یورواسلام'' کی اصطلاح یورپین اسلام کے معنی میں بھی استعمال ہوئی ہے۔ بلجیئم کے معروف ماہر سماجیات فلپ داستیو نے ۱۹۹۶ء میں پیرس سے کتاب شائع کی تھی جس میں اس نے یورپ کی نئی ابھرتی ہوئی مسلم معاشرت کا مطالعہ پیش کیا۔ اس کا عنوان تھا: ''یورپین اسلام کی تشکیل کا سماجیاتی مطالعہ''۔ یورپین اسلام کی اصطلاح

پرفیسر طارق رمضان اور دوسرے یورپی مسلم مفکرین نے بھی اپنائی۔ ۱۹۹۶ء سے پہلے مغرب میں مسلمانوں کے بارے میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ مختلف ملکوں کے حوالے سے تھیں اور اس لحاظ سے فرینچ اسلام، برٹش اسلام وغیرہ کی اصطلاحیں زیادہ مقبول تھیں۔ بعض مسلم علماء ان اصطلاحوں کے حق میں نہیں تھے۔ ان کے نزدیک ایسی اصطلاحیں اسلام کی عالمگیر شناخت کو کمزور کرتی ہیں۔ ان اصطلاحات کے حامی لوگوں کے نزدیک مذہب کا سماجیاتی مطالعہ مقامی اثرات کو نمایاں کرتا ہے، جس سے ان مذہبی معاشروں کا مقامی تشخص ابھر کر سامنے آتا ہے۔ چنانچہ انہی بنیادوں پر یورپی اسلام یا یورواسلام کی اصطلاح کی مخالفت بھی ہوئی کیونکہ یورپ میں مسلم معاشرت یورپ کے مختلف ملکوں کے لحاظ سے مقامی تھی۔ اور ایسی معاشرت وجود میں نہیں آئی تھی، جو پورے یورپ میں یکساں ہوں۔ تاہم ان تمام مباحث میں یورپین اسلام سے مراد یورپ میں آباد مسلمان اور ان کی معاشرت تھی، جو الگ الگ ممالک میں آباد تھے، لیکن ان کی اسلامی اقدار بہت حد مشترک تھیں۔

یورواسلام کی حمایت میں یہ دلیل پیش کی گئی کہ برٹش اسلام یا فرینچ اسلام کی اصطلاحیں ان لوگوں میں مقبول رہی ہیں جو مسلم معاشرتوں کا مطالعہ نسلی بنیادوں پر کر رہے تھے یا جو نقل مکانی کے پس منظر میں یورپ میں آبادیوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ ان جائزوں میں اسلام کا باقاعدہ مطالعہ کرنے کی نہ ضرورت سمجھی گئی اور نہ ان ماہرین میں اس کی صحیح استعداد تھی۔ چنانچہ انہوں نے مسلم آبادیوں کو عارضی، پناہ گزین اور نقل مکانی کی معاشرت سمجھا جن کا کوئی مستقل اور پائیدار مستقبل نہیں تھا۔

اسلامی دنیا میں بھی یورپ میں آباد مسلمانوں کو عارضی آبادیاں سمجھا گیا۔ علمائے اسلام کے نزدیک یورپ ابھی تک دارالحرب تھا۔ ان آبادیوں کو مسلم اقلیت قرار دیتے ہوئے انہیں معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے نقل مکانی کی اجازت تو دی گئی لیکن مذہبی لحاظ سے ان کو مستقل قیام کی اجازت نہیں دی گئی۔ بہت عرصے تک مغرب میں آباد مسلمانوں کی حیثیت مسلم اقلیات کی رہی۔ تاہم حقیقتاً یہ مستقل آبادیاں تھی جنہوں نے یورپ میں مسلم معاشرت کی بنیاد ڈالی اور جہاں بعض مقامی اثرات کو قبول کیا وہاں یورپ پر اپنے ثقافتی اثرات بھی مرتب کیے۔ حلال گوشت، مساجد، اسلامی مراکز، مسلم قبرستان اور اسلامی لباس سے لے کر مسلم پارلیمنٹ، اسلامی بینک اور دوسرے ادارے متعارف کرائے۔

یورپی مسلمانوں کو اپنا اسلامی تشخص قائم کرنے میں یورپ کے سیکولرازم نے سب سے زیادہ تقویت دی۔ سیکولر فضا میں تمام مذاہب کو یکساں پنپنے کے مواقع ملے۔ عالم اسلام میں سیاسی اور مذہبی آزادی اکثر حالات میں محدود تھی۔ مسلمان دانشوروں، سیاست دانوں اور دینی علماء نے اپنے ملک کی پابندیوں سے آزادی کی خواہش میں یورپ میں قیام کیا۔ مذہبی جماعتوں نے جدید سائنس، ٹیکنالوجی، اسلحہ اور ابلاغ کی تعلیم کیلئے یورپ کے سفر کی اجازت دی۔ حتیٰ کہ دعوہ اور جہاد کی کامیابی کیلئے یورپ میں قیام اور تعلیم ناگزیر سمجھا گیا۔ یوں یورپ میں مسلم معاشرت زیادہ آزاد طریقے سے مستحکم ہوئی۔ عالم اسلام کی مختلف مذہبی اور سیاسی تنظیموں نے یورپ میں اپنے مراکز قائم کیے۔ ان میں سے اکثر تنظیموں نے اپنے اپنے ملک کی سیاسی جنگیں بھی یورپ کی سرزمین سے لڑیں اور اپنے فرقہ وارانہ اور سیاسی اختلاف سے یورپ کو متعارف کرایا۔ تاہم ان تنظیموں نے یورپ میں مسلمانوں کے تنوع کو ایک نئی جہت دی۔ یورپ کی مذہبی معاشرت بتدریج سیاسی نوعیت اختیار کرتی گئی۔ لیکن اس کے ساتھ یورپ میں مذہبی احیا کا سبب بھی بنی اور بین المذاہب روابط کو بھی بڑھایا۔ اس تبدیلی کے دوران یورپ کی عیسائی معاشرت کا سب سے بڑا اثر مسجد کی تشکیل نو پر ہوا۔ مسلمان امام کا ایک نیا تصور ابھرا۔ یورپی امام مسجد محض نمازوں کا امام نہیں، وہ مسلمانوں کا رہنما ترجمان اور سماجی مشیر بھی ہے۔ مسجد اپنی نوعیت کے لحاظ سے صرف نمازوں تک محدود نہیں بلکہ چرچ کی طرح وہ مقامی مسلمانوں کی سماجی اور اقتصادی زندگی کا مرکز بھی ہے۔

یورواسلام یا یورپین اسلام کن معنوں میں یورپی ہے؟ کیا یہ یورپ میں تیار شدہ اسلام کی نئی شکل ہے؟ کیا یہ جدیدیت کا دوسرا نام ہے؟ کیا یہ سرمایہ دارنہ لبرلزم اور انفرادیت پسندی کی تحریکوں سے متاثر ہے؟ اور کیا یہ یورپ سے اسلام کے احیاء کی ابتداء ہے؟

ان سوالوں کا جواب ہاں میں بھی ہے اور نہیں میں بھی۔ کیونکہ یورپی مسلمان بھی اپنے دینی رویوں میں اتنے ہی متنوع ہیں جتنے مسلم ملکوں میں رہنے والے مسلمان۔ ان میں راسخ العقیدہ اور اپنے آبائی معاشروں کے رسم ورواج کے پابند بھی ہیں، سیاسی کارکن بھی ہیں، سیکولر بھی ہیں اور لبرل بھی۔ یورپ کے معاشروں نے ان کو کبھی پوری طرح قبول نہیں کیا تو ان میں سے بیشتر نے کبھی یورپی معاشرت کو بھی پوری طرح قبول نہیں کیا۔

دہشت گردی کے حالیہ واقعات کے بعد یورپی معاشروں نے مسلم آبادیوں کو جن مشکوک نظروں سے دیکھا اس سے مسلمان ایک دوسرے کے قریب بھی آئے ہیں اور انہوں نے یورپی معاشرت کو پہلی مرتبہ سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ میزبان معاشروں پر جہاں اسلام کا خوف طاری ہوا ہے، مسلمانوں سے منافرت میں اضافہ ہوا ہے، وہاں اسلام اور مسلمانوں کو زیادہ بہتر جاننے کی ضرورت کا احساس بھی ہوا ہے۔

اب مسلمان عارضی آبادیاں نہیں ہیں کہ وہ اپنے آبائی ملکوں کو واپس چلے جائیں گے۔ یورپی ممالک کی حکومتیں مسلم معاشروں کے بارے میں مل جل کر سوچنے لگی ہیں۔

مشرقی یورپ میں کمیونزم کی پسپائی سے یورپی اسلام کا ایک اور پہلو بھی سامنے آیا ہے جو اب تک نظروں سے اوجھل رہا تھا اور وہ یہ ہے کہ یورپ میں اسلام محض مہاجر اسلام نہیں ہے، اس میں یورپ کے وہ لوگ بھی شامل ہیں جو صدیوں سے یورپ میں آباد ہیں۔ بوسنیا اس کی معروف مثال ہے۔ ان کے علاوہ ایک بہت بڑی تعداد ان

یورواسلام یا یورپین اسلام کن معنوں میں یورپی ہے؟ کیا یہ یورپ میں تیار شدہ اسلام کی نئی شکل ہے؟ کیا یہ جدیدیت کا دوسرا نام ہے؟ کیا یہ سرمایہ دارانہ لبرلزم اور انفرادیت پسندی کی تحریکوں سے متاثر ہے؟ اور کیا یہ یورپ سے اسلام کے احیاء کی ابتداء ہے؟

یورپی باشندوں کی ہے جنہوں نے بیسویں صدی میں اسلام قبول کیا اور ان کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنے ایک خطاب میں اسلام کی اشاعت میں یورپ کی خدمات کا ذکر کیا تھا جس میں ماضی کے تذکرے کے ساتھ مستقبل کی امیدوں کا بھی ذکر تھا۔ مولانا ندوی اس بات کے قائل تھے کہ ماضی کی طرح آج کے مسلمانوں کو بھی یورپ کے علوم، تکنیک اور ثقافت سے استفادہ کرنا چاہئے جس سے اسلام کو استحکام حاصل ہو۔

یورپ میں مسلمانوں کی موجودگی اور یہاں کے عوام کی اکثریت میں اسلام سے دلچسپی سے اس امید کو تقویت ملتی ہے کہ خوف اور شک کی فضا جو حالیہ واقعات کی وجہ سے طاری ہے، وہ بہت جلد ختم ہوجائے گی اور یورواسلام، یورپ اور عالم اسلام کے درمیان ایک مضبوط پل کا کام دے گا۔ (ادارہ تحریر)

امریکا کی ایک مسجد میں نماز جمعہ کا اجتماع

مغربی تہذیب

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ رُوح اس مدنیّت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ رُوح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

یورپ

تاک میں بیٹھے ہیں مُدّت سے یہودی سُود خوار
جن کی رُوباہی کے آگے ہیچ ہے زورِ پلنگ
خود بخود گرنے کو ہے پکّے ہُوئے پھل کی طرح
دیکھیے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ!

(ماخوذ از نطشہ)

مشرق و مغرب

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظامِ جمہوری
نہ مشرق اس سے بَری ہے نہ مغرب اس سے بَری
جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری
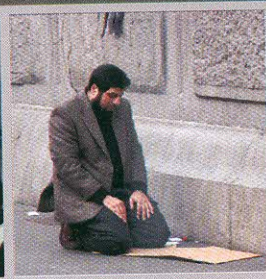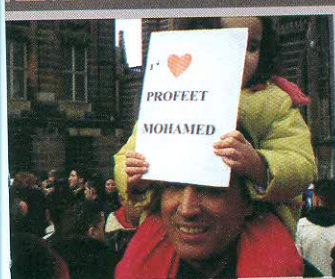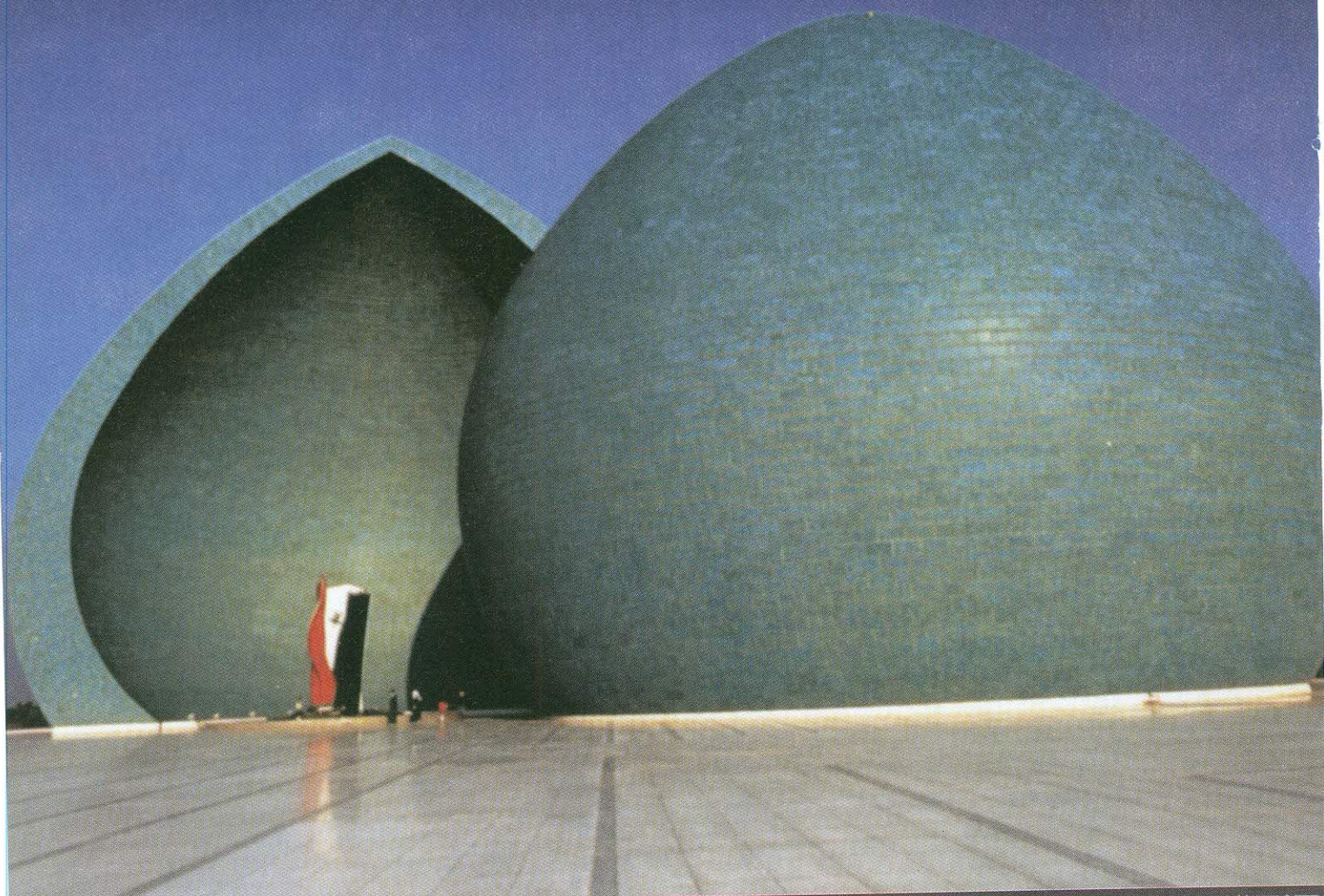
یورپ اور سُوریا

فرنگیوں کو عطا خاکِ سُوریا نے کیا
نبیِ عفّت و غمخواری و کم آزاری
صلہ فرنگ سے آیا ہے سُوریا کے لیے
مے و قمار و ہجومِ زنانِ بازاری!

سیاستِ افرنگ

تری حریف ہے یارب سیاستِ افرنگ
مگر ہیں اس کے پُجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تُو نے
بنائے خاک سے اُس نے دو صد ہزار ابلیس!

فکر دوراں

علم وہنر کے ساتھ تہذیبی مظاہر تک،
بے شمار چیزیں مغرب سے آئیں۔ ان
میں سے کیا قبول کیا جائے اور کسے
مسترد کیا جائے، اس کا کوئی واضح
جواب نہیں مل سکا۔ قبولیت اور عدم
قبولیت کا یہ عمل ایک ساتھ جاری ہے۔
اس راہ میں ہم کبھی ایک قدم آگے بڑھاتے
ہیں اور کبھی دو قدم پیچھے یا دو قدم
آگے اور ایک پیچھے۔

تصادم

ایک غیر اسلامی تصور

اسلام اور مغرب کے موضوع پر ایک مذاکرے کی روداد

مسلمانوں کو درپیش عصری مسائل پر مذاکرے اب اسلامی نظریاتی کونسل کی ایک روایت بنتی جا رہی ہے۔ اس ضمن میں ۱۶/اگست ۲۰۰۷ء کو جونشست منعقد ہوئی، اس کے لیے ''اسلام اور مغرب'' کا موضوع منتخب کیا گیا تھا۔ جو صاحبانِ علم اس مذاکرہ میں شریک ہوئے، ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

۱- ڈاکٹر مظفر محسن نقوی، رکن اسلامی نظریاتی کونسل
۲- ڈاکٹر طاہر امین، پروفیسر بین الاقوامی تعلقات، قائد اعظم یونیورسٹی
۳- محترمہ عارفہ زہرا سیدہ، چیئر پرسن، قومی کمیشن برائے وقار نسواں
۴- آغا مرتضیٰ، پویا، دانشور، سیاسی رہنما
۵- پروفیسر خورشید احمد، سینیٹر، نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان
۶- ڈاکٹر محمد خالد مسعود، چیئر مین اسلامی نظریاتی کونسل

شرکاء کو اس نشست کے انعقاد سے پہلے ایک سوالنامہ بھیجا گیا تھا، جس میں موضوع زیر بحث سے متعلق بعض متعین سوالات ترتیب دیے گئے تھے۔ یہ سوالنامہ اس روداد کے ساتھ الگ سے دیا جا رہا ہے۔ مہمان مدیر ''اجتہاد'' نے اس مذاکرے میں نظامت کے فرائض سرانجام دیے۔ ڈاکٹر محمد خالد مسعود نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے مغرب کے بارے میں اس مخمصے کا ذکر کیا، جس میں مسلمان امت، بالخصوص اسلامی تحریکیں مبتلا ہیں۔ علم و ہنر کے ساتھ تہذیبی مظاہر تک، بے شمار چیزیں مغرب سے آئیں۔ ان میں سے کیا قبول کیا جائے اور کسے مسترد کیا جائے، اس کا کوئی واضح جواب نہیں مل سکا۔ قبولیت اور عدم قبولیت کا یہ عمل ایک ساتھ جاری ہے۔ اس راہ میں ہم کبھی ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں اور کبھی دو قدم پیچھے یا دو قدم آگے اور ایک پیچھے۔ اس پر مستزاد مغرب کا استعماری پہلو ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ رد و قبول کا اختیار استعمال کیے بغیر ''پورے کے پورے مغرب میں داخل ہو جاؤ''۔ اس کے ساتھ مغرب میں یہ سوچ بھی موجود ہے کہ تہذیبی سفر میں مسلمان مغرب کا ساتھ نہیں دے سکتے کیونکہ وہ فکر و عمل دونوں میں پس ماندہ ہیں۔ دوسری طرف اس وقت مغرب کو جو تہذیبی و سیاسی غلبہ حاصل ہے، اس کے پیش نظر مسلمان مغرب کو پوری طرح نظر انداز بھی نہیں کر سکتے۔ اس گھمبیر صورت حال میں مسلمانوں کو سوچنا ہوگا کہ مغرب کے ساتھ تعلقات کو کس نہج پر استوار کیا جائے اور اگر ہمیں ان کے ساتھ مکالمہ کرنا ہے تو اس کی صورت کیا ہو۔

ڈاکٹر خالد مسعود کی اس گفتگو نے بحث و تمحیص کے لیے بڑی حد تک ایک بنیاد فراہم کر دی۔ اسے آگے بڑھاتے ہوئے ڈاکٹر محسن نقوی نے اس مخمصہ کی تائید کی، جس کا ذکر ڈاکٹر خالد مسعود نے کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمیں اس صورت حال کا سامنا عباسیوں کے دور میں بھی ہوا، جب مسلمان معاشرہ یونانی فکر سے متاثر ہونا شروع ہوا۔ اس عہد میں مسلمانوں نے مغربی افکار تو لیے لیکن کلچر سے احتراز کیا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ مغربی کلچر کے اثرات ہمارے معاشرے پر گہرے ہوتے جا رہے ہیں اور ہمیں اس بارے میں کوئی لائحہ عمل طے کرنا پڑے گا۔ انہوں نے مغرب کے ساتھ مکالمہ کی تائید کی، لیکن تہذیبوں کے تصادم کے اس تصور کو رد کیا جو پروفیسر ہنٹنگٹن نے اپنے مقالے میں ۱۹۹۳ء میں پہلی بار پیش کیا تھا۔ ڈاکٹر محسن نقوی کا کہنا تھا کہ ہماری اپنی روایات ہیں، اس لیے ہم مغربی اقدار کو قبول نہیں کر سکتے۔

علم وہنر کے ساتھ تہذیبی مظاہر تک، بے شمار چیزیں مغرب سے آئیں۔ ان میں سے کیا قبول کیا جائے اور کسے مسترد کیا جائے، اس کا کوئی واضح جواب نہیں مل سکا۔

ڈاکٹر طاہر امین نے بھی تہذیبوں کے تصادم کے تصور کا ذکر کیا، تاہم انہوں نے اسے اسلام اور مغرب کے باہمی تعلقات کے وسیع تر تناظر میں دیکھا۔ ان کا کہنا تھا کہ نو آبادیاتی دور کے بعد بین الاقوامی تعلقات کے مطالعہ کے ضمن میں جو نظام ہائے فکر سامنے آئے، انہیں اگر پیش نظر رکھا جائے تو اسلام اور مغرب کے باہمی تعلقات کو سمجھنے کے لیے مسلمان اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اگرچہ ابھی تک انہیں سمجھنے کی کوئی

۱- مغرب آپ کے نزدیک ایک جغرافیائی وحدت ہے، تہذیب ہے یا ایک سیاسی اکائی؟
۲- مغرب کے مطلوب انسان اور اسلام کے مطلوب انسان میں کیا فرق ہے؟
۳- اپنے تہذیبی تشخص میں کیا مغرب مذہب مخالف ہے؟
۴- مغرب کے اہل علم اسلام کے بارے میں یک زبان ہیں یا مختلف الخیال؟
۵- مغرب کے Multi Cultural تشخص میں اسلام کا کتنا حصہ ہے؟
۶- کیا اسلام اور مغرب کے مفادات باہم متصادم ہیں؟ اگر ہیں تو کس دائرے میں؟
۷- مغرب میں اسلام ایک چیلنج ہے یا ایک پھیلتا ہوا مذہب؟
۸- اسلام کی سیاسی تعبیر نے کیا مغرب کو تشویش میں مبتلا کیا ہے؟
۹- سلمان رشدی کا خطاب اور پھر ڈینش کارٹون جیسے واقعات مغرب میں کیوں ہوتے ہیں؟
۱۰- اسلام کے حوالے سے مغربی میڈیا کا عمومی کردار کیا ہے؟
۱۱- امریکا کے سیاسی مفادات کس حد تک اسلام اور مغرب کے تعلق پر اثر انداز ہو رہے ہیں؟

سنجیدہ کوشش سامنے نہیں آئی۔ ڈاکٹر طاہر امین کے نزدیک یہ نظام ہائے فکر پانچ ہیں:

۱- اختتام تاریخ کا تصور (End of History)
۲- تہذیبوں کا تصادم (Clash of Civilizations)
۳- باہمی انحصار کا پیچیدہ عمل (Complexion of Interdependence)
۴- مراکز قوت وتاثر کی کثرت (Multipolarity)
۵- مجرمانہ لاقانونیت (Criminal Anarchy)

پہلے چار تصورات کے مطابق اسلام مغرب کے لیے ایک چیلنج اور خطرہ ہے۔ جبکہ پانچواں پیراڈائم اسلام کو ایک سماجی عامل کے طور پر دیکھتا ہے۔ گویا ڈاکٹر طاہر امین کے نزدیک مغرب میں اسلام کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے انہوں نے اس نقطہ نظر کو بھی غلط قرار دیا، جس کے تحت مغرب کو ایک اکائی

ہمیں مغرب کے ساتھ مثبت رابطے کو فروغ دینا چاہئے اور اس کا سب سے بہتر طریقہ مکالمہ ہے۔ ہمیں تصادم کے بجائے عالم اسلام اور مغرب کے مابین رابطے کے عمل کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔

کے طور پر لیا جاتا ہے۔ مغرب کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتے وقت، ڈاکٹر طاہر امین کے الفاظ میں، ہمیں یہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ وہاں اسلام کے بارے میں ایک نہیں کئی نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں، اس لیے یہ انداز فکر درست نہیں، جس کے مطابق مغرب کو ایک وجود مان کر رائے قائم کی جاتی ہے۔ اسی طرح عالم اسلام بھی فکری اعتبار سے ایک اکائی نہیں ہے۔ اگر کوئی اسامہ بن لادن کو، مثال کے طور پر، پورے عالم اسلام کا واحد نمائندہ قرار دیتا ہے تو یہ غلط ہوگا۔

ڈاکٹر طاہر امین نے ایک اور اہم بات یہ کہی کہ مغرب ایک نئی حکمت عملی کے تحت دنیا پر ایک اداراتی تسلط (Institutional Hegemony) قائم کرنا چاہتا ہے۔ ماضی کی سامراجی قوتوں کی طرح دوسرے ملکوں پر فوجی چڑھائی اور ان پر قبضہ اس حکمت عملی کا حصہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عراق پر امریکی حملہ اور قبضہ مغرب میں تنقید کا شدید نشانہ بنا کیونکہ یہ اداراتی تسلط کے بنیادی تصور کے خلاف تھا اور اسے بش انتظامیہ کی کوتاہ بینی اور کم نظری پر محمول کیا گیا۔ اپنے اس بنیادی تجزیہ کی روشنی میں ڈاکٹر طاہر امین کا خیال تھا کہ ہمیں مغرب کے ساتھ مثبت رابطے کو فروغ دینا چاہئے اور اس کا سب سے بہتر طریقہ مکالمہ ہے۔ ہمیں تصادم کے بجائے عالم اسلام اور مغرب کے مابین رابطے کے عمل کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے اور یہی اس وقت ہمارے مفاد میں ہے۔ آج ایک عالمی دنیا وجود میں آچکی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی معاشرہ دنیا سے کٹ کر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا۔

محترمہ عارفہ سیدہ کا کہنا تھا کہ مسلمان معاشروں میں ایک بنیادی غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ مغربیت اور جدیدیت ہم معنی ہیں، جب کہ حقیقت میں یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کا کہنا یہ بھی تھا کہ تہذیب اور علم کے بارے میں بھی ہمارا رویہ اصلاح طلب ہے۔ تہذیب دراصل ایک جنت گم گشتہ کی تلاش ہے اور علم جستجو کا نام ہے۔ ہم دونوں تصورات سے دور ہیں۔

اسلام اور مغرب کے باہمی تعلق کو سمجھنے کے حوالے سے محترمہ عارفہ سید خود احتسابی کو

ضروری سمجھتی ہیں۔ ان کے نزدیک بعض بنیادی تصورات پر اگر نظر ثانی کریں تو ہم اس تعلق کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر مسلمان بالعموم عربی تہذیب کو اسلامی تہذیب سمجھتے ہیں۔ اسلام اصلاً بعض اصولوں اور افکار کا نام ہے۔ اس میں یہ صلاحیت ہے کہ کسی بھی خطہ میں رہنے والے اسے بطور دین اختیار کر سکتے ہیں اور ان کے اپنے تہذیبی پس منظر میں اسلام انہیں اجنبی معلوم نہیں ہوتا۔ جب ہم اسے ایک

اخلاقی قدروں کو مستحکم کیے بغیر معاشرے پرسکون اور پرامن نہیں ہوسکتے۔ بدقسمتی سے نہ مشرق کی اس بنیادی حقیقت پر نظر ہے نہ مغرب کی۔ آج شرق وغرب میں مصلحتوں کے ساتھ ترجیحات بدل جاتی ہیں۔

مخصوص خطے کی تہذیب سے متعلق کر دیتے ہیں، تو پھر بعض ایسی چیزیں اسلام سے منسوب ہو جاتی ہیں، جن کا تعلق مذہب سے نہیں، ایک خاص علاقے کی تہذیب سے ہوتا ہے۔ اسی طرح مسلمان معاشروں میں ترقی کا مفہوم بھی متعین اور واضح نہیں ہے۔ ہر نئی بات کو اچھوت قرار دیا جاتا ہے اور ہمیشہ قدیم کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہماری بنیاد وہی ہے، جو چودہ سو سال پہلے رکھی گئی، لیکن ہمیں اس بنیاد پر جو عمارت کھڑی کرنی ہے، اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ بنیاد پر اصرار اور عمارت کی تعمیر سے گریز ایک غیر متوازن انداز فکر ہے۔

ڈاکٹر عارفہ سیدہ نے یہ توجہ بھی دلائی کہ زندگی کی بنیاد اخلاق پر ہے۔ اخلاقی قدروں کو مستحکم کیے بغیر معاشرے پرسکون اور پرامن نہیں ہو سکتے۔ بدقسمتی سے نہ مشرق کی اس بنیادی حقیقت پر نظر ہے نہ مغرب کی۔ آج شرق وغرب میں مصلحتوں کے ساتھ ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے بش انتظامیہ کی موجودہ حکمت عملی کو بطور مثال پیش کیا، جو ان کے نزدیک صدر بش کے احساس کمتری کا بدترین مظہر ہے۔ تصادم کو انہوں نے غلط اور مسلمانوں کے لیے نقصان دہ قرار دیا۔ ڈاکٹر عارفہ سیدہ نے بھی مغرب اور عالم اسلام کے مابین مکالمے اور رابطے کی تائید کی۔

آغا مرتضیٰ پویا کا کہنا تھا کہ اسلام اور مغرب میں تصادم ناگزیر ہے اور اس کی ایک بنیادی وجہ ہے۔ اسلام آج الہامی علم وہدایت کا نمائندہ ہے جبکہ مغرب سیکولرزم کا۔ یہ دونوں زندگی کے بارے میں دو متضاد نقطہ ہائے نظر ہیں، اس لیے ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ مغرب آج اسلام کو مٹانے کے درپے ہے۔ اس مقصد کے لیے اس نے جو حکمت عملی اپنائی ہے، اس کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ ہم مسلمانوں کو عیسائی تو نہیں بنا سکتے لیکن اس کی پوری کوشش کرنی چاہئے کہ مسلمان مسلمان بھی نہ رہیں۔ انہوں نے اس تصور کی تائید نہیں کی کہ مغرب ایک اکائی نہیں ہے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اظہار کے اسالیب مختلف ہو سکتے ہیں، لیکن اسلام دشمنی کے معاملہ میں مغرب ایک وحدت کا

نام ہے۔ جناب مرتضیٰ پویا نے پاکستان کی جماعت اسلامی اور مصر کی الاخوان المسلمون کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ عالم اسلام کی یہ تحریکیں اسی مغربی سازش کو روکنے کے لیے اٹھی تھیں۔

مغرب کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ وہ کسی اخلاقی بنیاد پر یقین نہیں رکھتا۔ انہوں نے اپنے استعماری عزائم کے لیے دو عالمی جنگوں میں ایک سوملین انسانوں کو تہہ تیغ کر دیا۔ اب اسلام اور مسلمان ان کا ہدف ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے فلسطین کی مثال بھی دی۔ ان کا کہنا تھا کہ مغرب کی یہ ساری تگ ودو ایک صیہونی ریاست، اسرائیل کو بچانے کے لیے ہے۔ چنانچہ جب ڈیگال نے ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کی مخالفت کی تو چند ماہ بعد اس کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ تاہم ان کا کہنا تھا کہ مغرب کی ان تمام کوششوں کے باوجود یہ صیہونی ریاست اب قائم نہیں رہ سکتی۔ خود اسرائیل کے اندر سے اس کے خلاف آوازیں اٹھ رہی ہیں اور اسے ایک غیر اخلاقی ریاست قرار دیا جا رہا ہے۔

ان کی رائے یہ تھی کہ مغرب عالم اسلام پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتا ہے اور دنیا کو ایک نئے اقداری نظام کا پابند بنانا چاہتا ہے۔ بطور دلیل انہوں نے امریکا کے سابق صدر نکسن کے ۳۵ صفحات پر مشتمل ایک خط کا حوالہ دیا، جس میں انہوں ۱۹۸۵ء میں روس کے صدر کو لکھا تھا کہ دونوں کو مل کر اسلام کو روکنے پر پوری توجہ مرتکز کرنی چاہئے۔ آغا صاحب کے نزدیک مغرب کسی بین الاقوامی قانون کو نہیں مانتا۔ اسے اس بات کا کوئی حق نہیں تھا کہ وہ افغانستان میں طالبان حکومت کو ختم کرتا۔ اسی طرح مغرب دنیا میں جو اقداری نظام متعارف کرانا چاہتا ہے وہ الہامی علم کی نفی پر کھڑا ہے۔ مغرب میں عیسائی اگر اچھے عیسائی بن جائیں اور یہودی اچھے یہودی بن جائیں تو اس میں سب
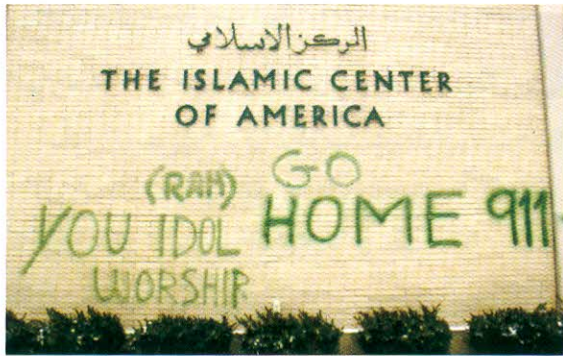
کے لیے خیر ہے اور ہم یہی چاہتے ہیں لیکن اس نئے اقداری نظام کے تحت ایسا ممکن نہیں ہے۔ انہوں اس پر افسوس کا اظہار کیا کہ عالم اسلام میں حکمران مغرب سے ہدایات لیتے ہیں۔ آغا مرتضیٰ پویا کے نزدیک مسلمانوں کا مطمع نظر رضائے الٰہی ہونا چاہئے اور دنیاوی نتائج کو اس حوالے سے زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہے۔ آغا صاحب کا اصرار تھا کہ موجودہ تصادم کی کیفیت مسلمانوں پر مسلط کی گئی ہے اور ان کے پاس اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ وہ اس کا سامنا کریں۔ سینیٹر پروفیسر خورشید احمد نے اپنی گفتگو کے آغاز میں اس رائے کی تائید کی کہ مغرب کو ایک اکائی نہیں سمجھنا چاہئے اور

وہاں موجود آراء کے تنوع کو پیش نظر رکھنا چاہیے، تاہم ان کا خیال تھا کہ اس رائے کو اس تحفظ کے ساتھ قبول کرنا چاہیے کہ اس وقت دو مختلف تہذیبی نظام ہائے فکر موجود ہیں، یعنی الہامی اور غیرالہامی۔ اس اعتبار سے دونوں اپنی اپنی جگہ ایک اکائی ہیں۔

پروفیسر خورشید احمد صاحب نے موضوع زیر بحث کے حوالے سے جن دیگر پہلوؤں کو نمایاں کیا، انھیں ہم نکات کی صورت میں کچھ اس طرح بیان کر سکتے ہیں:

☆ ''مغرب'' کو ایک جغرافی وحدت سمجھنا درست نہیں۔ یہ اصلاً ایک اسلوب زندگی کا عنوان ہے۔ اسی طرح اسلام اپنے پیغام میں عالمگیر ہے، تاہم اسلام کو

"مغرب" کو ایک جغرافی وحدت سمجھنا درست نہیں۔ یہ اصلاً ایک اسلوب زندگی کا عنوان ہے۔ اسی طرح اسلام اپنے پیغام میں عالمگیر ہے، تاہم اسلام کو ایک عالمگیر قوت بننے کے لیے ایک جغرافی بنیاد چاہیے۔ لیکن اس کا پیغام بہرحال کسی جغرافیہ میں قید نہیں ہے۔

ایک عالمگیر قوت بننے کے لیے ایک جغرافی بنیاد چاہیے۔ لیکن اس کا پیغام بہرحال کسی جغرافیہ میں قید نہیں ہے۔

☆ مسلمانوں کو درپیش مسئلہ ہمہ جہتی ہے۔ یہ تہذیبی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ معاشی، سیاسی اور سماجی بھی ہے جس کا دائرہ فنون و آرٹ تک پھیلا ہوا ہے۔

☆ سیاسی غلبہ کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتا۔ آج یہ امریکا کو حاصل ہے، کل یورپ کا غلبہ تھا اور اس سے پہلے ہم سیاسی طور پر غالب رہے۔ کوئی تجزیہ کرتے وقت ہم اس پہلو سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ جہاں تک موجودہ حالات کا تعلق ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج مغرب کو تہذیبی غلبہ حاصل ہے۔

☆ مسلمانوں کو منصب شہادت پر فائز کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھیں دنیا کے سامنے حق کی شہادت دینی ہے۔ یہ شہادت قولی بھی ہے اور عملی بھی۔ اس اعتبار سے مسلمان ایک داعی قوم ہے۔ دیگر اقوام کے ساتھ اس کا تعلق داعی اور مدعو کا ہے۔ جب مسلمان ایک صاحب دعوت قوم ہے تو پھر کوئی قوم اس کی دشمن نہیں ہو سکتی۔

☆ تصادم ایک غیراسلامی تصور ہے۔ دیگر اقوام کے ساتھ ہمارے تعلق کی صحیح اساس مکالمہ ہے۔ مکالمہ، دعوت اور پھر اس راہ میں فطری طریقے پر مسابقت بھی ہوگی، جس کے نتیجے میں تصادم کا امکان بھی ہے، لیکن ہم اس سے گریز کریں گے اور اس میں نہیں الجھیں گے۔

☆ مغرب سے مکالمہ کرتے وقت اسے سمجھنا ضروری ہے۔ مغرب میں ''ہم کون ہیں؟'' (Who are We?) جیسی کتابیں لکھی جا رہی ہیں، جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امریکی خود کو ایونجلیکل عیسائی سمجھتے ہیں۔ مغرب کو سمجھنے کے لیے اس بات کو بنیاد بنانا چاہیے۔ (یہ پروٹسٹنٹ عیسائیوں کا وہ گروہ ہے جو دوسروں کو عیسائی بنانے کی تبلیغ کرتا ہے اور اس کے افراد تبلیغ عیسائیت کے لیے ساری دنیا میں متحرک رہتے ہیں)۔

☆ مغرب کی ایک استعماری تاریخ اور نفسیات ہے، جس کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ یونانی فلسفہ انسانی غلامی کو قبول کرتا ہے اور اس میں نوآبادیاتی ذہنیت کارفرما رہی ہے۔ یہی معاملہ سلطنت کا تھا۔ پھر ہمارے سامنے بعد از نشأۃ ثانیۃ (Post-Renaissance) ماڈل ہے۔ اس کے بعد دنیا نے روس اور امریکا کا غلبہ دیکھا اور آج صرف امریکی غلبہ ہے۔ ہر سپرپاور اپنا عالمی تسلط قائم کرنا چاہتی ہے۔ برطانوی استعمار کا کہنا تھا ''ہم لہروں پر حکومت کرتے ہیں''۔

☆ اسلام طاقت بمعنی سیاسی قوت کے حصول کو ایک آلے کے طور پر ضروری سمجھتا ہے، تاہم طاقت اس کا مقصود نہیں ہے۔ اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کا نمونہ ہمارے سامنے ہے۔ اسلام میں اصلاً اہمیت اللہ سے تعلق کی ہے۔

☆ مغرب کے لیے اسلامی بنیاد پرستی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ اسلام ہے۔ ہنٹنگٹن نے اپنی کتاب میں واضح کیا ہے کہ اسلام اصل مسئلہ اس لیے ہے کہ مسلمان یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک طرف وہ برتر نظام زندگی رکھتے ہیں لیکن دوسری طرف وہ طاقت سے محروم ہیں، جس سے ان کے اندر کمزور ہونے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

پروفیسر خورشید احمد نے ہنٹنگٹن کی جس بات کا حوالہ دیا ہے وہ ان کے الفاظ میں کچھ اس طرح بیان ہوئی ہے:

The underlying problem for the West is not Islamic fundamentalism. It is Islam, a different civilization whose people are convinced of the superiority of their culture and are obsessed with the inferiority of their power. The problem for Islam is not the CIA or the U.S. Department of Defense. It is the West, a different civilization whose people are convinced of the universality of their culture and believe that their superior, if declining, power imposes on them the obligation to extend that culture throughout the world. These are the basic ingredients that fuel conflict between Islam and the West.

(مغرب کے لیے بنیادی مسئلہ اسلامی بنیاد پرستی نہیں ہے، یہ مسئلہ ایک مختلف تہذیب اسلام ہے، جس کے ماننے والے اپنی تمدنی برتری کے قائل ہیں لیکن اس کے ساتھ اپنی قوت کی کمتری کے احساس میں بھی مبتلا ہیں۔ اسلام کا مسئلہ سی آئی اے یا امریکا کا محکمہ دفاع نہیں ہے، یہ مغرب ہے، جو ایک مختلف تہذیب ہے اور جس کے ماننے والے اپنے تمدن کی عالمگیریت کے قائل ہیں۔ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ ان کی برتر قوت، جو اگرچہ زوال پذیر ہے، ان پر ذمہ داری عائد کرتی ہے کہ وہ اپنے کلچر کو ساری دنیا میں پھیلائیں۔ یہ وہ بنیادی اسباب ہیں جو اسلام اور مغرب کے اختلاف کے حوالے سے جلتی پر تیل کے مترادف ہیں۔)

☆ مسلمانوں کے لیے بھی اصل مسئلہ مغرب ہے، جو آج ایک تہذیب ہی نہیں ایک عسکری قوت ہے اور جو سیاسی بنیاد پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتی ہے۔ یہ بات مسلمانوں کے سوچنے کی ہے۔

☆ اسلام کسی تسلط اور زبردستی کا قائل نہیں۔ اللہ انسان کا خالق ہے۔ لیکن اس کے باوجود، اسلام کے نزدیک انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ چاہے تو اس حقیقت کا انکار کر دے۔ تصادم وہاں سے شروع ہوتا ہے، جب کوئی گروہ اپنی بات دوسرے پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔

مغرب میں سائنس کی برتری ہے۔ مسلمان اگر ترقی کرتے تو شاید انسانیت کو درپیش مذہب اور سائنس کا یہ تصادم ختم ہوسکتا تھا۔ اسلام اور مغرب میں دعوٰی (Thesis) اور جواب دعوٰی (Anti Thesis) کی نسبت ہے۔

☆ موجودہ حالات گہرے سوچ بچار کے متقاضی ہیں۔ تصادم نقصان دہ اور غلط ہے، لیکن بعض اوقات حالات انسان کو اس پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ایسے طریقے اختیار کرنا غلط ہے، جس سے تہذیب کو خطرہ لاحق ہو۔ تاہم یہ بات اہل مغرب بھی تسلیم کرتے ہیں کہ دہشت گردی ظلم کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ بات ہنٹنگٹن نے بھی لکھی کہ دہشت گردی طاقت ور کے خلاف کمزور کا ہتھیار ہے (Terrorism is the weapon against the powerful)۔ اسی طرح مغرب میں ایسی کتابیں لکھی جا رہی ہیں، جن میں اس حقیقت کو مانا گیا ہے کہ خودکش حملے یا دہشت گردی ظلم کی پیداوار ہیں، جیسے ''جیت کے لیے مرنا'' (Dying to Win) یا ''میرا جسم میرا ہتھیار'' (My Body My Weapon)۔

☆ یورپی یونین اصل میں عیسائی کلب ہے۔ افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کے بعد اسلامی بنیاد پرستی مغرب کا ہدف ہے۔

☆ اگر ہمیں مقابلہ کرنا ہے تو اس کے لیے قوت ضروری ہے۔ ہمیں مزاحمت اور سد جارحیت دونوں کی ضرورت ہے۔ یہ مرحلہ تیاری کا ہے۔ تصادم اگر ہم پر مسلط کیا جائے تو بھی ہمیں اس سے بچنا چاہیے، تاہم ہمیں شکست کا راستہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ ہم اللہ کے فضل سے ایک قوت ہیں اور ہمیں اس کا بھی احساس ہونا چاہیے۔ ہمیں معذرت خواہانہ رویہ نہیں اختیار کرنا چاہیے لیکن اس کے ساتھ حماقت اور خود پسندی سے بچنا چاہیے۔ دشمن کے نقشے کے مطابق جنگ میں کودنا حماقت ہے۔

☆ ہمارا مسئلہ صرف مغرب نہیں بلکہ داخلی مسائل بھی ہیں۔ ہمیں اپنی تعمیر پر توجہ دینی ہوگی۔ اس کے لیے تین کام ضروری ہیں:

۱- اخلاق کی بنیاد پر ریاست، معاشرہ اور فرد کی تعمیر۔

۲- علم اور ٹیکنالوجی میں درک پیدا کرنا۔ رسالت مآب ﷺ پر جو پہلی وحی نازل ہوئی، اس میں اللہ کے ساتھ تعلق، علم اور ٹیکنالوجی، تینوں کا ایک ساتھ ذکر ہے۔

۳- تہذیب کی تشکیل۔ اس کا دائرہ اخلاق، رسم و رواج، سیاست، ادارے اور فنون پر محیط ہے۔ اسی طرح اس کی تشکیل میں جغرافیہ، موسم، تاریخ کے ساتھ اقدار اور ایمان کا بھی اپنا کردار ہے۔ تہذیب شناخت ہوتی ہے اور یہی شناخت ہمارا بڑا مسئلہ ہے۔

☆ اخلاقی قوت کی اہمیت کو بھی اچھی طرح سمجھنا چاہیے۔ اخلاقی قوت کسی طرح بھی مادی قوت سے کم اہم نہیں ہے۔

☆ اسلام میں پورا داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ رویہ منافقانہ نہ ہو۔

پروفیسر خورشید احمد صاحب کے مفصل خطاب کے بعد سوال و جواب اور تبصروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ڈاکٹر طاہر امین نے گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے اصلاح احوال کے حوالے سے تین اہم باتیں کہیں:

۱- اس وقت امت مسلمہ کا سب سے بڑا بحران فکری ہے۔ نئی نسل کو صحیح راہنمائی میسر

نہیں ہے اور قوم ایک فکری انتشار میں مبتلا ہے۔ اس انتشار کے سبب ہم اپنی نئی نسل کو تیزی سے کھوتے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر طاہر امین نے اس ضمن میں انٹرنیٹ کی ایک گفتگو کا حوالہ دیا، جس میں ایک طالب علم نے کسی سے پوچھا ''مولانا مودودی کون تھے؟'' جواباً جو کچھ بتایا گیا وہ لاعلمی کا ایک شاہکار تھا، جس سے بجائے سوال کا جواب ملنے کے، اس طالب علم کی فکری پراگندگی میں مزید اضافہ ہوا۔ انہوں نے اسلامی نظریاتی کونسل کی ان کوششوں کا خیر مقدم کیا، جن کے تحت قوم اور ملت کو درپیش مسائل کو ایک کھلے ماحول میں زیر بحث لایا جا

> اسلام اور مغرب میں تصادم ناگزیر ہے اور اس کی ایک بنیادی وجہ ہے۔ اسلام آج الہامی علم وہدایت کا نمائندہ ہے جبکہ مغرب سیکولرزم کا۔ یہ دونوں زندگی کے بارے میں دو متضاد نقطہ ہائے نظر ہیں، اس لیے ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔

رہا ہے۔ انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس طرح کے فورم تعلیمی اداروں میں اور معاشرے میں تسلسل کے ساتھ منعقد ہونے چاہییں۔ یہ بحث ومباحثہ کی مجالس اس لیے ضروری ہیں کہ نوجوانوں میں بات چیت کا کلچر فروغ پائے کیونکہ ہم تشدد کے رجحانات کے باعث نئی نسل کو ضائع اور پامال کر رہے ہیں۔ آج ہمارے پاس ایسا لٹریچر موجود نہیں ہے، جو بین الاقوامی تعلقات اور اس نوعیت کے دیگر امور پر نئی نسل کی راہنمائی کر سکے۔

۲- پاکستان کے حوالے سے دیکھیے تو معاشرے اور ریاست کے مابین تصادم ہے۔ یہ تصادم گذشتہ آٹھ دس سال میں بہت نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے۔

۳- اصلاح احوال کے لیے ہمیں ایک ہمہ جہتی لائحہ عمل اختیار کرنا ہوگا، جو سیاست، معیشت اور سماج کے جملہ امور کو سامنے رکھتے ہوئے مرتب کیا گیا ہو۔ ڈاکٹر طاہر امین نے ایک انگریزی فلم کا حوالہ دیا، جس میں ایک حبشی مسلمان کو دکھایا گیا ہے، جو تلوار کے زبردست کمالات دکھاتا ہے۔ پھر ایک آدمی جدید سٹین گن کے ساتھ آتا ہے، تو اسے تمام کمالات کے ساتھ لمحہ میں ڈھیر کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا یہ تھا کہ جدید دور میں جو تبدیلیاں آ چکی ہیں، ان سے صرف نظر مسلمانوں کے لیے شدید نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر خالد مسعود نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے دو باتوں کی طرف توجہ دلائی۔ ایک تو یہ کہ ہم خواہی نخواہی عالمگیریت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہم اسے امکان سمجھنے کے بجائے خطرہ سمجھ رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس سوچ کو تبدیل کیا جائے۔ ڈاکٹر خالد مسعود کی اس بات کو بھارت کے ممتاز عالم دین مولانا وحید الدین خان نے اس طرح بیان کیا ہے کہ دنیا میں ہماری سیاسی سلطنت ختم ہو گئی، لیکن موجودہ حالات نے ہمارے لیے یہ مواقع فراہم کر دیے ہیں کہ ہم اپنی دعوہ ایمپائر ضرور کھڑی کر سکتے ہیں۔ دوسری اہم بات ڈاکٹر صاحب کے نزدیک یہ تھی کہ ہم دنیا کو اچھا یا برا، غلط یا صحیح دو خانوں میں بانٹتے ہیں۔ یہ انداز فکر بھی اسلامی نہیں ہے۔ قرآن مجید دیگر مذاہب کو غلط نہیں کہتا، وہ یہ کہتا ہے کہ یہ مذاہب اصلاً درست تھے لیکن پھر غلط راستے پر چل پڑے۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا یہ تھا کہ ہمیں مغرب کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے اور اپنی اصلاح کا لائحہ عمل طے کرتے وقت ان دو باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ آج مسلمان معاشروں میں وہ فضا موجود نہیں ہے، جس میں ہم ایک ہمہ جہتی سوچ کو آگے بڑھا سکیں اور مذکورہ بالا دو نکات کی روشنی میں غور وفکر کر سکیں۔ ڈاکٹر محسن نقوی نے مغرب کے حوالے سے سائنس اور مذہب میں تصادم کی تاریخ کا حوالہ دیا اور یہ رائے دی کہ مغرب میں سائنس کی برتری ہے۔ مسلمان اگر ترقی کرتے تو شاید انسانیت کو درپیش مذہب اور سائنس کا یہ تصادم ختم ہو سکتا تھا۔ ان کا کہنا یہ بھی تھا کہ اسلام اور مغرب میں دعویٰ (Thesis) اور جواب دعویٰ (Anti Thesis) کی نسبت ہے۔ ان کے خیال میں مسلمان معاشروں کے لیے جدید سوچ کی ضرورت ہے اور آنکھیں بند کر کے صرف ماضی کی طرف دیکھنا ہمارے مسائل کے حل کے لیے کافی نہیں۔

پروفیسر خورشید صاحب کا خیال تھا کہ ماضی کا مکمل رد ایک نازک مسئلہ ہے، جس پر سنجیدہ غور وفکر کی ضرورت ہے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے حالات مشکل ضرور ہیں لیکن مایوس کن نہیں۔ موجودہ حالات یہ بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کا اجتماعی ضمیر درست جگہ پر کھڑا ہے۔ تاریخ کا سبق یہ ہے کہ کمزور ہمیشہ کمزور نہیں رہتا اگر وہ اسے دل سے قبول نہ کرے۔ آج امید غالب ہے اور ہمیں مزاحمت اور سد جارحیت کے اصول پہ حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے۔ ریاست اور معاشرے کے تصادم کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ ریاست معاشرے کی تربیت کرتی ہے اور جواباً معاشرہ نگرانی کرتا ہے۔ یہ فکر انگیز نشست دو گھنٹے سے زائد جاری رہی۔ اس سے مکالمہ کا وہ عمل آگے بڑھا، جو آج ہمارے معاشرے کی ایک ناگزیر بنیادی ضرورت ہے۔ اگر مختلف نقطہ ہائے نظر کے حاملین یہ سوچ کر ایک جگہ بیٹھیں کہ وہ سب ایک امت کے رکن اور اس کے مفاد میں سوچتے ہوئے اختلاف کر رہے ہیں، تو اس سے معاشرے میں وہ صحت مند فکری ارتقا سامنے آئے گا، جو اس کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ یہ گفتگو اگرچہ اس سوالنامے کے عین مطابق تو نہیں ہوئی، جو معزز شرکا کو ارسال کیا گیا تھا لیکن مختلف زاویوں سے وہ امور اس گفتگو میں زیر بحث آئے ہیں، جو سوالنامے میں اٹھائے گئے تھے۔ اہل علم نے جس طرح اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر اس موضوع پر سوچا اور پھر اظہار خیال کیا،

ڈاکٹر خالد مسعود نے اس پر ان کا شکریہ ادا کیا اور اسے ایک نیک شگون قرار دیا کہ ہمارے اہل علم ملت کو درپیش فکری مسائل پر غور وفکر کرنے اور ان کے حل کے متمنی ہیں۔

ایک مذاکرہ

مغرب میں اہل اسلام

مغرب میں رہنے والے مسلمانوں کی جانب سے اکثر استفسارات اسلامی نظریاتی کونسل کو موصول ہوتے رہتے ہیں۔ ان استفسارات کی تعداد ۹/۱۱ کے بعد قابل ذکر حد تک بڑھ گئی ہے۔ حال ہی میں، آسٹریلیا کی ایک مسلم آرگنائزیشن کی طرف سے ایک قسم کا دردناک مراسلہ موصول ہوا، جس میں کہا گیا ہے کہ مغربی میڈیا اور دانشور اسلام کے بارے میں بعض سوالات کررہے ہیں، جن کے جوابات علماء لازماً دیں۔ فی الحقیقت یہ سوالات نئے نہیں ہیں لیکن موجودہ تناظر میں بالخصوص دہشت گردی کے مسئلے نے ان سوالات کو پیچیدہ بنا دیا ہے۔ مسلمانوں کی جانب سے دو قسم کے جوابات سامنے آئے ہیں۔ ایک جواب یہ ہے کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف محض الزامات ہیں اور اسلام امن، مذہبی آزادی اور پرامن بقائے باہمی کا مذہب ہے۔ دوسرا مکتبۂ فکر اس تاریخی تجربے اور ان اسلامی تعلیمات کا حوالہ دیتا ہے، جو اسلام کے دشمنوں پر اندھے اعتماد کی اجازت نہیں دیتیں۔ اسلام سے خوفزدہ لوگ جنھیں مغربی میڈیا میں نمائندگی حاصل ہے، وہ مسلمانوں کے اس ردعمل سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور مغربی ممالک میں مسلمان شہریوں کی وفاداری کو چیلنج کرتے ہیں۔ اس تنظیم نے کونسل سے اپیل کی ہے کہ کونسل اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرے اور اس بحران کے بارے میں مسلمانوں کی جانب سے ایک مناسب جواب وضع کرنے میں مدد کرے۔

کونسل نے اس موضوع پر ۲۶ ستمبر ۲۰۰۵ء کو ایک پینل مباحثہ منعقد کرایا۔ ڈاکٹر منظور احمد، ڈاکٹر خالد علوی اور جناب محبوب صدا پینل میں شامل تھے۔ ڈاکٹر منظور احمد، رکن اسلامی نظریاتی کونسل، ایک معروف مفکر اور فلسفی ہیں، جنہوں نے کئی سال یو کے اور یو ایس اے میں تعلیم حاصل کی اور وہاں درس وتدریس کے شعبہ سے منسلک رہے ہیں اور اس موضوع پر ان کی کافی تحریریں موجود ہیں۔ ڈاکٹر علوی، دعوۃ اکیڈمی، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد میں ڈائریکٹر جنرل ہیں، انہوں نے یو کے میں مسلم برادری کے ساتھ مل کر کام کیا ہے اور اس قسم کے مسائل سے ان کا واسطہ رہا ہے۔ جناب سادا کرسچین سٹڈی سنٹر، راولپنڈی کے ڈائریکٹر ہیں اور کئی سالوں سے کرسچین مسلم تعلقات کے لیے کام کررہے ہیں۔ مباحثہ میں نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد خالد مسعود چیئرمین کونسل نے انجام دیے۔ نقل مکانی، اقلیتوں اور عالمگیر اخلاقیات کے مسائل پر ان کی نظریاتی تحریریں بہت معروف ہیں۔ کونسل کے ارکان جسٹس (ر) حاذق الخیری، حاجی محمد حنیف طیّب، مولانا عبداللہ خلجی، جسٹس رشید احمد جالندھری، جسٹس (ر) منیر احمد مغل، سید دامن علی شاہ، سید ذاکر حسین شاہ سیالوی، ڈاکٹر سید بی بی اور علامہ عقیل ترابی نے مباحثہ میں شرکت کی۔ ڈاکٹر خاکوانی، علامہ اقبال یونیورسٹی اور جناب خالد رحمان، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز اور دیگر شرکاء نے بھی مباحثے میں حصہ لیا۔

آسٹریلیا سے بھیجے گئے اس خط میں کئی سوالات اٹھائے گئے ہیں، جو مندرجہ ذیل مسائل سے متعلق ہیں:

۱۔ جہاد اور اسلام کا پھیلاؤ

۲۔ مذہبی آزادی اور ارتداد کی سزا

۳۔ غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت، مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان معاہدوں کی جائز حیثیت، اور غیر مسلم ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کی اپنے میزبان ممالک سے وفاداری کا مسئلہ۔

ڈاکٹر علوی نے وضاحت کی کہ یہ سوالات نئے نہیں ہیں لیکن موجودہ مخصوص عالمگیر تناظر کو سمجھے بغیر صحیح طور پر ان کی اہمیت واضح نہیں ہوتی۔ مغربی ممالک عالمگیر قیادت کا ایک مخصوص ایجنڈا رکھتے ہیں، جو ان کے یقین کے مطابق تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔ ان کے مطابق ان کے سیاسی ایجنڈا کی تکمیل کے راستے میں واحد رکاوٹ مسلمانوں کی طرف سے ہے۔ لہٰذا مغرب اسلام اور مسلمانوں کو شعوری، سماجی اور تہذیبی سطح پر نشانہ بنا رہا ہے۔ ان کا یہ اعتقاد ہے کہ جب تک اسلام باقی ہے، عالمگیریت کا مکمل حصول ناممکن ہے۔ نوآبادیاتی پھیلاؤ کے زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ مقابلہ کے وقت سے یورپ کو اسلام کی طرف سے ایک سخت قسم کے ثقافتی اور شعوری چیلنج کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اسلام کے بارے میں آج کل جو سوالات اٹھائے جا رہے ہیں، درحقیقت یہ سوالات پہلی مرتبہ اس وقت اٹھائے گئے تھے، جب برطانیہ کے زیر تسلط ہندوستان میں جہاد اور ارتداد کے سوالات زیر بحث تھے۔ سرسید، چراغ علی اور دیگر ایسے مسلمان تھے، جنہوں نے جہاد کی دوبارہ تشریح کا مطالبہ کیا تھا۔ اسی طرح ارتداد کا مسئلہ مسلسل زیر بحث رہا ہے۔ پاکستان میں مولانا مودودی، جسٹس ایس اے رحمان اور دیگر نے مختلف نقطہ ہائے نظر سے اس مسئلے کا تجزیہ کیا ہے۔ ان مسائل اور مماثل نوعیت کے دیگر مسائل پر بحث جاری رہتی ہے کیونکہ مفہوم کی مختلف صورتوں کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان اختلاف رہا ہے۔ کیا یہ اسلامی یا سیکولر ہونا چاہیے؟ مغرب کا بنیادی نظریہ سیکولر ہے۔ اسلام کا بنیادی نظریہ اسلامی روایت سے واضح ہوتا

ہے۔ اس بنیادی نظریہ کے بغیر کوئی حل ممکن نہیں ہے۔ اپنا بنیادی اصول اور نظریہ واضح کرنے کے بعد ڈاکٹر علوی نے ان مسائل پر اسلامی موقف واضح کرنے کے لیے اسلامی تاریخ میں موجود بعض حقائق پر روشنی ڈالی۔ اسلام پہلا اور واحد مذہب ہے جس کا دوسرے مذاہب کے بارے میں موقف واضح ہے۔ اسلامی سماجی نظام کی بنیاد اسلام ہے۔ پیغمبر ﷺ نے امتیاز کا اصول اور اسلامی معاشرے کا معیار وضع فرمایا۔ جو بات مسلمانوں کو بت پرستوں سے اور اہل کتاب کو یقین نہ کرنے والوں سے ممتاز کرتی ہے، وہ محمد ﷺ کی رسالت پر یقین ہے اور اس کی وضاحت سورۃ البینۃ میں تفصیل کے ساتھ کر دی گئی ہے۔ مسلمانوں کی جماعت اس امتیاز پر مبنی تھی اور یوں محمد ﷺ کی پیغمبری کے لیے دعوت کی جماعت (دعوۃ) بیان کی گئی ہے۔ بطور مشنری کسی معاشرے کی مندرجہ ذیل دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت ہو سکتی ہے۔ پہلی صورت میں اکثریت دعوت سے انکار کرتی ہے اور دوسری صورت میں اقلیت دعوت کی مزاحمت کرتی ہے۔ یوں، منکرین (غیر مسلم) کے ساتھ تعلق سے دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت پیدا ہوتی ہے: کمزوری کی صورت، جس میں اکثریت منکرین کی ہوتی ہے اور مسلمانوں کے غلبہ کی صورت۔ اسی تناظر میں مسلمانوں کی تشریح یا تو بطور اکثریتی یا بطور اقلیتی جماعت کی جا سکتی ہے۔

اسی طرح غیر مسلم یا تو امن چاہتے ہیں یا جارح ہوتے ہیں۔ تاریخی طور پر تمام مشنری تحریکوں کو معاشرے کے سربراہان کی جانب سے جارحانہ انکار کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ قرآن اس جارحانہ سیاسی مخالفت کو 'الملأ' کہتا ہے اور اس قسم کے لوگ کبھی بھی امن نہیں چاہتے۔ اسلام کا تجربہ مختلف نہیں تھا۔ قریش کی مخالفت سیاسی اور جارحانہ تھی۔ اسلامی اصطلاح میں ہم اسے متشدد کفر کہہ سکتے ہیں۔ عام غیر مسلم آبادی کے ساتھ امن اور دوستی کی بات کی جا سکتی ہے لیکن جارح دشمنوں کے ساتھ نہیں۔ وہ صرف قوت اور طاقت کی زبان سمجھتے ہیں کیونکہ یہ ان کا معمول ہوتا ہے۔

اب پینل مباحثہ کے لیے سوال کے جواب کی طرف آتے ہیں۔ اوپر دی گئی صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں اور دیگر لوگوں کے درمیان تعلق کو دو طرح سے بیان کیا گیا ہے: کمزوری کی صورت اور غلبہ کی صورت۔ جب مسلمان کمزور ہوں تو تین اقدار کو مدنظر رکھتے ہوئے انہیں دوسروں کے ساتھ اپنے تعلقات کی وضاحت کرنی چاہیے: اسلام کی دعوت، صبر اور ثابت قدمی اور میزبان معاشرے کی جانب سے وضع کی گئی حدود سے تجاوز کیے بغیر زندگی گزارنا۔ بہ الفاظ دیگر مسلمان اسلام کے لیے اپنا مشن جاری رکھیں، جہاں رہتے ہیں ان ممالک کے قوانین کی خلاف ورزی نہ کریں اور صبر کے ساتھ مشکلات کا سامنا کریں۔ اس کے برعکس جب مسلمان طاقت میں ہوں تو انہیں برداشت اور آزادی اظہار کے اقدار کی پابندی کرنی چاہیے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان ماضی اور حال میں بھی دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں دوسروں کو زیادہ برداشت کرتے آرہے ہیں۔ مغربی اقوام جو روشن خیالی اور جدت کی علمبردار ہیں، اپنے نوآبادیاتی دور میں بے مثال عدم برداشت کا مظاہرہ کر چکی ہیں۔

آزادی اظہار بشمول مذہبی آزادی کے اصول کا جہاں تک تعلق ہے، اسلامی قانون اسلامی ریاست میں کسی غیر مسلم کی قانونی حیثیت کے مطابق اسے آزادی کی اجازت دیتا ہے۔ فقہاء نے اس قانونی حیثیت کی وضاحت اسلامی ریاست کے تحت آنے والی کسی غیر مسلم جماعت کی بنیاد پر کی ہے۔ ان کے حقوق فتح اور معاہدہ کی صورت میں مختلف ہوتے ہیں۔ ایک تیسری قسم کی حالت بھی ہو سکتی ہے، جس میں غیر مسلم برادری نہ تو مفتوح ہوتی ہے اور نہ ہی زیر معاہدہ ہوتی ہے۔ اس تیسری صورت میں حقوق فتح اور معاہدہ کی حالت جیسے نہیں ہو سکتے۔ اسلام غیر مسلم ریاستوں سے بدلے میں اسی طرح کے سلوک کی توقع رکھتا ہے۔ مغرب میں مسلمانوں کو وہی آزادی ملنی چاہیے، جو مسلم ممالک میں غیر مسلموں کو ملی ہوئی ہے۔ جہاں تک برطانیہ میں مسلمانوں کا تعلق ہے، تو اس ملک میں مسلمان نوجوانوں کی صورت حال سمجھنا ضروری ہے۔ برطانوی معاشرے میں مسلمانوں کو ڈھالنے کی کوششیں، نسلی امتیاز، حقارت، تعصب اور نفرت سے کبھی بھی پاک نہیں رہی ہیں۔ شناخت کا مسئلہ مسلمان نوجوانوں کے لیے اہم بن گیا ہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ سیکولر اصولوں پر مبنی معاشرے میں ان کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ نسلی تعصب مسلمان نوجوانوں کے ساتھ امتیازی سلوک کرنے پر منتج ہوا ہے۔ پولیس ہر مسلمان نوجوان کا ریکارڈ رکھتی تھی اور انہیں بنیادی انسانی حقوق حاصل نہیں تھے، جو دوسروں کو حاصل تھے۔ نتیجتاً مسلمان نوجوانوں کو ایک سکیم کے تحت انتہا پسند بنایا گیا۔ جتنا وہ اپنی شناخت کا مطالبہ کرتے اسٹیبلشمنٹ کی جانب سے انہیں اتنا ہی تنہا کیا گیا۔ اب اقلیت کی حیثیت سے مسلمان مذہبی آزادی، مذہبی شناخت اور اپنے مذہبی قوانین پر عمل کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اسے کبھی بھی غداری کا نام نہ دیا جائے۔

> اسلام کے بارے میں جو سوالات اٹھائے جا رہے ہیں، یہ اس وقت بھی اٹھائے گئے تھے، جب برطانیہ کے زیر تسلط ہندوستان میں جہاد اور ارتداد کے سوالات زیر بحث تھے۔

ارتداد اور مسلمانوں اور دیگر کے درمیان دوستی کے مسئلہ پر مزید مطالعے کی ضرورت ہے۔ موجودہ صورت حال نے فقہاء کے نظریات میں بعض تفصیلات کا اضافہ کیا ہے۔ ان پر مزید مباحثے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر علوی نے ان دونوں مسائل پر اپنا تجزیہ پیش کیا۔ ارتداد کی سزا کے مسئلہ کے بارے میں انہوں نے تجویز دی کہ خاموشی کے ساتھ تبدیلی مذہب اور جارحانہ اقدام کے طور پر تبدیلی مذہب کے درمیان فرق کیا جانا چاہیے۔ جہاں تک تعلقات کے مسئلے کا تعلق ہے تو ذاتی اور ریاستی تعلقات کے درمیان فرق ہونا چاہیے۔ معاہدات کی بنیاد بے اعتمادی نہیں ہو سکتی۔ وفاداری کے مسئلے کے بارے میں انہوں نے رائے دی کہ غیر مسلم ممالک میں مسلمان بطور شہری ایک معاہدہ کے تحت رہ رہے ہیں اور بطور

مسلمان ان کے معاہدوں کی پابندی کرنا ان پر لازم ہے۔ انہوں نے اپنی بحث اس بات پر ختم کی کہ اسلام میں تمام معاہدات اور تعلقات پر عمل درآمد اللہ اور پیغمبرﷺ سے وفاداری کے اصول کے مطابق ہوتا ہے اور اس اصول سے خلاف ورزی پر مبنی کوئی تعلق جائز نہیں ہے۔

ڈاکٹر منظور احمد نے کہا کہ اس پینل مذاکرے کا مقصد دور حاضر کے مسائل کا جواب تلاش کرنا ہے۔ پینل کے انعقاد کا مقصد ان استفسارات کے پیش نظر اسلام کے دفاع کے لئے دلائل کی تلاش نہیں۔ درحقیقت ہمارے پاس یہ ایک موقع ہے کہ ہم اپنی حالت سمجھنے کی کوشش کریں۔ دفاعی دلائل سے معذرت خواہانہ رویے کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس سے دوسروں کے ساتھ مکالمے کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے۔ مکالمہ کے بنیادی لوازمات یہ ہیں کہ دونوں فریق اپنی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لینے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہوں۔ زیر بحث استفسارات زندگی کے حقیقی مسائل پر مبنی ہیں۔ ان مسائل کو صرف مجرد اصولوں اور عقیدوں تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ انسان صرف عمومی قوانین اور اصولوں پر زندگی نہیں گزار سکتے۔ مثال کے طور پر مذہبی آزادی کا مسئلہ ہی لے لیجئے۔ کوئی بھی مذہبی آزادی کے مفہوم کو سادہ اور آسان الفاظ میں نہیں بیان کر سکتا۔ مذہبی آزادی کا تعلق مذہب پر عمل کرنے سے جوڑنے کی ضرورت ہے۔ مذہبی آزادی کے مسئلے کا تعلق نہ صرف ایک مذہب کے پیروکاروں کا دوسرے مذہب کے پیروکاروں کے ساتھ سلوک سے ہے بلکہ مذہبی آزادی کا تعلق ایک ہی مذہبی روایت کے اندر موجود مختلف مسالک کے ماننے والوں کا ایک دوسرے کے ساتھ سلوک سے بھی ہے۔ اگر مسلمان دوسروں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کے مذہب کو اختیار کر لیں تو پھر انہیں بھی یہی آزادی مسلمانوں کو دینی چاہیے کہ وہ اگر چاہیں تو اپنا مذہب تبدیل کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ارتداد کے مسئلے پر بحث جاری ہے۔ سادہ معنوں میں یہ مسئلہ تجزیہ طلب ہے۔ ایسے سیاسی حل ناقابل عمل ہوتے ہیں جن کی رو سے مسلمانوں کے لئے آزادی کا مفہوم غیر مسلموں کے لئے آزادی کے مفہوم سے مختلف ہوتا ہے۔ ہم غیر مسلم معاشروں میں مسلمانوں کے لئے حقوق کی بات کیسے کر سکتے ہیں اگر ہم غیر مسلموں کو وہی حقوق اپنے معاشروں میں دینے کے لئے تیار نہیں۔

ایک ہی مذہبی روایت کے اندر مذہبی آزادی کا مسئلہ اور بھی زیادہ پیچیدہ ہے۔ کسی مسلمان کے عقیدے کے متعلق فیصلہ دینے کا حق اور اختیار کسے حاصل ہے؟ کسی مسلمان کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کرنے کا کیا جواز ہے؟ فتاویٰ عمومی طور پر کسی خاص عقیدے کی جزئیات سے متعلق ہوتے ہیں، ان کا تعلق کسی مذہب کے بنیادی اصولوں سے نہیں ہوتا۔ ان جزئیات پر بحث کی گنجائش ہوتی ہے کیونکہ ان جزئیات میں آراء کا اختلاف ہو سکتا ہے۔ ان جزئیات میں آراء کے اختلاف ہونے کی وجہ سے کسی کو کافر کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے؟ ان معاملات پر سنجیدہ عالمانہ بحث کی ضرورت ہے۔

اس قسم کے عقاید ایک ایسے اصول پر مبنی ہیں، جو بحث طلب ہے۔ جب ہم اسلامی توضیحات کی بات کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ فکر اسلامی کے اندر بے شمار مکاتب فکر مثلاً الٰہیاتی توضیح، اشعری، معتزلی اور فلسفیانہ توضیحات موجود ہیں۔ اسلامی قانون کے بارے میں بھی مختلف فقہوں کے اندر مختلف توضیحات ملتی ہیں۔ ان توضیحات میں سے ایک توضیح قیاس ہے جو استنباطی اور تمثیلی ہوتا ہے۔ اس توضیح میں ایک خامی یہ ہے کہ اس میں قرآن و سنت کے ہر متن کو قیاس کے لیے ایک مضبوط بنیاد تصور کیا جاتا ہے لیکن درحقیقت قانون دان/مفتی (Jurist) اس متن کا انتخاب کرتا ہے جو قیاس کے لئے بنیاد کا کام دے سکے۔ اس سے بحث چلتی ہے کہ منتخب کردہ متن کے مفہوم کے تعین کا طریقہ کیا ہوگا اور مذکورہ مفہوم کا تعین کون کرے گا۔ فکر اسلامی متنوع توضیحات سے مزین ہے۔ دور حاضر میں مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان توضیحات کا مطالعہ کریں اور موجودہ دور کے درپیش مسائل کے حل کے لئے نئی توضیحات کے ساتھ سامنے آئیں۔ ماضی میں علماء نے اپنے زمانے میں اپنے مسائل کے حل کے لئے توضیحات پیش کیں اور ان کو قطعاً یہ توقع نہیں تھی کہ ہم ان کی پیش کی گئی توضیحات سے وابستہ رہیں۔

جناب محبوب صدا نے اس حقیقت پر افسوس کا اظہار کیا کہ اکیسویں صدی کا پوری دنیا میں امن کی صدی کے طور پر استقبال کیا گیا مگر اس کا آغاز انتہائی خوفناک تباہیوں سے ہوا۔ ایک سو سے زائد ممالک جنگوں میں مصروف ہیں حتیٰ کہ کئی ممالک سرد جنگ کے نتیجے میں تباہ ہو گئے ہیں۔ انسانیت ظلم کا شکار ہے۔ پریشان کن بات یہ ہے کہ بعض لوگ دہشت اور نفرت پھیلانے کے لئے جواز تلاش کر رہے ہیں۔ بعض لوگ اسے تہذیبوں کے ٹکراؤ کا نام دے کر اطمینان محسوس کر رہے ہیں اور بعض لوگ اسے

مفادات کی جنگ کا نام دیتے ہیں۔ یہ تمام جواز انتقام، عدم رواداری اور عاقبت نااندیشی کے رویوں کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ کبھی بھی کوئی مذہب ایسی اقدار کی تعلیمات نہیں دیتا مگر عملی طور پر یہ اقدار بھلا دی جاتی ہیں۔

اشد ضروری ہے کہ ہم ان وجوہات کا جائزہ لیں جن کی وجہ سے ہم یہ اقدار بھول جاتے ہیں۔ ہمیں اپنے سکولوں میں درسی کتابوں کا جائزہ لینا ہوگا۔ مذہبی رواداری کے متعلق کہانیوں کی بجائے ان کتابوں میں دیگر تفصیلات پر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ برطانیہ میں بھی عام لوگ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ مسلمان دہشت گرد ہیں۔ مسئلہ اصل حقیقت کو ڈھونڈنے کا ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کا فرض ہے کہ وہ اس بات کا جائزہ لے کہ خرابی کہاں ہے۔ کونسل

یکسانیت پر؟ اسلام اور مغرب کے فرق کو سمجھنے کے لیے اختلافی امور توجہ کے مستحق ہیں۔ اس ضمن میں ہمیں ان افراد اور گروہوں کی نشاندہی کرنا ہوگی جو مد مقابل (OTHER) کے حوالے سے اپنی شناخت کا اظہار کرتے ہیں۔ انیسویں صدی کا نصف ثانی، یورپی استعمار کا نقطۂ آغاز ہے جب اس نے ایک تہذیبی مشن کے ساتھ نوآبادیاتی منصوبے پر مسلسل عمل شروع کیا۔ اس نے مسلمانوں اور دیگر تہذیبوں کو اس منصوبے کے حوالے سے اپنا مخاطب بنایا۔ یہ باہمی شناخت کا ایک مسلسل حصار ہے۔

۳۔ کیا مغرب جوہری طور پر مذہب مخالف ہے؟

اس بات کے پیش نظر کہ مغرب کی کوئی متعین اور پائیدار تعریف ہمارے سامنے نہیں ہے، اس سوال کا جواب مشکل ہے۔ مغرب عمومی مفہوم میں مذہب مخالف نہیں ہے۔ لیکن یہ دیگر ہر شے کی طرح، مذہب کو بھی ہمیشہ مزید تحقیق اور غور وفکر کا موضوع سمجھتا ہے۔ یہاں کوئی چیز اتنی مقدس نہیں ہے کہ اس پر نقد نہ کیا جاسکے۔ اس کے باوجود یورپی تاریخ کے بڑے انقلابات میں مذہب نے ایک محرک اور بنیادی جذبے کا کردار ادا کیا ہے۔ سرمایہ داری کو مذہب سے غیر متعلق کیا جاسکتا ہے نہ نوآبادیات کو۔

دوسری طرف غلامی کا خاتمہ اور شہری حقوق کا تصور بھی مذہب سے وابستہ ہے۔ یورپ، مذہب کی ادارہ بندی اور قوت کی طویل تاریخ کے باعث، امریکا کی نسبت زیادہ مذہب دشمن ہے۔ امریکا میں تو مذہب ریاست اور معاشرے کی تشکیل کا ایک بنیادی پتھر ہے۔

۴۔ مغربی تہذیب کی کثیر المدنی شناخت میں مسلمانوں کا حصہ کتنا ہے؟

مسلمانوں نے اپنی موجودگی سے اس کثیر المدنیت میں اضافہ کیا ہے۔ انہوں نے مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لیے احترام اور مساوات کا مطالبہ کیا ہے اور مغربی معاشروں میں اپنی تنظیم کو منوایا ہے۔ یہ آسان کام نہیں تھا کیونکہ اس راستے میں بہت سے شہروں اور معاشروں میں خوف اور تعصبات کی رکاوٹیں تھیں۔ بہت سے یورپی شہروں میں مساجد کی تعمیر کے لیے اجازت کے حصول میں کئی سال لگ گئے۔ تاہم ان معاشروں میں موجود جمہوری اداروں اور روایات نے مسلمانوں کی مدد کی۔ یہاں مسلمانوں کی ثابت قدمی سے شناخت اور کلچر کے مفاہیم میں وسعت پیدا ہوئی۔ امریکا میں، جہاں مذہب کے بارے میں تعاون پر مبنی رویہ موجود ہے، اس نوعیت کی رکاوٹوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ یہاں بھی ۹ر ستمبر کے بعد اس حوالے سے نازک سوالات اٹھائے جا رہے ہیں کہ کثیر المدنیت میں مسلمانوں کا کیا حصہ ہے۔ یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ یہ صرف مسلمان نہیں ہیں جن کی وجہ سے یہ تحریک پیدا ہوئی۔ دیگر تہذیبی اور مذہبی گروہ، جیسے ہندو، افریقی عیسائی ہیں، وہ بھی شناخت اور کلچر کے بارے میں مغربی معاشروں کے تصورات پر اثر انداز ہوئے۔ ان مختلف تہذیبی رنگوں کی موجودگی سے متنوع تہذیبی نتائج سامنے آئے۔ بعض نے نئے کلچروں کو قبول کیا اور بعض نے نہیں۔

اس اعتراف کے باوجود یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اس ضمن میں مسلمانوں کا حصہ خود غرضی اور گروہی مفاد کے تابع رہا ہے۔ انہوں نے اس حوالے سے میزبان مغربی

۴۔ مغرب کے اہل علم اسلام کے بارے میں بالعموم یک زبان ہیں اور وہ اسے اپنے لیے ایک بڑا خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ البتہ بعض مغربی دانشور اسلام کے رہنما اور ناقابل شکست اصولوں کی بنیاد پر (مثلاً مساوات نسل انسانی) اسے ایک ابھرتا ہوا مذہب بھی قرار دیتے ہیں۔ مگر ایسے علماء خال خال ہیں۔ زیادہ تر مغربی علماء مسلمانوں کو بنیاد پرست، دہشت گرد اور نہ جانے کیا کیا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ وہ اصطلاحیں ہیں، جو خود ان کے اہل علم نے اپنے بعض گروہوں کے لیے وضع کی تھیں۔ مگر اب وہ یہی اصطلاحیں، مسلمانوں کے لیے بلاتکلف استعمال کر رہے ہیں۔

> اسلام اور مغرب کے مفادات باہم متصادم ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب اسلام کا تہذیبی تشخص، مغرب کے تہذیبی تشخص سے جداگانہ ہے تو لامحالہ ان کے باہمی مفادات بھی ایک دوسرے سے مختلف اور متصادم ہوں گے۔

۵۔ ملٹی کلچرل تشخص دراصل نیچرل فنومینا کی ایک خوبصورت تعبیر ہے۔ ہر کلچر، دوسرے کلچر پر اپنا اثر ڈالتا ہے۔ غالب، مضبوط اور طاقت ور اقوام کا کلچر اس فطری اصول کے مطابق ہر مغلوب، کمزور اور ماتحت اقوام میں در آتا ہے۔ اسلام کے دور عروج میں اسپین اور جنوبی یورپ کے متعدد ممالک، مسلم حکومتوں کے زیر اثر رہنے کے باعث مسلم کلچر سے متاثر ہوئے، خصوصاً اسپین اور پرتگال میں سات سو سالہ حکمرانی کے نتیجے میں اسلام نے وہاں کے باسیوں پر بہت زیادہ اثر ڈالا۔ اس طرح یونان، البانیہ اور بوسنیا میں بھی ترکوں کے اثرات قائم ہوئے اور یوں مغرب میں متعدد کلچر پیدا ہوئے۔ اس تعدد میں کچھ ہاتھ تو اسلامی تعلیمات کا ہے اور کچھ مسلمانوں کا اور بہت کچھ ان کا اپنا بھی ہے۔

۶۔ جی ہاں! اسلام اور مغرب کے مفادات باہم متصادم ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب اسلام کا تہذیبی تشخص، مغرب کے تہذیبی تشخص سے جداگانہ ہے تو لامحالہ ان کے باہمی مفادات بھی ایک دوسرے سے مختلف اور متصادم ہوں گے۔ ہمارے خیال میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی دائروں میں یہ اختلافات بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔

۷۔ اپنے شاندار اصولوں کی بنیاد پر مغرب میں اسلام کو ایک پھیلتا ہوا مذہب قرار دیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلام کا مغرب میں پھیلاؤ بجائے خود ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ بالفاظ دیگر اسلامی تہذیب، چونکہ دیگر تہذیبوں پر اثر انداز ہونے یا پھر انہیں اپنے اندر جذب کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے اس لیے بھی وہ اسے اپنے لیے چیلنج سمجھتے ہیں۔

۸۔ نظریۂ خلافت، اسلام کا ایک سیاسی وانتظامی نظریہ ہے، جس کا قیام وثبات

معاشروں کی مدد کی ہے کہ وہ ان کے تصورات کو چیلنج کریں اور گروہوں، مذاہب اور تہذیبوں کے فہم کے لیے نئے راستے اختیار کریں۔ یہ اس بات کا ایک چھوٹا سا ثبوت ہے کہ کس طرح مسلمانوں نے اپنے نہج پر کثیر المدنیت میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ مسلمان ایک کثیر المدنی معاشرے میں کس طرح عیسائیوں، دہریوں، یہودیوں اور ہندوؤں سے احترام کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ یہ دکھائی دیتا ہے کہ اکثر حصوں میں، مسلمانوں نے دیگر تہذیبوں اور مذاہب کے بارے میں اپنے رویے پر کبھی غور نہیں کیا۔ وہ عام طور پر دیگر مذاہب وغیرہ کے ساتھ معاملہ کرتے وقت اہل کتاب کے بارے میں اپنے روایتی تصورات ہی پر اعتماد کرتے ہیں۔ دور وسطیٰ کے یک تہذیبی ادوار میں فروغ پانے والے تصورات کے تقابل میں اگر دیکھا جائے تو یہ تصور ترقی پسند دکھائی دیتا ہے۔ تاہم آج ہم جس عالمگیر معاشرے میں زندہ ہیں، اس کے لیے یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا (اسی طرح) اسلامی ریاست کے تسلط پر مبنی تصور کے بارے میں تو کبھی سوال نہیں اٹھایا گیا۔

۵، ۶، ۷۔ سیاسی اسلام، جس صورت میں بھی ہو، اسلام اور مغرب کے درمیان تعلقات کے لیے ایک بنیادی ڈھانچہ تشکیل دیتا ہے۔ سیاسی اسلام، اسلام کی اس تعبیر کا نام ہے کہ سیاست مذہب کے مفہوم پر غالب ہے۔ بہت سے اہل مغرب کے نزدیک مذہب سماجی زندگی اور انسانی موضوعیت (Human Subjectivity) کے مخصوص دائروں پر محیط ہے۔ مذہب، آرٹ، سیاست اور معاشرے پر اثر انداز ہو سکتا ہے لیکن بہر حال ان امور سے لاتعلق رہتا ہے۔ سیاسی اسلام مذہب و سیاست میں دوئی کا قائل نہیں ہے اور اس تصور کو قبول کرنا آسان نہیں ہے۔ پچھلے چند عشروں سے سیاسی اسلام نے اس تصور کی آبیاری کی ہے کہ اسلام میں اصل چیز سیاست ہے۔ اس کے علاوہ مذہب کا حصہ بہت کم ہے۔ اس طرح اسلام کی اخلاقی اقدار اور روحانی بنیادیں پس منظر میں چلی گئی ہیں۔ بہت سے اہل مغرب جب مسلمان معاشروں کے اخلاقی، روحانی اور آرٹ سے متعلق پہلوؤں سے واقف ہوتے ہیں تو انہیں بہت حیرت ہوتی ہے۔ اسلام کے ایک غیر متوازن تصور کے فروغ میں سیاسی اسلام کا کردار بہت بنیادی ہے۔

۸، ۹۔ شناختوں کی تشکیل میں میڈیا بہت اہم کردار کرتا ہے۔ فطری طور پر میڈیا مختلف شناختوں اور ان کے باہمی اختلافات کو نمایاں کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ اس اعتبار سے اسلام اپنی انفرادیت اور اجنبیت کے باعث میڈیا کے لیے ایک پرکشش موضوع ہے۔ ایک نقاب پوش خاتون یا قبا پہنے ہوئے لمبی داڑھی والا مرد، یورپی معاشرت کے معتدل تصورات سے مختلف دکھائی دیتے ہیں۔ کیمرے کی آنکھ کے لیے ان مناظر میں بڑی کشش ہے۔ اب ان مناظر کی بنیاد پر روایتی تصورات قائم کیے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود مغرب میں میڈیا اتنا یک رخا نہیں جتنا کہ دکھائی دیتا ہے۔ میڈیا کے پس منظر میں بہت سے مسابقانہ نظریات اور مفادات کام کر رہے ہوتے ہیں اور میڈیا کے ایک بڑے حصہ کے لیے اصل چیز منافع کمانا ہے نہ کہ سیاست۔ اس مسابقت میں میڈیا کے ایسے ذرائع کی نشاندہی ممکن ہے جو اسلام کے منفی تصور کو

مغرب کی سیاسی موت ہے۔ اس لیے مغرب نے مسلمانوں کو جغرافیائی، سیاسی اور معاشی غرض مختلف پہلوؤں سے تقسیم کر رکھا ہے۔ خلافت عثمانیہ کا خاتمہ بھی اس سلسلے کی کڑی تھا۔ اور آج بھی مسلم ممالک کی کسی بھی فیڈریشن کو مغرب اپنے لیے حریفانہ نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس لیے یہ بات سو فیصد درست ہے کہ اسلام کی سیاسی تعبیر نے مغرب کو تشویش میں مبتلا کر رکھا ہے۔

۹۔ سلمان رشدی کے لیے سر کا خطاب اور ڈینش کارٹون اور اب سوئیڈش خاکے وغیرہ جیسے واقعات کے اسباب متعدد ہیں، مثلاً (۱) اسلام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے ردعمل میں ایسا کیا جاتا ہے، (۲) مسلمانوں کو مذہب کے حوالے سے غیر جذباتی بنانا بھی مقصود ہو سکتا ہے، (۳) مسلمانوں کو مشتعل کر کے انہیں دہشت گردی کی راہ دکھانا تا کہ انہیں دہشت گرد ثابت کرنا آسان اور یقینی ہو جائے، (۴) مسلمانوں کو لبرل ازم، برداشت Tolerance اور جمہوری رویہ کے نام پر شعائر دین کے معاملات میں بے حس اور بے حمیت کر کے اپنے جیسا بنا دیا جائے وغیرہ اس کے علاوہ اور بھی پس پردہ محرکات ہو سکتے ہیں۔

۱۰۔ اسلام کے حوالے سے مغربی میڈیا کا کردار متعصبانہ بلکہ شرمناک حد تک جھوٹا ہے۔ مثلاً مسلمانوں کے لیے دہشت گرد اور بنیاد پرست جیسی اصطلاحات مغربی میڈیا کی پھیلائی ہوئی ہیں، جن کی آڑ میں مسلمانوں کو پوری دنیا میں بدنام کیا جا رہا ہے۔ جبکہ دوسری طرف افغانستان اور عراق پر امریکہ کے غیر قانونی، غیر انسانی اور غیر اخلاقی حملے کو جواز فراہم کرنے کے لیے مغربی میڈیا کو جھوٹ بولتے ہوئے ذرا بھی شرم نہیں آتی۔

۱۱۔ بلا شبہ امریکہ کے سیاسی مفادات اسلام اور مغرب کے مابین شدید رنجش پیدا کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔ ناٹو کی افواج کا انتہائی عیاری کے ساتھ افغانستان میں استعمال امریکہ کی بدولت ہی ممکن ہوا۔ ناٹو کی فورس، سویت یونین کے مقابلہ کے لیے بنائی گئی تھی۔ جس میں تین براعظموں کی افواج شامل ہیں لیکن اب تک صرف امریکہ نے ہی انہیں اپنے حق میں استعمال کیا ہے۔ اور امریکہ اپنی دفاعی قوت کو اپنے سیاسی مفادات کی تکمیل کے لیے استعمال کرتا ہے، جو کلی طور پر مسلم کش پالیسیوں پر مبنی ہیں۔ جس کی وجہ سے مسلمان اپنا غصہ امریکہ حمایتی مقامات پر حملہ

استعمال کرنے سے گریزاں ہیں۔ ان کی تنقید کا رخ زیادہ تر مغربی معاشرے کی رجعت پسند قوتوں اور سیاسی نظریات کی طرف ہوتا ہے اور اس طرح اکثر مسلمانوں کے بارے میں روایتی تصورات کو پیش کیا جاتا ہے۔ اب جمہوری روح کے ساتھ میڈیا ایک توازن تلاش کر لیتا ہے۔

۱۰، ۱۱، ۱۲۔ مغرب کے حوالے سے مسلمانوں کے خدشات کیا ہیں؟ کیا یہ حقیقی ہیں یا خیالی؟ مغربی ممالک کے مسلمان ریاستوں کے ساتھ واضح طور پر مفادات وابستہ ہیں۔ بنیادی طور پر یہ مفادات معاشی ہیں۔ مسلمان ملکوں میں قدرتی وسائل کے بڑے ذخیرے موجود ہیں، جن میں تیل بھی شامل ہے جس کی انہیں وافر اور مناسب داموں پر ضرورت ہے۔ اسی طرح مسلمان مغربی ممالک اور کمپنیوں کے لیے بطور صارف بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ بعض مغربی ممالک کے سیاسی مفادات بھی ہیں، جن میں سب سے اہم اسرائیل کی حمایت ہے۔ بیسویں صدی میں یہودیوں کی تاریخ، بالخصوص ہالوکاسٹ نے اسرائیل اور مغربی ممالک میں ایک خاص رشتہ قائم کر دیا ہے۔ تاہم ہر مغربی ملک کا اسرائیل کے ساتھ ایک طرح کا رشتہ نہیں ہے۔ جرمنی اور امریکا دونوں اسرائیل کے سامنے جھکے ہوئے ہیں تاہم اس کی وجوہات مختلف ہیں۔

ان مفادات کی وجہ سے مسلمان اس خطے [مشرق وسطیٰ] کے بارے میں مغربی منصوبوں اور عزائم کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ حالیہ سالوں میں عراق پر قبضے اور اسرائیل کی غیر مشروط مسلسل حمایت کی وجہ سے مغرب کے بارے میں مسلمانوں کا رویہ انتہائی مخاصمانہ اور منفی ہے۔ اس فضا میں دونوں کے مابین باہمی اعتماد پر مبنی ایک تعمیری تعلق کا قیام مشکل ہے۔ تاہم خوف اور تشکیک مستقبل کے تعلق کے لیے بنیاد نہیں بن سکتے۔ وہ ایک باہمی مفاد پر مبنی صحت مندانہ تعلق استوار کرنے میں معاون نہیں ہو سکتے۔ اس مقصد کے لیے کوئی دوسرا تعمیری راستہ تلاش کرنا پڑے گا۔

اس کا آغاز اسلامی اور مغربی مفادات کے مفاہیم پر نظر ثانی سے کیا جا سکتا ہے۔ ایک کاری ضرب یقیناً اختلاف کو جنم دے گی جبکہ ایک محتاط مشاہدے اور طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور مغرب کے مابین قائم عارضی سرحدوں کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ مسلمان ملک متنوع ہیں لیکن ان میں موجود افراد تہذیبی اور جغرافیائی سرحدوں سے ماوراء تعلقات کا ایک نظام قائم کیے ہوئے ہیں۔ اس طرح مغرب بھی اپنے وجود میں منتشر ہے۔ اپنے اور دوسروں کے درمیان تعلق کی وضاحت کے لیے شاید ہم رومی کے افکار سے بھی مدد لے سکتے ہیں، جن کا کہنا ہے:

میں تمہارا آئینہ ہوں میں تمہارے لیے پیمانہ ہوں
جتنی تمہاری حیثیت ہے اتنی میری دولت ہے
(فیہ ما فیہ)

(ڈاکٹر عبدالقادر طیب یونیورسٹی آف کیپ ٹاؤن، جنوبی افریقہ سے وابستہ ہیں۔ وہاں کے معروف ادارے ''اسلامی مرکز'' کے صدر نشین ہیں۔)

کر کے نکالتے ہیں یوں اسلام الگ بدنام ہوتا ہے، اور مسلم اور مغربی اقوام کے باہمی تعلقات کشیدگی کی جانب الگ بڑھتے ہیں۔

۱۲۔ تلخ حقائق کے باوجود، اسلام اور مغرب ایک ساتھ چل سکتے ہیں۔ اور یہ دوستی باقی دنیا کے لیے فرحت بخش ثابت ہو سکتی ہے۔ اس مقصد کے لیے عالمی سطح پر کوششوں کی ضرورت ہے۔ اسلام اور مغرب کے مابین مکالمے اور مباحثے ہونے چاہئیں۔ ان کے درمیان سماجی و ثقافتی روابط بڑھنے چاہئیں۔ اور دوسری طرف ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ عصر حاضر کے تناظر میں اسلام کی ممکنہ تعبیر نو، وقت کی اہم ترین ضرورت ہے جسے اجتہاد کی مدد سے ہی پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض مسلم علماء کے متشددانہ اور متعصّبانہ طرز فکر نے نہ صرف مغرب کو بلکہ خود مسلمانوں کے سنجیدہ اور دانشور حلقوں کو بھی تشویش میں مبتلا کر رکھا۔ اس داخلی انتشار کو دور کرنا بھی عصر حاضر کا ایک چیلنج ہے۔

۱۳۔ ہماری نظر میں سازشی نظریہ ایک سچائی ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ دنیا بھر میں کسی بھی مذہب اور اس کے ماننے والوں پر حملے نہیں کیے جاتے۔ سوائے اسلام اور مسلمانوں کے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں جتنے بھی ممالک زیر قبضہ ہیں وہ سب کے سب مسلمان ہیں۔ کیا یہ سب واہمہ ہے یا کسی سازش کا نتیجہ؟ بناء بریں ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اسلام کے خلاف سازشی نظریہ واقعی ایک سچائی ہے۔

(ڈاکٹر محمد شکیل اوج، شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی میں استاد اور سہ ماہی التفسیر، کراچی کے مدیر اعلیٰ ہیں)

پولینڈ: لکڑی سے بنی ہوئی ایک خوبصورت مسجد

نقد و تبصرہ

مسلمان مفکرین کی سابقہ تحقیق پر ہے، اس سے وہ اپنا مقصد واضح کرتے تھے اور یہ قابل غور بات ہے کہ اس قسم کی دریافتیں مغربی یورپ میں نہیں کی گئیں، بلکہ اس قسم کی دریافتیں قاہرہ کے ڈومینیکن انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹیل سٹڈیز جیسے مقامات میں ''سمّا'' کے مطالعہ کے ذریعے ہوئی ہیں۔ ان معاملات پر زیادہ جاندار رائے کے لیے

فی الحقیقت عیسائی مفکروں نے ترک اور بیزنطین کے درمیان فوجی تنازعات سے چند صدیاں قبل مغرب میں اسلامی فلسفیانہ روایات سے استفادہ کیا

ریمی بریگ کے مشہور و معروف مطالعہ سے رجوع کیا جاسکتا ہے، جو ''انوکھا یورپ'' (Eccentric Europe) کے نام سے انگریزی زبان میں شائع ہوئی، جس میں یورپ کے قیام کے سلسلے میں عیسائیت کے کردار کے بارے میں حالیہ بحثوں کی ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے۔ اس کتاب میں ہمیں یہ یاددہانی کرائی گئی ہے کہ وہ سب کچھ جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ یہ یورپین ہے، اس کا آغاز کہیں اور ہوا۔ اس کی ابتدا یہودیت مع عیسائیت سے ہوئی اور بعد میں قرون وسطیٰ میں اسلام اور دیگر مذاہب کے فلسفیانہ اصولوں سے بھی استفادہ کیا جاتا رہا۔ فی الحقیقت عیسائی مفکروں نے ترک اور بیزنطین کے درمیان فوجی تنازعات سے چند صدیاں قبل مغرب میں اسلامی فلسفیانہ روایات سے استفادہ کیا لیکن بعد میں صلیبی جنگوں کے دوران مغربی قوتوں کے ہاتھوں یہ روایت زوال کا شکار رہی۔ پوپ نے پروفیسر خوری (Khoury) کی تحریر کی مثال دیتے ہوئے ہمارے سامنے مسلمان حکمرانوں کی یکطرفہ تصویر پیش کی ہے۔ حقیقت میں پوپ نے اسلام اور مغرب کے بارے میں جو خاکہ پیش کیا ہے، اس میں باہمی تبادلہ کا کوئی اشارہ نہیں ہے اور مغرب صدیوں سے اسلام کی جو تصویر پیش کرتا رہا ہے، اس کا کوئی از خود تنقیدی جائزہ بھی موجود نہیں ہے۔

لیکن جونہی ہم دوسرے مآخذ کی طرف رخ کرتے ہیں، جن کا پوپ نے ذکر نہیں کیا ہے لیکن ان کے بیان میں اس کا از خود اظہار ہوا ہے، جس سے اصل کہانی مزید پیچیدہ ہو جاتی ہے۔ میں جناب سمیر خلیل سمیر، ایس جے کو بیس سال سے جانتا ہوں کیونکہ عربی اور عیسائی ادب کے میدان میں ان کی سرکردہ تحریروں سے ہم مستفید ہوتے رہے ہیں۔ تاہم اس بحث پر مبنی اپنی حالیہ تحریر میں وہ پوپ سے اپنی قربت کا اظہار کرتے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تحریر دوہری (یا مخالفانہ) سوچ کی پیداوار ہے، جس سے ان کی علمی استعداد کی تردید ہوتی ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ ان کے مقالے کا عنوان ''تہذیبوں کے ملاپ'' کا اعلان کرتا ہے جب کہ ان کا متن مخالفت سے بھرپور ہے اور اس متن میں کچھ نہایت ناپسندیدہ قسم کے غلط تصورات موجود ہیں۔ اس سیمینار کی مثال دیتے ہوئے جو کاسل گینڈ ولفو میں ۲۰۰۵ء میں منعقد ہوا، جناب سمیر اپنا مشاہدہ پیش کرتے ہیں کہ کس طرح سے پوپ نے ''زور دیا ہے کہ...... اسلام اور عیسائیت میں واضح فرق موجود ہے...... مذہبی نقطۂ نظر سے، اسلام کے ظہور پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قرآن پاک محمد ﷺ پر نازل ہوا، یہ محمد ﷺ پر الہام نہیں کیا گیا۔ اس وجہ سے مسلمان خود کو اس بات کا مجاز نہیں سمجھتے کہ وہ قرآن پاک کی تشریح کریں، بلکہ وہ ان آیات پر کاربند رہتے ہیں، جو ساتویں صدی میں عرب میں نازل ہوئیں''۔ جناب سمیر نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''قرآن پاک کی مطلق نوعیت مکالمہ کو زیادہ مشکل بنا دیتی ہے، کیونکہ قرآن پاک کی تعبیر و تشریح کی گنجائش بہت کم ہے''۔ قرآن پاک پر تبصرہ کی اعلیٰ روایت جو یہودیوں کے مذہبی اور اخلاقی عقائد کے مطابق انجیل پر کیے گئے تبصرہ کے مساوی ہے، اس کے بارے میں

جرمنی: برلن کا ایک تاریخی چرچ

جناب سمیر بالکل بے خبر نظر آتے ہیں۔ تاہم ہماری متعلقہ روایات انجیل یا قرآن پاک کے مآخذ سے مختلف ہوسکتیں ہیں، قرآن کریم کا الہامی آغاز کبھی بھی قرآن کریم پر اسلامی تبصروں کے حوالے سے رکاوٹ کا سبب نہیں بنا، بلکہ اپنی تاریخ کے ہر آنے والے دور میں یہ کتاب مقدس اپنے اوپر تبصروں کو فروغ دیتی رہی ہے۔

سمیر اپنے تبصرے کے آخری حصے میں اسلام کے بارے میں پوپ کے خیالات کی تعریف کرتے ہوئے ایک نہایت ناپسندیدہ اور خطرناک قسم کا دعویٰ کرتے ہیں، جہاں سمیر پوپ کو سراہتے ہیں کہ ''وہ صلیبی جنگوں، نوآبادیاتی نظام، مشنریوں، کارٹونوں وغیرہ کے معاملے پر معافی مانگنے کے جال میں نہیں پھنسے...... کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کے الفاظ مکالمے کو فروغ دینے کے لیے استعمال نہیں کیے جاسکتے، بلکہ مکالمے کو تباہ کرنے کے لیے استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ بلاشبہ یہاں ہم پوپ کی نہیں، بلکہ جناب سمیر کی بات سن رہے ہیں اور یہ ان کے بیان کا بھرپور انداز ہے: ''یہ وہ تجربہ ہے جو ہم مسلم دنیا کے بارے میں رکھتے ہیں، ایسے تمام اقدامات جو بہت ہی فیض بخش اور بدرجہ غائت روحانی ہیں، ان کا مقصد ماضی میں ہونے والے تاریخی واقعات کے سلسلے میں معذرت کرنا ہے، ایسے اقدامات کیے گئے ہیں اور یہ اقدامات مسلمان اپنا حساب چکانے کی غرض سے پیش کرتے ہیں۔ یہاں وہ کہتے ہیں کہ آپ اپنے طور پر اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ آپ غلطی پر ہیں۔ اس قسم کے اقدامات کبھی بھی مقابلے یا جوابی کارروائی کی کوئی چنگاری پیدا نہیں کرتے''۔ یہاں بہت کم شرط یا حد بندی ہے، ''ہمارے'' اقدامات روحانیت اور فراخدلی کے اصولوں پر مبنی رہے ہیں، ان کے اقدامات متنازعہ رہے ہیں۔ ضمنی طور پر ''ہم'' سے مراد عرب کے عیسائی ہیں، جن سے سمیر خود کو وابستہ کرتے ہیں؛ دوسری طرف ''مسلمان دنیا'' ہے۔ یہاں کوئی ملاپ نہیں ہے۔ لیکن وہ بات جو مجھے جناب سمیر پر شبہہ کرنے کی طرف لے

جب مسلمان ابتدائی دور میں عرب سے بیزنطین کی سلطنت میں آئے، تو مسلمان وہاں کے شاہی نظام حکومت سے بہت متأثر ہوئے، جسے انہوں نے فوری طور پرنقل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔

جاتی ہے، وہ ہے جناب سمیر کا اسلام کے بارے میں پوپ کا مشیر ہونا۔ آخر میں وہ یہ جذباتی تعریف کرتے ہیں کہ: ''میں حقیقت میں پوپ، ان کے متوازن بیان اور ان کی صاف گوئی کو پسند کرتا ہوں۔ وہ کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے، وہ عقلیت کے نام پر انجیل کے اعلان کی اہمیت کی پُرزور وضاحت جاری رکھتے ہیں......'' تاہم قرآنی روایات یا مسلم عیسائی تنازعات کے غلط تاریخی بیان کی صورت میں جناب سمیر ازخود آسانی ''عقلیت'' سے پہلوتہی کرسکتے ہیں۔ اور ایسا کر کے وہ جارج وِیجل کی طرح تنگ نظر سوچ کو بڑھانے والوں کی حمایت کر کے اپنی ہی عالمانہ اقدار کو بدنام کرتے ہیں۔

جارج وِیجل نے اپنے حالیہ کالم جو کیتھولک اخبارات میں چھپا، اس میں اسلام کی بُری شبیہ کا عیسائی تاریخ کی اچھی تصویر کے ساتھ موازنہ کیا ہے۔ تاریخ کو درستگی یا صحت کے ساتھ بیان کرنا اس قسم کے مبصرین کے راستے میں کبھی بھی رکاوٹ نہیں

پولینڈ: ایک خوبصورت مسجد

رہا، کیونکہ بلاشبہ خود تنقیدی ان کے مجموعوں کا حصہ نہیں ہوتی۔ تاہم پاپائے روم کے مشیران کی جانب سے غیرمحتاط تبصرے اور ان کی سوچی سمجھی الزام تراشیوں کو ایک قسم کا اعتماد عطا کرسکتے ہیں، جسے دانشمند قارئین رد کر دیں گے۔ حقیقت میں ایک ریٹائرڈ سفارت کار جو ملکی (Melchite) پادری بن گیا، اس نے مجھے یہ یاد دہانی کروائی کہ: جب مسلمان ابتدائی دور میں عرب سے بیزنطین کی سلطنت میں آئے، تو مسلمان وہاں کے شاہی نظام حکومت سے بہت متاثر ہوئے، جسے انہوں نے فوری طور پر نقل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں، تاہم مسلمان بیزنطین کے مفتوحین کی روحانیت سے نسبتاً کم متاثر ہوئے۔ شاید پوپ کے لیے یہ بہتر مشورہ ہوگا کہ وہ اس ثبوت پر زیادہ توجہ مرکوز کریں، جو ہم مسلمانوں کو پیش کرتے ہیں (یا پیش کرنے میں ناکام ہوجاتے ہیں) بہ نسبت ہمارے ان کارناموں کے، جن کی مسلسل اور مبالغہ آمیز انداز میں تعریف کی جاتی ہے۔ (وہ کیتھولکس افراد جو ہمارے پوپ پر اس قسم کی سخت تنقید سے شاید برہم ہوجائیں، انہیں یہ بات نوٹ کر لینی چاہئے کہ میں نے پوپ کے بیان کے متن کو، نہ کہ ان کی شخصیت کو اس دلیل کے ذریعے پرکھا ہے، جس کی پوپ حمایت کرتے ہیں، ایک ایسی دلیل جس کا آغاز سقراط کی خود تنقیدی کی جستجو سے ہوا ہے۔)

ڈیوڈ بیوریل، سی۔ ایس۔ سی، یونیورسٹی آف نوٹرڈیم/ ٹینٹر ایکیومینیکل انسٹی ٹیوٹ (یروشلم) ہیس برگ میں پروفیسر امریطس، ہیں۔

خدا کی ماورائیت

آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ''مسلمان کے لیے یہ تعلیم کہ خدا مطلقاً سمجھ سے بالاتر ہے'' ایک ایسا خیال ہے جو گمراہ کن ثابت ہوسکتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے: ''اس جیسی کوئی چیز نہیں (قرآن: ۴۲:۱۱) مگر قرآن پاک کی سورہ نور میں یہ بھی ذکر ہے کہ ''خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے (قرآن: ۲۴:۳۵) اور سورہ ق میں ہے کہ ''اور ہم اس کی رگ جان سے بھی اس سے زیادہ قریب ہیں''۔ (قرآن ۵۰:۱۶) سورہ الحدید میں ارشاد ہے کہ ''وہ (سب سے) پہلا اور (سب سے) پچھلا اور (اپنی قدرتوں سے سب

یورپ میں ایک مسجد
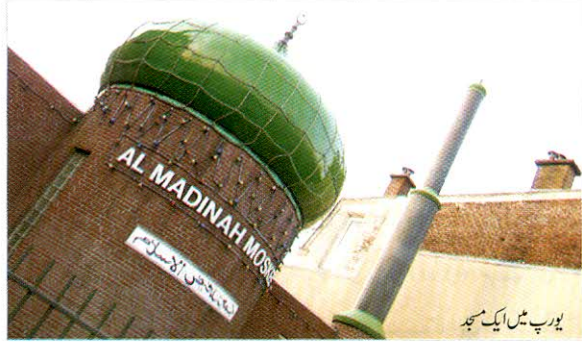
پر) ظاہر اور (اپنی ذات سے) پوشیدہ ہے'' (قرآن ۵۷:۳) ''اور تم جہاں کہیں ہو وہ تمہارے ساتھ ہے (قرآن ۵۷:۴) اور سورہ البقرہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''تو جدھر تم رخ کرو، ادھر خدا کی ذات ہے'' (قرآن ۲:۱۱۵) اس کے علاوہ حدیث قدسی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''جب میں اس (عبادت گزار) سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، آنکھیں بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اور پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ (صحیح البخاری نمبر شمار: ۶۵۰۲، کتاب الرقاق)

اسلام کی روحانی، الٰہیاتی اور فلسفیاتی روایت میں سے جس مفکر، ابن حزم (متوفی ۱۰۶۹ء) کا آپ نے ذکر فرمایا ہے ایک محترم مگر بہت ہی غیر اہم شخصیت ہیں۔ ان کا تعلق فقہ کے ظاہری مکتب فکر سے تھا جس کی آج اسلامی دنیا میں کہیں بھی پیروی نہیں کی جاتی۔ اگر کوئی شخص نظریہ ماورائیت کی ہیئت کے بارے میں آگاہی حاصل کرنے کا خواہاں ہو تو مسلمانوں میں زیادہ معتبر ہستیاں بھی موجود ہیں مثلاً الغزالی (متوفی: ۱۱۱۱ء) جو ابن حزم کی نسبت اسلامی علوم کی زیادہ بہتر نمائندگی کرتے ہیں۔ آپ نے حوالے کے طور پر یہ استدلال پیش کیا ہے کہ شہنشاہ نے ایرانی عالم کے ساتھ اپنے مکالمہ میں جب کہا کہ ''خدا خون سے خوش نہیں ہوتا'' تو شہنشاہ کی اس بات کے پس منظر میں یونانی فلسفہ تھا جس کی وجہ سے اس کی یہ بات اہمیت کی حامل ہے اور واضح بالذات ہے اور شہنشاہ کے اس بیان کے تردیدی جواب کے طور پر مسلمان خدا کی ماورائیت کے تصور کو پیش کرتے ہیں اور آپ کا یہ بیان کہ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق خدا کی منشاء انسان کی کسی سوچ اور ارادے کی پابند نہیں ایک ایسی توضیح ہے جس سے غلط فہمیاں جنم لے سکتی ہیں۔ خدا کے اسلام میں بہت سے نام ہیں الرحیم، العادل، البصیر، السمیع، العلیم، الرحمٰن اور بہت سے دوسرے صفاتی نام۔ ان کا خدا کی وحدانیت پر کامل یقین ہے اور سورۃ الاخلاص کے مطابق مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ کوئی اس کا ہمسر نہیں۔ (قرآن ۱۱۲:۴)۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسے اوصاف پر ایمان کسی طرح بھی مسلمانوں کو مانع نہیں کہ وہ خدا کے ان اوصاف کو خدا سے اور اس کی (چند) مخلوقات سے متصف نہیں کر سکتے۔ کیونکہ [آپ کے خیال میں] اس بات کا تعلق خدا کی منشاء سے ہے کہ مسلمان ایک ایسے خدا پر ایمان رکھتے ہیں کہ جو اس کے جی میں آئے کرتا ہے اور وہ چاہے تو انہیں برائی سے منع کرے اور چاہے تو نہ کرے۔ آپ کی یہ بات قرآن پاک کے اس ارشاد کے برخلاف ہے ''خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو (خرچ سے) مدد دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور نامعقول کاموں سے اور سرکشی سے منع کرتا ہے (اور) تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو (قرآن: ۱۶:۹۰) اور خدا کے بارے میں آپ کا یہ گمان سورہ الانعام میں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بھی برخلاف ہے کہ اس نے اپنی ذات (پاک) پر رحمت کو لازم کرلیا ہے (قرآن ۶:۱۲) اور قرآن پاک کی سورۃ الاعراف میں اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ ''اور جو میری رحمت ہے وہ ہر چیز کو شامل ہے (قرآن ۷:۱۵۶)۔ [قرآن میں] رحم کے لیے استعمال کیے گئے لفظ کا ترجمہ محبت، شفقت اور دردمندی ہے۔ رحمۃ کے اس لفظ سے مسلمانوں کے لیے ایک اور اصول سامنے آتا ہے جسے مسلمان روزانہ پڑھتے ہیں ''شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے''۔ کیا یہ بات واضح بالذات نہیں ہے کہ معصوم جانوں کا خون بہانا رحمت اور دردمندی جیسے احساسات کے خلاف ہے؟

استدلال کا استعمال

اسلامی علمی روایات انسانی عقل کی ماہیت اور اس کا خدا کی فطرت سے تعلق، خدا کی منشاء اور اس کے علاوہ دیگر متعلقہ تفصیلات سے بھرپور ہے کہ کیا چیز ظاہر بالذات ہے اور کیا خفی ہے۔ تاہم، آپ کا فرمانا کہ اسلامی فکر میں ''استدلال'' اور ''مذہب'' کے درمیان دوری پائی جاتی ہے، تو آپ کے یہ خیالات صورتحال کی غلط نمائندگی کرتے ہیں۔ اس کی بجائے مسلمانوں نے انسانی ذہن کی صلاحیت اور انسانی عقل کی تحدید کے مسئلے کو اپنے انداز سے مکاتب فکر کے سلاسل کے ذریعے سے حل کیا ہے جن میں استدلال کو خصوصی اہمیت دی جاتی رہی۔ ایسا کرتے ہوئے اسلامی عقلی روایات نے عمومی طور پر دو انتہاؤں سے ہمیشہ گریز کیا ہے۔ اول یہ ہے کہ حقیقت کی حتمی پرکھ کے لیے تجزیاتی ذہن کی تشکیل اور دوسری یہ ہے کہ اساسی استفسارات کا جواب ڈھونڈنے کے لیے انسانی عقل کے استعمال کی ممانعت۔ زیادہ معتبر بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی پختہ اور رائج الوقت عقلی تحقیقات نے قرآن کی بیان کی گئی حقیقتوں اور انسان کی اپنی نظری ضروریات کے درمیان دونوں میں سے کسی کو قربان کیے بغیر مطابقت پیدا کی ہے۔ سورہ حم السجدہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''ہم عنقریب ان کو اطراف (عالم) میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو

جائے گا کہ (قرآن) حق ہے (قرآن ۴۱:۵۳)۔ عقل بھی ہمارے اندر بہت سی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، جس کے استعمال کی اللہ تعالیٰ ہمیں دعوت دیتا ہے اور سوچنے کی دعوت دیتا ہے تا کہ ہم سچائی کو جان لیں۔

''مقدس جنگ'' کیا ہے؟

ہم اس بات کی نشاندہی کرنا پسند کریں گے کہ ''مقدس جنگ'' کی اصطلاح عربی زبان میں موجود نہیں ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ''جہاد'' کا مطلب ''جدوجہد'' ہے اور بالخصوص خدا کے راستے میں کسی قسم کی جدوجہد۔ یہ جدوجہد کوئی بھی شکل اختیار کر سکتی ہے بشمول طاقت کا استعمال۔ جہاد کو ان معنوں میں مقدس کہا جا سکتا ہے کہ اس کی سمت کسی مقدس مقصد کے حصول کی طرف ہوتی ہے۔ جہاد لازماً کوئی ''جنگ'' ہی نہیں ہوتا مزید برآں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مینول دوم پیلیولوگس فرماتے ہیں کہ ''تشدد'' خدا کی فطرت کے خلاف ہے چونکہ عیسیٰؑ نے خود بھی مندر میں زر کا تبادلہ کرنے والوں کے ساتھ تشدد کیا اور کہا ''یہ نہ سوچنا کہ میں زمین پر امن قائم کرنے کے لیے آیا ہوں۔ میں امن لے کر ہی نہیں آیا، بلکہ ایک تلوار بھی.....'' (میتھیو ۱۰:۳۴-۳۶) جب خدا نے فرعون کو غرق کیا تو کیا اس وقت وہ اپنی فطرت کے خلاف کر رہا تھا؟ غالباً شہنشاہ کے ایسا کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ظلم، بربریت اور تشدد خدا کی منشاء کے خلاف ہیں تو ایسی صورت میں جہاد کا کلاسیکی اور روایتی قانون جو اسلام میں مذکور ہے شہنشاہ کے تصور کی مکمل تصدیق کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ ''بلاشبہ شہنشاہ مقدس جنگ کے بارے میں بعد میں نازل شدہ قرآنی ہدایات سے واقف تھا'' تاہم قرآن پاک کی آیت کہ دین (اسلام) میں زبردستی نہیں ہے کے ضمن میں جو باتیں ہم نے بیان کی ہیں، ان سے واضح ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا ہدایات کا نزول گزبعد میں نہیں ہوا۔ مزید برآں تشدد کے ذریعے مذہب تبدیل کرنے کے بارے میں شہنشاہ کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ ہدایات کیا ہیں اور کیا رہی ہیں؟

جنگ (قتال) کے معتبر اور روایتی اسلامی اصول مختصراً حسب ذیل ہیں:

۱- عام شہری جو لڑنے کے لیے تیار نہ ہوں نشانہ نہیں بنائے جائیں گے۔ اس کی تاکید صریحاً بار بار نبی پاک ﷺ نے آپ ﷺ کے صحابہ اور آپ کے بعد علم کے جتنے بھی سلسلے آئے ہیں کرتے رہے ہیں۔

۲- مذہبی عقیدہ کی بناء پر کسی کو حملے کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔ ابتدائی مسلمان معاشرہ بت پرستوں کے خلاف برسر پیکار تھا جنھوں نے انہیں (مسلمانوں کو) ان کے گھروں سے نکال دیا تھا، ایذا پہنچائی اور ستایا اور انہیں قتل کیا تھا۔ ان حالات کے بعد اسلامی فتوحات کی ماہیت سیاسی رخ اختیار کر چکی تھی۔

۳- مسلمانوں کو اپنے ہمسایوں کے ساتھ امن کے ساتھ رہنا چاہیے اور قرآن پاک میں ہے کہ اگر یہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو جاؤ اور خدا پر بھروسہ رکھو۔ (قرآن ۸:۶۱) تاہم اس اصول کی وجہ سے کسی کا ذاتی دفاع کرنے کا قانونی حق متاثر نہیں ہوتا۔

مسلمان ان قواعد وضوابط کی تعمیل کے بالکل اسی طرح پابند ہیں جس طرح وہ چوری اور زنا سے اجتناب کرتے ہیں۔ اگر کوئی مذہب جنگ کے قواعد وضوابط کا تعین کرتا ہے اور وہ حالات بیان کرتا ہے جن کے پیش نظر جنگ لازمی اور جائز ہو جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ جنگجو مذہب ہے۔ اگر کسی مذہب میں شہوانیت پر قابو پانے کے لیے قواعد وضوابط وضع کیے گئے ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مذہب شہوت انگیزی یا نفس پرستی کا درس دیتا ہے۔ اگر بعض لوگوں نے خیالی دنیا کے خوابوں کے مقابلے میں پرانی اور خوب تسلیم شدہ روایت کو نظر انداز کیا ہے تو ایسا ان لوگوں نے اپنی مرضی سے کیا ہے اور اللہ تعالیٰ، اس کے پیغمبرؐ یا فاضل روایت کی توثیق کے

> دنیا اور تاریخ میں مسیحیت سب سے بڑا جبکہ اسلام دوسرا بڑا مذہب ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق مسیحی دنیا کی کل آبادی کے تیسرے حصے سے زائد ہیں جبکہ مسلمان دنیا کی کل آبادی کے پانچویں حصے سے زائد ہیں۔

بغیر یہ اقدام کیا ہے۔ خیالی دنیا میں وسائل کے ذریعے مقاصد کو حق بجانب قرار دیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو، انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیزگاری کی بات ہے''۔ (قرآن: ۵:۸)

اس تناظر میں ہمیں یہ بیان کرنا چاہیے کہ ۱۷ ستمبر کو صومالیہ میں بے گناہ کیتھولک راہبہ کا قتل اور یونیورسٹی آف ریجنز برگ میں آپ کے لیکچر کے ردعمل کے طور پر بلاوجہ انفرادی تشدد کا کوئی دیگر مماثل اقدام مکمل طور پر غیر اسلامی ہے اور ہم ایسے اقدامات کی مکمل طور پر مذمت کرتے ہیں۔

جبری تبدیلی مذہب

یہ نظریہ کہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ''تلوار کے ذریعے'' اپنے عقائد کا پرچار کریں یا یہ کہ فی الحقیقت اسلام زیادہ تر ''تلوار کے ذریعے'' پھیلا، اس نظریے کا جائزہ لینے کے بعد اسے بطور مثال نہیں پیش کیا جا سکتا۔ فی الحقیقت، اسلام ایک سیاسی ادارے کی حیثیت سے جزوی طور پر فتوحات کے نتیجے میں پھیلا لیکن زیادہ تر اسلام کا پھیلاؤ تبلیغ اور مشنری سرگرمی کے باعث ہوا۔ اسلامی تعلیمات میں یہ نہیں کہا

گیا کہ مفتوح آبادیوں کو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا جائے یا جبری طور پر ان کا مذہب تبدیل کیا جائے۔ فی الحقیقت، مسلمانوں کی جانب سے پہلے فتح کیے گئے کئی علاقوں کی واضح اکثریت صدیوں تک غیر مسلم رہی۔ اگر مسلمان دیگر تمام لوگوں کی جبری تبدیلیٔ مذہب چاہتے تو اسلامی دنیا میں کہیں بھی کوئی گرجا یا کنیسہ موجود نہ ہوتا۔ یہ حکم کہ دین میں کوئی جبر نہیں ہے اس کا مفہوم اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔ کسی شخص کا محض غیر مسلم ہونا اسلامی قانون یا عقیدے کے مطابق اسلامی تاریخ میں کبھی بھی جنگ کا جواز نہیں بنا۔ جہاں تک جنگ کے قواعد وضوابط کا تعلق ہے تاریخ بتاتی ہے کہ بعض مسلمانوں نے جبری تبدیلیٔ مذہب اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ سلوک کے بارے میں اسلامی اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے لیکن تاریخ یہ بھی

جرمنی کی ایک خوبصورت مسجد
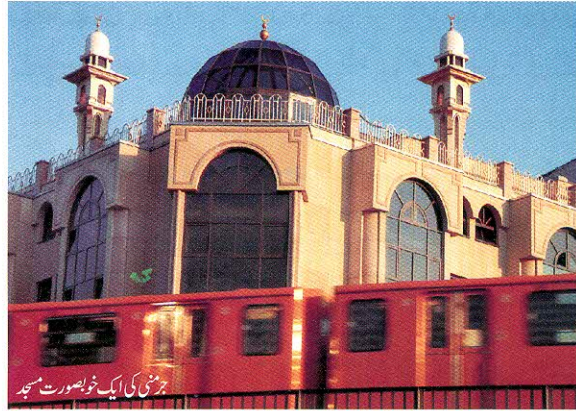
بتاتی ہے کہ یہ زیادہ تر استثنائی صورتیں ہیں جس سے قواعد وضوابط کی صحت ثابت ہوتی ہے۔ ہم پرزور انداز میں اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ دوسروں کو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کرنا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے خونریزی کو ناپسند فرمایا ہے۔ فی الحقیقت، ہمارا ایمان ہے اور مسلمان ہمیشہ سے یہ ایمان رکھتے ہیں کہ:

''جو شخص کسی کو (ناحق) قتل کرے گا (یعنی) بغیر اس کے کہ جان کا بدلہ لیا جائے یا ملک میں خرابی کرنے کی سزا دی جائے اس نے گویا تمام لوگوں کو قتل کیا''۔ (قرآن ۵:۳۲)

نئے اصول یا نئے عقائد

آپ نے شہنشاہ کے اس دعوے کا ذکر کیا ہے جس کے مطابق وہ ''نئے اصول یا عقائد'' جو پیغمبرؐ نے بیان کیے ہیں وہ بالکل اسی طرح نعوذ باللہ ''شرانگیز اور غیر انسانی ہیں جس طرح کہ تلوار کے ذریعے اسلام پھیلانے کے بارے میں آپؐ کا مبینہ حکم ہے۔'' اس حقیقت کے علاوہ (جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے) شہنشاہ جو بات محسوس کرنے میں ناکام ہوئے ہیں وہ یہ ہے کہ اسلام نے ایسا کوئی حکم کبھی بھی نہیں دیا اور پیغمبرؐ نے کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ بنیادی طور پر کوئی نئے اصول یا عقائد لائے ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''تم سے وہی باتیں کہی جاتی ہیں جو تم سے پہلے اور پیغمبروں سے کہی گئی تھیں'' (قرآن ۴۱:۴۳) اور ''کہہ دو کہ میں کوئی نیا پیغمبر نہیں آیا۔ اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کیا (کیا جائے گا) میں تو اس کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی آتی ہے اور میرا کام تو اعلانیہ ہدایت کرنا ہے''۔ (قرآن ۴۶:۹)

یوں، ایک اللہ پر ایمان کسی ایک مذہب کے ماننے والوں تک محدود نہیں ہے۔ مسلمانوں کے عقائد کے مطابق تمام سچے پیغمبروں نے مختلف زمانوں میں مختلف لوگوں کو ایک ہی قسم کی سچائی کی تبلیغ کی ہے۔ قوانین مختلف ہو سکتے ہیں لیکن سچائی غیر متغیر ہوتی ہے۔

ماہرین اسلام یا اسلام کا علم رکھنے والے

آپ نے ایک مقام پر اسلام کا علم رکھنے والوں کا عمومی حوالہ دیا ہے اور دو کیتھولک اسکالرز پروفیسر (ایڈل) تھیوڈور خوری اور (ایسوسی ایٹ پروفیسر) راجر آرنالڈیز کا نام لے کر ذکر کیا ہے۔ یہاں یہ کہنا کافی ہوگا کہ کئی مسلمانوں کی نظر میں ہمدردی رکھنے والے غیر مسلموں اور کیتھولک مذہب کے ماننے والوں کو اسلامی علوم کے ماہرین کی حیثیت سے تسلیم کیا جا سکتا ہے لیکن ہماری اطلاع کے مطابق جنہیں آپ اسلامی علوم کے ماہر کہتے ہیں یا جنہیں آپ مسلمانوں یا ان کے طرز فکر کا نمائندہ سمجھتے ہیں مسلمان انہیں تسلیم نہیں کرتے۔ ۲۵ر ستمبر ۲۰۰۶ء کو آپ نے اپنے اس اہم بیان کا اعادہ کیا جو آپ نے ۲۰ر اگست ۲۰۰۵ء کو کولون میں دیا تھا کہ ''مسیحیوں اور مسلمانوں کے درمیان بین المذاہب اور بین الثقافتی مکالمے کی اہمیت کسی زائد یا اضافی شے کی حیثیت سے کم نہیں کی جا سکتی۔ فی الحقیقیت یہ ایک اہم ضرورت ہے جس کے اوپر زیادہ تر ہمارے مستقبل کا انحصار ہے۔ تاہم، ہم مکمل طور پر آپ سے متفق ہیں، ہماری رائے ہے کہ بین المذاہب مکالمے کا اہم مقصد یہ ہونا چاہیے کہ محض اپنے ہم مذہب لوگوں کے بجائے جن لوگوں کے ساتھ ہم مکالمہ کر رہے ہیں ان کے حقیقی مطالبات کو سننے اور ان پر غور کرنے کی کوشش کی جائے۔

مسیحیت اور اسلام

دنیا اور تاریخ میں مسیحیت سب سے بڑا جبکہ اسلام دوسرا بڑا مذہب ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق مسیحی دنیا کی کل آبادی کے تیسرے حصے سے زائد ہیں جبکہ مسلمان دنیا کی کل آبادی کے پانچویں حصے سے زائد ہیں۔ دونوں مذاہب کے ماننے والے مشترکہ طور پر دنیا کی کل آبادی کے ۵۵ فیصد سے زائد ہیں جس کی وجہ سے ان دونوں مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان تعلقات دنیا میں بامعنی امن قائم کرنے کے ضمن میں ایک انتہائی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ایک ارب سے زائد کیتھولک مذہب کے ماننے والوں کے رہنما ہونے اور دنیا میں کئی دیگر افراد کے لیے ایک اخلاقی نمونہ ہونے کی حیثیت سے باہمی مفاہمت کی سمت میں ان تعلقات میں پیش رفت جاری رکھنے کے حوالے سے آپ کی آواز انتہائی بااثر ثابت ہو سکتی ہے۔ پرخلوص اور بے لاگ مکالمے کے بارے میں آپ کی خواہش میں ہم شریک ہیں اور بڑھتی ہوئی باہمی

طور پر مربوط دنیا میں اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اس مخلصانہ اور بے لاگ مکالمے کی بنیاد پر پرامن اور دوستانہ تعلقات استوار کیے جائیں گے اور باہمی احترام، انصاف اور بالخصوص مارک ۱۲ اور میتھیو ۲۲ میں درج دو عظیم ترین احکام کے مطابق ہماری مشترکہ ابراہیمی روایت میں خلاصتہً جو باتیں مشترک ہیں ان کی بنیاد پر ان تعلقات کی طرح ڈالی جائے گی۔ مرقس ۳۱-۲۹:۱۲ اور متی ۴۰-۳۷:۲۲ میں مختلف صورت میں درج یہ دو عظیم ترین احکام حسب ذیل ہیں:

"خداوند، ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے اور تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ۔ دوسرا یہ کہ تو اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ، ان سے بڑا اور کوئی حکم نہیں"

ان دو احکام کے مقابلے میں کوئی دوسرا بڑا حکم موجود نہیں ہے۔

دوسری ویٹیکن کونسل کی جانب سے حسب ذیل الفاظ کو مسلمان تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں: "کلیسا بھی مسلمانوں کو انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ مسلمان اس خدا کی عبادت کرتے ہیں جو واحد لاشریک، زندہ، حاضر و ناظر، رحمٰن، قادر مطلق اور زمین او رآسمان کا خالق ہے اور جو بنی نوع انسان سے ہم کلام بھی ہوا ہے۔ مسلمان خدا کے پوشیدہ احکام کے سامنے بغیر کسی شرط کے تسلیم ہونے کی سعی کرتے ہیں جس طرح

> آپ کا فرمانا کہ "مسلمان کے لیے یہ تعلیم کہ خدا مطلقاً سمجھ سے بالاتر ہے" ایک ایسا خیال ہے جو گمراہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام نے خدا کے راستے میں اپنے آپ کو پیش کیا جن کے عقیدے سے مسلمان بڑی چاہت کے ساتھ اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں۔ اگرچہ مسلمان عیسیٰ کو خدا نہیں مانتے لیکن پیغمبر کی حیثیت سے ان کی تعظیم کرتے ہیں اور ان کی کنواری والدہ کی بھی عزت کرتے ہیں اور یہاں تک کہ بعض اوقات انتہائی لگن کے ساتھ انہیں پکارتے ہیں۔ مزید برآں، مسلمان روز محشر اور مردوں کے زندہ ہو جانے کے بعد خدا کی جانب سے انعام کا انتظار کرتے ہیں۔ اس وجہ سے مسلمان ایمانداری کی زندگی کو انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور خدا کی عبادت کرتے ہیں، بالخصوص نماز ادا کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور روزے رکھتے ہیں۔" (نوسٹرا ایٹیٹ، ۲۸ اکتوبر ۱۹۶۵ء)

آنجہانی پوپ جان پال II، مسلمان جن کی انتہائی قدر اور تعظیم کرتے ہیں، وہ ان کے الفاظ کی بھی اسی طرح قدر کرتے ہیں:

"ہم مسیحی برادری اسلام کے ساتھ مشترکہ مذہبی اقدار کو بخوشی تسلیم کرتے ہیں۔ آج میں اس بات کو دہرانا پسند کروں گا جو میں نے کیسا بلانکا میں چند سال پہلے نوجوان مسلمانوں سے کہی تھی۔ 'ہم ایک ہی خدا کو مانتے ہیں' وہ خدا جو واحد لاشریک، حاضر و ناظر، خالق کائنات ہے اور جو اپنی مخلوق کو ان کی تکمیل کے مراحل تک پہنچاتا ہے"۔ (انسیگنیمنٹی، VIII/2، (۱۹۸۵ء) صفحہ نمبر ۴۹۷، ۵ مئی ۱۹۹۹ء کو ایک عام انٹرویو میں حوالہ دیا گیا)۔

مسلمان آپ کے بے مثال ذاتی اظہار افسوس اور آپ کی جانب سے ۱۷ ستمبر کو کی جانے والی وضاحت اور یقین دہانی کو بھی تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ آپ نے یہ وضاحت کی کہ آپ کا قول آپ کی ذاتی رائے کی عکاسی نہیں کرتا۔ ۱۶ ستمبر کو کارڈینل سیکرٹری آف اسٹیٹ ٹارسیسیو برٹون نے کلیسائی مجلس سے منسوب دستاویز (نوسٹرا ایٹیٹ) کی تصدیق کی۔ مسلمان ان تمام باتوں کی قدر کرتے ہیں۔ ۲۵ ستمبر کو مسلم ممالک سے تعلق رکھنے والے سفیروں کے مجمع کے سامنے آپ کی جانب سے تمام مسلمانوں کے لیے "مکمل اور انتہائی تعظیم" کے اظہار کو بھی مسلمان ستائش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہم سب ماضی کی غلطیوں سے اجتناب کریں گے اور مشترکہ طور پر مستقبل میں امن، باہمی رضامندی اور احترام کے ساتھ زندگی بسر کریں گے۔

تمام تعریف اللہ کے لیے ہے، نہ ہی کوئی طاقت ہے اور نہ ہی کوئی قوت ماسوائے اللہ تعالیٰ کے۔

(ذیل میں وہ نام درج ہیں جنہوں نے اس خط پر دستخط کیے ہیں)

۱- عزت مآب علامہ عبداللہ بن محفوظ بن بیہہ، پروفیسر، شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی، سعودی عرب، سابق نائب صدر، وزیر انصاف، وزیر تعلیم اور وزیر مذہبی امور، موریطانیہ

۲- پروفیسر ڈاکٹر علامہ محمد سعید رمضان البوطی، ڈین برائے شعبۂ مذہب، جامعہ دمشق، شام

۳- پروفیسر ڈاکٹر مصطفیٰ تگرییی، مفتی اعظم استنبول

۴- عزت مآب شیخ پروفیسر ڈاکٹر مصطفیٰ سیرک، مفتی اعظم وسربراہ علمائے بوسنیا و ہرزیگووینا۔

۵- عزت مآب شیخ راویل گینڈین، مفتی اعظم روس

۶- عزت مآب شیخ نیدز ادگریبس، مفتی اعظم سلووینیا

۷- شیخ الحبیب علی مشہور بن محمد بن سلیم بن حفیظ، امام تریم مسجد وسربراہ فتویٰ کونسل، تریم، یمن

۸- شیخ الحبیب عمر بن محمد بن سلیم بن حفیظ، ڈین دار المصطفیٰ، تریم، یمن

۹- پروفیسر ڈاکٹر فاروق حمدہ، پروفیسر علوم روایت، جامعہ محمد خامس، مراکش

۱۰- شیخ حمزہ یوسف ہینسن، بانی و مہتمم، زیتونہ انسٹی ٹیوٹ، کیلی فورنیا، یو ایس اے

ترجمہ: مراد علی شاہ، محمد اشرف طارق

یہ حُوریانِ فرنگی، دل و نظر کا حجاب
بہشتِ مغربیاں، جلوہ ہائے پا بہ رکاب

دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا
مہ و ستارہ ہیں بحرِ وجود میں گرداب

جہانِ صوت و صدا میں سما نہیں سکتی
لطیفۂ ازلی ہے فغانِ چنگ و رباب

سِکھا دیے ہیں اسے شیوہ ہائے خانقہی
فقیہِ شہر کو صوفی نے کر دیا ہے خراب

وہ سجدہ، رُوحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اُسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

سُنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب

ہوائے قرطبہ! شاید یہ ہے اثر تیرا
مری نوا میں ہے سوز و سرورِ عہدِ شباب

(قرطبہ میں لکھے گئے)
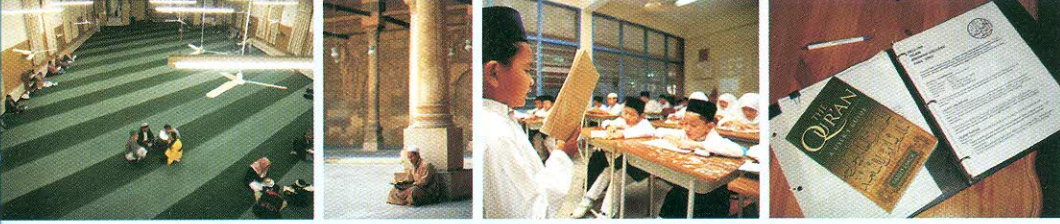
عالم اسلام اور اجتہاد
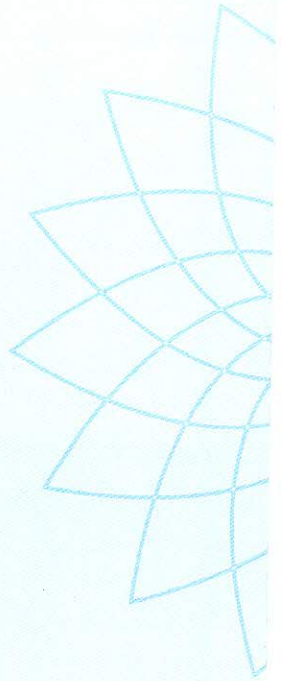
انڈونیشیا میں ریاست مذہبی حوالے سے
مکمل طور پر غیر جانبدار ہے جس کی وجہ
سے نئے خیالات پیش کرنے کی اجازت ہے
اور یوں یہاں اسلامی فکر ایک ارتقاء پزیر عمل
نظر آتا ہے جو کہ عالم اسلام میں اور کسی
جگہ موجود نہیں ہے۔ مجلس العلماء
جیسی تنظیمیں اگرچہ روایتی دینی فکر کی
علمبردار ہیں اور جدید خیالات کی نفی
کرتی ہیں لیکن وہ بھی اظہار کے غیر
متشددانہ طریقے اپناتے ہیں۔

انڈونیشیا میں

اجتہادی روایت کا ارتقا

خورشید احمد ندیم

مذہبی وثقافتی اعتبار سے انڈونیشیا دنیا کے سب سے متنوع ممالک میں سے ایک ہے۔ عالم اسلام میں تو بلاشبہ کوئی دوسرا ملک ایسا نہیں ہے جس میں اتنی نسلی وثقافتی اکائیاں جمع ہوں۔ آبادی کے حوالے سے انڈونیشیا عالم اسلام کا سب سے بڑا ملک ہے۔ ۱۹۹۰ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی کم وبیش 211 ملین نفوس پر مشتمل ہے۔ جس میں مسلمان 87 فیصد، عیسائی 9، ہندو دو اور بدھ مت کے پیروکار ایک فیصد ہیں۔ جہاں تک نسلی ولسانی اکائیوں کا تعلق ہے تو وہ ۳۰۰ تک ہیں۔

۱۹۴۹ء میں انڈونیشیا آزاد ہوا۔ اس سے پہلے یہ ہالینڈ اور پھر چند سالوں کے لیے جاپان کی نوآبادیاتی رہا۔ فکری اعتبار سے دیکھیں تو ۱۹۲۰ء کے بعد ہمیں یہاں مسلمان دو گروہوں میں تقسیم نظر آتے ہیں۔ جنہیں ہم روایت پسند اور جدت پسند کہہ سکتے ہیں۔ ان طبقات کی نمائندگی دو بڑی جماعتیں نہضۃ العلماء اور محمدیہ کرتی ہیں۔ جدت پسندوں کا ظہور بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں ہوا جب مشرق وسطیٰ بالخصوص مصر سے پڑھ کر بعض لوگ وطن واپس آئے۔ محمدیہ کو پہلی جدت پسند جماعت سمجھا جاتا ہے جس کی بنیاد ۱۹۱۲ء میں رکھی گئی۔ یہ سلفی نقطہ نظر کے حامل لوگ ہیں۔ ان کے حلقہ اثر زیادہ تر انڈونیشیا کی شہری آبادی ہے۔ آج ان کا دعویٰ ہے کہ ان کے اراکین کی تعداد ۳۰ ملین ہے۔ اس کا مرکزی دفتر یوگجکارتہ میں ہے۔

روایت پسند جماعت نہضۃ العلماء ۱۹۲۶ء میں قائم ہوئی۔ اس کے اراکین کی تعداد ۴۰ ملین ہے اور اس کے متاثرین زیادہ تر دیہی آبادی کے لوگ ہیں۔ شہروں میں بھی بہرحال اس سے متاثرہ لوگوں کی بڑی تعداد آباد ہے۔ اس کا صدر دفتر جکارتہ میں ہے۔ نہضۃ العلماء کا کہنا ہے کہ وہ مسلک اہل سنت والجماعت پر ہے۔ اس کی وضاحت وہ یوں کرتے ہیں کہ وہ فقہ میں چاروں فقہوں، جب کہ توحید والٰہیات میں ابوالحسن اشعری وابومنصور ماتریدی اور تصوف وروحانیت میں وہ جنید بغدادی اور امام غزالی کے پیروکار ہیں۔ تاہم فقہی معاملات میں ان کا رجحان فقہ شافعی کی طرف ہے۔

سیاسی حوالے سے یہ دونوں گروہ ماشومی کے پلیٹ فارم سے متحرک رہے جو انڈونیشیا کے مسلمانوں کا ایک مشترکہ محاذ تھا اور جو ۱۹۴۳ء میں قائم ہوا۔ ماشومی انڈونیشیا میں کمیونزم اور سیکولر قومیتوں کے خلاف سرگرم عمل رہی۔ آزادی کے بعد پہلے صدر سوکارنو نے پنشیلا کے عنوان سے پانچ اصول دیے جو انڈونیشین سیاست وقومیت کی بنیاد بنے اور جنہیں تمام مذاہب کے ماننے والوں نے قومی وحدت کی اساس کے طور پر اختیار کرلیا۔ ماشومی پر جدت پسندوں کا غلبہ تھا۔ روایت پسند مغربی تعلیم وتربیت کے حوالے سے جدت پسندوں سے کم تر تھے اور ماشومی کے پلیٹ فارم پر خود کو کم نمایاں سمجھتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۵۲ء میں نہضۃ العلماء ماشومی سے الگ ہوگئی اور اس نے اپنی سیاسی جماعت بنالی۔ ۱۹۶۰ء میں صدر سوکارنو نے ماشومی پر پابندی لگادی تاہم محمدیہ وغیرہ بعد میں بھی مصروف عمل رہیں۔

۱۹۴۰ء کے آخری دنوں میں انڈونیشیا میں ایک نئے فکری رجحان کا اضافہ ہوا جسے بعض دانشوروں نے نوجدیدیت قرار دیا ہے۔ اس رجحان کے حامل زیادہ تر وہ لوگ تھے جو مغرب کے تعلیم یافتہ تھے اور جنہوں نے انڈونیشیا میں ایک نئے اسلامی فکر کی بنیاد رکھی۔ یہ لوگ نورخالص مجید (م ۲۰۰۶ء) کی طرح انفرادی حیثیت میں سرگرم ہیں اور اسی طرح محمدیہ اور نہضۃ العلماء جیسی تنظیموں میں بھی شامل ہیں جسے شافعی معارف اور امین رئیس محمدیہ کا حصہ ہیں۔ ان لوگوں کا زیادہ اصرار اجتہاد پر ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شریعت کے ظاہری لبادے سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی روح اور جوہر پر زیادہ توجہ دی جائے۔

نہضۃ العلماء اور محمدیہ دونوں عملی سیاست سے دور ہیں اور نہضۃ العلماء کے لوگ اس کا برملا اعتراف کرتے ہیں کہ عملی سیاست میں حصہ لینا ان کی غلطی تھی۔ یہ جماعتیں ثقافتی اور سماجی سطح پر سرگرم ہیں اور تعلیم کے ذریعے معاشرے کو بدلنے کی علمبردار ہیں۔ تاہم ان کے لوگ انفرادی حیثیت میں سیاست میں سرگرم ہیں۔ جیسے نہضۃ العلماء کے سابق صدر عبدالرحمٰن واحد انڈونیشیا کے صدر رہے اور محمدیہ کے امین رئیس پارلیمنٹ کے سپیکر رہ چکے ہیں۔ وہ ۲۰۰۴ء کے صدارتی انتخابات میں بھی امیدوار تھے۔

انڈونیشیا فکری اعتبار سے کثیر اور متنوع رجحانات کا حامل ایک ملک ہے۔ دو عوامل ایسے ہیں جنہوں نے انڈونیشیا میں اس فضا کے قیام میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ ایک مذہبی تعلیم میں آنے والی اصلاحات ہیں جو سابق وزیر مذہبی امور مکتی علی جیسے لوگوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں حکومت نے سٹیٹ انسٹی ٹیوشن آف اسلامی سٹڈیز قائم کیے۔ ۱۹۶۰ء میں اس میں مزید اصلاحات کی گئیں اور سیکولر اور مذہبی تعلیم کو جمع کرنے کوشش کی گئی۔ نہضۃ العلماء جیسی تنظیموں کے زیر اہتمام مذہبی تعلیم کے اداروں کا بھی جال بچھا ہوا ہے اور حکومتی اقدامات کے نتیجے میں اس نظام پر بھی مثبت اثرات مرتب ہوئے۔

دوسرا عامل مذہبی آزادی ہے۔ انڈونیشیا میں ریاست مذہبی حوالے سے مکمل طور پر غیر جانبدار ہے جس کی وجہ سے نئے خیالات پیش کرنے کی اجازت ہے اور یوں یہاں اسلامی فکر ایک ارتقاء پزیر عمل نظر آتا ہے جو کہ عالم اسلام میں اور کسی جگہ موجود نہیں ہے۔ مجلس العلماء جیسی تنظیمیں اگرچہ روایتی دینی فکر کی علمبردار ہیں اور جدید خیالات کی نفی کرتی ہیں لیکن وہ بھی اظہار کے غیر متشددانہ طریقے اپناتے ہیں۔ انڈونیشیا میں مذہبی فکر جس طرح آگے بڑھ رہی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں کے اہل علم ایک ایسی مذہبی تعبیر کی تلاش میں ہیں جو انڈونیشیا کی متنوع ثقافتی و مذہبی زندگی میں قابل عمل ہو۔ نور خالص مجید اس رجحان کو ''اسلامی سیکولرزم'' قرار دیتے ہیں۔ یہ بات ہمارے لیے دلچسپی کا باعث ہے کہ وہاں کی جدید مذہبی فکر پر پاکستانی سکالر ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے گہرے اثرات ہیں اور ان کا بے حد احترام کیا جاتا ہے۔ انڈونیشیا کے علمی منظر میں نمایاں ترین افراد نور خالص مجید، شافعی معارف اور رئیس امین وغیرہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے براہ راست شاگرد ہیں۔

انڈونیشیا کے کثیر الثقافتی و مذہبی ملک ہونے کی وجہ سے یہاں کے مسلمانوں کو بعض ایسے مسائل درپیش ہیں جن سے دیگر مسلمان معاشرے آشنا نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر بین المذاہب شادیوں کا مسئلہ یا ریاست کے مذہبی تشخص کا معاملہ۔ انڈونیشیا میں جدید اہل علم اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ مقامی روایات ''عادت'' اور دینی تعلیمات میں مطابقت قائم کی جائے۔ اس سے جو نتائج فکر مرتب ہوتے ہیں اسے ہم دو تین مثالوں سے سمجھ سکتے ہیں۔

۱- انڈونیشیا کی تمام اہم مذہبی جماعتوں نے پنچشیلا کو بطور اساسی فلسفہ قبول کر لیا ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ ریاست کو فکری و نظری اعتبار سے سیکولر ہونا چاہئے۔ نہضۃ العلماء اور محمدیہ سمیت دیگر اہم مذہبی طبقات اس پر یقین رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مذہبی بنیادوں پر سیاست کرنے کے خلاف ہیں اور ثقافتی و سماجی سطح پر تعلیم کے ذریعے تبدیلی کے لیے سرگرم ہیں۔

۲- انڈونیشیا کے مقامی رسم و رواج کے مطابق لے پالک کو حقیقی اولاد کی طرح سمجھا جاتا ہے۔ جب وراثت میں اس کے حصہ کا مسئلہ پیدا ہوا تو اس پر انڈونیشیا میں کافی بحث ہوئی۔ اسلام کے قدیم فہم میں چونکہ لے پالک کا کوئی باضابطہ ادارہ موجود نہیں ہے، اس لیے انڈونیشیا کے علماء نے یتیم پوتے کی وراثت کے معاملہ کی توسیع کرتے ہوئے یہ قرار دیا کہ لے پالک والدین کی وراثت میں حصہ دار ہے۔ اور اس طرح والدین اس کی جائیداد میں حصہ رکھتے ہیں ھبہ کے اصول کا اطلاق کرتے ہوئے انہوں نے انڈونیشیا میں یہ قانون بنایا کہ مرنے والے کی ایک تہائی جائیداد میں سے باقی رہنے والے حقدار ہوں گے۔ اس طرح وہاں کی مقامی روایات اور مذہب کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی۔

کچھ ایسا ہی معاملہ بیٹے اور بیٹی کے حصہ کے بارے میں ہے۔ اسلامی قانون کے مطابق وراثت میں بیٹی کا حصہ بیٹے کے نصف کے برابر ہے۔ انڈونیشیا کے قانون میں یہ مساوی ہے۔ میں نے جب اس بارے میں ایک ملاقات کے دوران میں نہضۃ العلماء کے سابق رہنما اور انڈونیشیا کے سابق صدر عبدالرحمٰن واحد سے پوچھا تو انہوں نے ذاتی تجربے کے حوالے سے اس میں تطبیق کا ذکر کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ جب انکے والد فوت ہوئے تو انہوں نے اپنے بھائیوں کو یہ تجویز دی کہ وہ اپنے حصے سے رضا کارانہ طور پر بہنوں کو اسطرح سے حصہ دے دیں کہ سب کو برابر مل جائے اور پھر اس پر ہی عمل کیا گیا۔

جکارتہ: مہمان مدیر اجتہاد انڈونیشیا کے سابق صدر اور سکالر عبدالرحمٰن واحد کے ساتھ

۳- اسلامی قانون کے مطابق ایک مسلمان مرد کتابیہ عورت سے شادی کر سکتا ہے لیکن مسلمان عورت کسی غیر مسلم سے شادی نہیں کر سکتی۔ انڈونیشیا میں نور خالص مجید جیسے بعض سکالرز نے یہ رائے اختیار کی ہے کہ بین المذاہب نکاح کی اجازت ہے۔ اس مسئلہ کا خصوصی تعلق انڈونیشیا کی فضا سے ہے جہاں اس نوعیت کے واقعات نسبتاً زیادہ ہیں۔ یہ مسئلہ چونکہ اب مغرب وغیرہ میں مسلمانوں کو درپیش ہے، اس لیے بعض دیگر علماء مثلاً علامہ یوسف القرضاوی اور ڈاکٹر حسن ترابی بھی، اب اس طرح کے نکاح کو بعض شرائط کے ساتھ درست سمجھتے ہیں۔

ان مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انڈونیشیا میں اجتہاد کا عمل کس طرح آگے بڑھ رہا ہے اور وہاں کے اہل علم کس طرح روزمرہ کے مسائل کو شریعت کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس طرح وہاں مجلس العلماء جیسے گروہ بھی موجود ہیں جو ان تعبیرات سے اتفاق نہیں کرتے اور وہ بھی معاشرے میں تمام مہذب اور جمہوری طریقوں سے اپنی آواز پہنچا رہے ہیں اور ان سب کی مشترکہ کاوشوں کے نتیجے میں معاشرے میں فکری ارتقاء اور غور و فکر کا عمل جاری ہے۔

جدید انڈونیشیا میں
شریعت و سیاست

ایک اہم کتاب کا مطالعہ

ریاستی و سیاسی امور میں اسلام کا کردار، ان چند موضوعات میں سے ایک ہے جن پر معاصر عالم اسلام میں شد و مد کے ساتھ بحث جاری ہے۔ زیر نظر کتاب ''جدید انڈونیشیا میں شریعت و سیاست''، جیسا کہ اس کے عنوان سے واضح ہے، انڈونیشیا کے حوالے سے اس موضوع پر ایک اہم کتاب ہے۔ یہ کتاب متعدد اہل علم کے مقالات پر مشتمل ہے، جسے ارسکل سلیم اور عظیم اردوی عذرا نے مرتب کیا ہے۔ سلیم سٹیٹ اسلامی یونیورسٹی جکارتہ کے شعبہ مطالعہ سیاست اسلامی میں استاد ہیں اور یونیورسٹی آف ملبورن، آسٹریلیا میں پی ایچ ڈی کے طالب علم ہیں۔ عذرا شریف ہدایت اللہ سٹیٹ اسلامی یونیورسٹی جکارتہ کے ریکٹر اور تاریخ کے استاد ہیں۔ انہوں نے کولمبیا یونیورسٹی سے ۱۹۹۲ء میں پی ایچ ڈی کیا۔ یہ کتاب انسٹیٹیوٹ آف ساؤتھ ایشین سٹڈیز، سنگاپور کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے۔

اس کتاب کے بارہ ابواب ہیں، جن میں آزادی سے پہلے انڈونیشیا میں قانون و سیاست کے باہمی تعلق کے ساتھ آزاد انڈونیشیا میں اسلامی حوالے سے ہونے والی قانون سازی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ''انڈونیشین قانون نکاح ۱۹۷۴ء''، ''مذہبی قانون ۱۹۸۹ء'' کو بطور خاص مطالعہ کا موضوع بنایا گیا ہے۔ علاوہ ازیں انڈونیشیا میں اسلامی قوانین کی تشکیل کے پس منظر میں موجود سیاسی محرکات، انڈونیشیا کا پہلا اسلامی بینک، انڈونیشیا کے نظام ریاست میں زکوٰۃ کی تنظیم بھی اس کتاب میں زیر بحث آنے والے اہم موضوعات ہیں۔

کتاب کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انڈونیشیا میں اسلام مزاحمت کی ایک علامت کے طور پر اس وقت بھی موجود تھا جب انڈونیشیا ہالینڈ کی نو آبادیاتی تھا اور اس کے بعد ایک آزاد انڈونیشیا میں بھی اسلام اس حیثیت میں موجود ہے۔ انڈونیشیا میں شریعت کی تاریخ دراصل ایک غیر اسلامی یا اسلام مخالف سیاسی نظام میں ایک مناسب مقام کے حصول کی جدوجہد سے عبارت ہے (صفحہ ۳۴)۔ ۱۸۸۲ء تک یہاں شریعت کو بہت کم اہمیت حاصل تھی اور پھر ۱۹۳۷ء میں تو مزید کم ہوگئی۔ ۱۸۸۵ء کی دہائی سے لے کر دوسری جنگ عظیم تک، ایک نو آبادیاتی ریاست کے ارباب حل وعقد میں، یہ بحث جاری رہی کہ اسلام کی معاشرتی و سیاسی سطح پر کیا حیثیت ہے اور قانون بالخصوص ''عادت'' کے ساتھ اس کا تعلق کیا ہے؟ عادت کے حامیوں کی دلیل یہ تھی کہ انڈونیشیا کے مسلمان اگر ''بدعتی'' مسلمان نہیں تو بہرحال برائے نام مسلمان ضرور ہیں۔ ان کی رائے کی بنیاد یہ ہے کہ انڈونیشیا کا اسلام کسی نصاب یا کتاب پر مبنی نہیں (Non-Sculptural) ہے، خاص طور پر سماجی رسوم کے حوالے سے۔ اس ضمن میں وراثت کے مسئلہ کو بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف اسلام کے حامی یہ رائے رکھتے تھے کہ عالم اسلام میں ہر جگہ اسلام ایک مقامی رنگ لیے ہوئے ہے لہٰذا مذہب کے غیر نصابی اظہار سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ ایک مسلمان برائے نام (Nominal) مسلمان ہوگیا ہے۔

بعد میں جاپانی دور اقتدار میں حکمرانوں نے اسلام کو ریاست میں اہمیت دی اور ۱۹۴۵ء سے اسلام انڈونیشیا کی سیاسی زندگی کا ایک بنیادی رکن ہے۔ جہاں تک ریاستی اور قانونی امور کا تعلق ہے تو ہالینڈ نے ۱۸۸۲ء میں نو آبادیاتی مذہبی عدالتی نظام کے تحت ایک قانون بنایا۔ اس قانون کی بنیاد پر جو ۱۹۳۷ء میں تشکیل نو کے مرحلہ سے گزرا، جاوا، مادورا، بنجر ماسن اور جنوبی بورنیو کے ملحقہ علاقوں میں مذہبی عدالتیں قائم ہوئیں۔ ۱۹۵۷ء میں، آزادی کے بعد انڈونیشیا کی حکومت نے قانون سازی کرتے ہوئے اس نظام کو سارے ملک تک پھیلا دیا۔ ۱۹۸۹ء کی اصلاحات تک اس قانون کے تحت مذہبی عدالتیں قائم ہوتی رہیں۔ جوہری طور پر یہ قانون طریقہ کار ہی سے متعلق رہا اس کی اکثر شقیں یہ بیان کرتی تھیں کہ عدالتی اہلکاروں کی تعیناتی کیسے ہوگی اور ان کی ذمہ داریاں کیا ہوں۔ شریعت کے ضروری اصولوں کا کہیں ذکر نہیں تھا۔ مذہبی عدالتوں کا یہ نظام دراصل سیکولر (غیر مذہبی) بنیادوں پر ترتیب دیا گیا تھا۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں شریعت کا عملی نفاذ ممکن نہ ہوسکا۔ سیکولر طریقہ کار کی بناء پر اس بات کا کوئی امکان نہ رہا کہ قدیم فقہ کے اصولوں کو ملحوظ رکھا جائے۔ اس طرح گواہی کے فقہی قوانین تو مکمل طور پر خارج کر دیے گئے۔ ۱۹۳۷ء میں مذہبی عدالتوں کے دائرہ کار کو مزید محدود کر دیا گیا۔ خاص طور پر جہیز اور نکاح و طلاق کے مسائل میں۔

لین دین کے دیگر دعوے تو ویسے ہی سول عدالتوں کے ماتحت تھے۔ آزادی کے بعد حکومت نے یہ طے کر دیا کہ جائیداد کے معاملات میں شریعت کو استعمال نہ کیا جائے۔ اس کی وجہ سے کئی مسائل نے جنم لیا جو بدستور موجود ہیں۔ مثال کے طور پر عائلی معاملات، خاص طور پر زرعی سماج میں، جائیداد اور زمین سے الگ نہیں کیے جاسکتے۔ ۱۹۷۰ء میں عدالتی اتھارٹی کے قانون کے تحت سپریم کورٹ کو یہ حق دے دیا گیا کہ وہ مذہبی عدالتوں پر اور عدالتی نظام کے ہر حصے پر فوقیت رکھتی ہے۔

آزادی کے بعد مذہبی عدالتوں کی کارکردگی کے حوالے سے دو امور اہم ہیں: ایک تو یہ کہ ان عدالتوں پر جو مصنوعی پابندیاں عائد کی گئیں، انہیں اکثر نظر انداز کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے مذہبی عدالتوں نے فتاویٰ کی بنیاد پر فیصلے دیے۔ قدیم فقہی روایت میں فتویٰ ایک رسمی اہمیت کا حامل ہے۔ انڈونیشیا کے تناظر میں، دیہی اور زرعی زندگی کے حوالے سے، فتوے نے ایک قانونی حیثیت اختیار کر لی۔ دوسرا یہ کہ کسی باضابطہ قانونی دفعات کی غیر موجودگی کے باعث طلاق کے عمل میں عدالتوں نے ''شدید اختلاف'' کے معاملہ کی اجتہادی سطح پر تعبیرات کیں۔ کلاسیکی فقہ میں ''شقاق'' حاکم اور میاں بیوی کے مابین ثالثی کا ایک عمل ہے اور طلاق کا حق بہرحال مرد ہی کو حاصل ہے۔ تاہم ۱۹۸۹ء کے بعد مذہبی عدالتوں نے اس کی یہ تعبیر کی کہ ''شقاق'' بیوی کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ طلاق کے لیے مذہبی عدالت سے رجوع کر سکتی ہے۔ اس طرح عورتوں کو یہ حق میسر آ گیا کہ وہ عدالت کے ذریعے طلاق حاصل کر سکتی تھیں جبکہ کلاسیکی فقہ میں اس مسئلہ کا کوئی حل موجود نہیں ہے۔ یہ دراصل مذہبی عدالتوں پر عائد غیر ضروری پابندیوں کا ردعمل تھا۔

آسٹریلیا میں قومی یونیورسٹی میں قانون کے استاد ایم بی ہوکر کا خیال ہے کہ یہ صورت حال ہمیں حضائرن (Hazairin) کی اس تجویز کی طرف متوجہ کرتی ہے جو ۱۹۶۰ء کی دہائی میں پیش کی گئی تھی۔ اس کے تحت ایک انڈونیشین فقہ کی تشکیل کو ضروری قرار دیا گیا تھا۔ ایک حوالے سے یہ ناممکن دکھائی دیتا ہے لیکن اگر اسے قانونی ضرورت کے تحت دیکھا جائے تو یہ خیال کچھ جائے تو یہ خیال کچھ نہیں رہتا۔

ریاستی سطح پر نفاذ اسلام کے حوالے سے ایک اہم قدم جنوری ۱۹۴۶ء میں وزارت مذہبی امور کا قیام ہے۔ اس وزارت کے تحت نکاح وطلاق، مذہبی عدالتوں کی تنظیم اور وقف کے امور کی تنظیم سازی کی گئی اس کے نتیجے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کی انتظامی حیثیت میں اضافہ ہوا۔

۱۹۹۱ء میں تدوین احکام اسلام کے قانون کو بھی اس ضمن میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس کی حیثیت کسی قانون کی نہیں بلکہ یہ ایک ہدایت نامہ ہے جو قابل نفاذ قوانین کے لیے ججوں سے متعلق ہے جسے انہوں نے مذہبی انصاف کے اداروں کے حدود کار کے دائرے میں، دائر شدہ مقدمات میں اختیار کرنا ہے۔ قابل نفاذ قوانین کے لیے بطور ماخذ پانچ ذرائع کا ذکر کیا گیا ہے:

۱- فقہ شافعی کی مصدقہ کتب
۲- دیگر مذاہب کی کتب (اضافی)
۳- موجودہ قوانین
۴- علماء کے فتاویٰ
۵- دیگر ممالک کے حالات و نظائر

اس تدوین کے تین حصے ہیں: نکاح وطلاق، وراثت اور وقف۔

اس کتاب کا ایک اہم باب انڈونیشیا کی سیاست میں فتویٰ کے کردار پر ہے (باب ۹: نادر شاہ حسین)۔ بیسویں صدی کے آغاز تک یہاں اجتہاد علماء کے ہاں ایک انفرادی عمل تھا۔ ۱۹۲۵ء کے بعد ہمیں انڈونیشیا میں اجتماعی اجتہاد کا تصور ملتا ہے۔ ۱۹۲۶ء روایتی علماء نے ایک جماعت ''نہضۃ العلما'' قائم کی اور اس کے پہلے اجتماع ہی سے فتاویٰ کی روایت کا آغاز ہو گیا۔ ایک دوسری جدت پسند تنظیم ''محمدیہ'' جو ۱۹۱۲ء میں قائم ہوئی، اس کے ہاں ۱۹۲۷ء تک فتویٰ کی روایت نہیں ملتی اس سال اس جماعت کے زیر اہتمام ایک مجلس ترجیح قائم کی گئی جس نے مذہبی معاملات میں اسلامی قانون کے تحت رائے دینا شروع کی۔ ۱۹۷۵ء میں مجلس العلماء انڈونیشیا قائم ہوئی۔ اس میں روایت اور جدت پسند، دونوں طرح کے علماء موجود ہیں جو متفقہ فتاویٰ جاری کرتے ہیں۔

انڈونیشیا کے اجتماعی فتویٰ کے حوالے سے دو امور ایسے ہیں جو اسے منفرد بناتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ تنظیم فتویٰ جاری کرنے سے پہلے ایک اجلاس منعقد کرتی ہے جس میں اس تنظیم کے علماء شریک ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بوقت ضرورت دیگر سکالرز حضرات کو بھی مدعو کیا جاتا ہے دوسرا یہ کہ فتویٰ میں کثرت ہوتی ہے۔ یعنی یہ ممکن ہے کہ ایک معاملہ میں مختلف تنظیموں کی طرف سے ایک سے زیادہ آراء سامنے آئیں۔ اس طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ایک تنظیم صوبائی سطح پر ایک فتویٰ دے رہی ہو اور وہی مرکزی سطح پر کوئی دوسرا فتویٰ جاری کر رہی ہو۔ علماء کے فتویٰ نے انڈونیشیا کی سیاست کو کئی طرح سے متاثر کیا ہے مثال کے طور پر ہالینڈ سے آزادی کی جدوجہد کے حق میں علماء
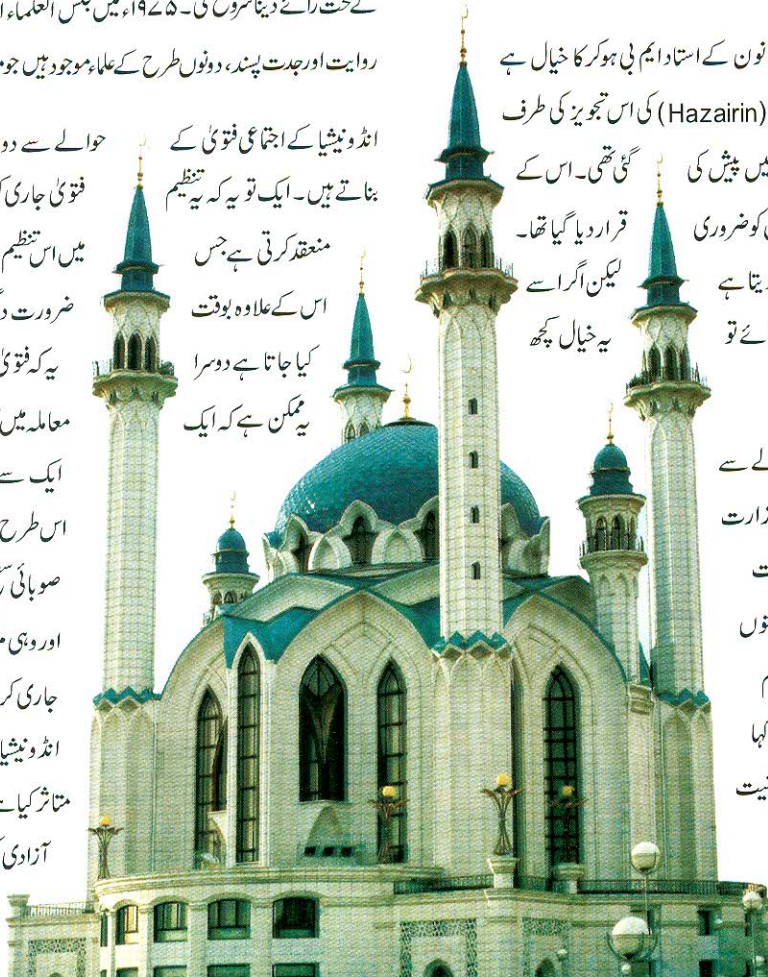
نے فتویٰ دیا اور اسے جہاد قرار دیا۔ آزادی کے بعد مختلف حکومتی فیصلوں کے حوالے سے بھی فتوے دیے گئے۔ یہ فتوے کبھی حکومت کے حق میں گئے اور کبھی مخالفت میں۔ مثال کے طور پر نہضۃ العلماء، محمدیہ اور مجلس علماء تینوں نے خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں فتویٰ دیا جس سے حکومت کی بہبود آبادی کی حکمت عملی کو فائدہ پہنچا۔ دوسری طرف غیر شادی شدہ جوڑوں کے کنڈوم کے استعمال پر علماء نے مخالفانہ فتوے دیے۔ اس طرح رؤیت ہلال کے مسئلہ پر بھی علماء نے حکومتی موقف سے اختلاف کیا۔

زیر نظر کتاب کا ایک اہم باب اس سوال سے بحث کرتا ہے کہ معاصر انڈونیشیا میں اسلامی اقدار کی کیا اہمیت ہے اور اس ضمن میں حکومتی و ریاستی سطح پر مختلف طبقات کا کیا رویہ ہے (صفحہ ۱۹۳ تا ۲۱۳)۔ اس باب کے مصنف Howard Federspeil نے سب سے پہلے جس طبقے کا ذکر کیا ہے اسے ''محافظ'' کا نام دیا ہے۔ اس میں منصب صدارت، افواج اور وزارت امن و امان وغیرہ شامل ہیں۔ یہ طبقہ دراصل اس نظام کا محافظ ہے جسے ''نیا نظام'' کہا جاتا ہے اور جو ''پنشیلا'' پر مبنی ہے۔ یہ پانچ اصول جو صدر سوئیکارنو نے دیے، ۱۹۴۵ء کے آئین کی اساس ہیں۔ ان میں اللہ پر ایمان، انسانیت، قومیتیں، جمہوریت اور سماجی انصاف شامل ہیں۔ یہ محافظ ان اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے ریاست کو دو خطرات سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں: ایک تو انڈونیشیا کی کمیونسٹ پارٹی کے اثرات سے جو ۱۹۶۰ء کی دہائی میں بہت سرگرم رہی۔ دوسرا خطرہ انہیں دائیں بازو کے انتہا پسند مسلمان گروہوں سے ہے۔ یہ ریاست کو ان دو دشمنوں سے محفوظ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ محافظ اسلام کے مخالف نہیں بلکہ معاشرتی سطح پر ایک اخلاقی ڈھانچہ کی تشکیل کے حوالے سے اسے اہم سمجھتے ہیں۔ نئے نظام کے تحت انڈونیشیا میں صرف پانچ مذاہب کی قانونی حیثیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اسلام، کیتھولک عیسائیت، پروٹسٹنٹ عیسائیت، ہندوازم اور بدھ مت۔

یہ محافظ اسلام کے نام پر ہونے والی سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں بھی شک میں مبتلا رہتے ہیں۔ چنانچہ وہ ایسے اقدامات کرتے رہتے ہیں جن سے یہ سرگرمیاں ایک خاص دائرے سے بڑھنے نہ پائیں۔ مسلمانوں کو ایک مذہبی گروہ کے طور پر وہ اس بات کی آزادی دیتے ہیں کہ وہ اپنی مذہبی ذمہ داریاں آزادی سے سرانجام دیں۔ اس حوالے سے مذہبی عدالتوں کے کردار کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

دوسرا طبقہ وزارت منصوبہ بندی اور وزارت خزانہ، مالیات جیسے اداروں پر مشتمل ہے جسے مصنف نے ''ٹیکنوکریٹس'' کا نام دیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو زیادہ تر مغرب سے تعلیم یافتہ ہیں اور ان کا خیال ہے کہ مغرب کے معاشی و سیاسی نظام کو انڈونیشیا کی معاشرت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اختیار کر لینا چاہئے۔ اس ضمن میں انہیں مسلمانوں کے خیالات سے زیادہ سروکار نہیں ہے، جیسا کہ معاشی نظام میں سود کا معاملہ ہے۔

تیسرا طبقہ وہ ہے جسے ''اہل تعلیم'' کا نام دیا گیا ہے۔ یہ محکمہ تعلیم وغیرہ سے متعلق لوگ ہیں یا وہ جو سماجی بہبود کے شعبہ میں مصروف ہیں۔ یہ قومی زبان بھاشا کی بنیاد پر ایک نظام تعلیم کی تشکیل کے لیے مصروف کار ہیں۔ اگرچہ انڈونیشیا کے تعلیمی نظام میں عیسائی نمایاں ہیں لیکن مسلمان بھی کم نہیں ہیں۔ مسلمان اور عیسائی گروہ نجی حوالے سے بھی تعلیم کے شعبہ میں بہت کام کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں محمدیہ کا کام بہت اہم ہے، دوسری طرف روایتی علماء کا زیادہ کام مذہبی شعبے میں ہے۔ حکومت کا چوتھا طبقہ وزارت مذہبی امور اور اس سے متعلق اداروں پر مشتمل ہے۔ اس نظام کے تحت اہم ترین تعلیمی نظام ''پسنترن'' کہلاتا ہے جو انڈونیشیا میں اسلامی رہائشی تعلیمی اداروں کا سب سے بڑا نجی نظام ہے جسے حکومتی تائید و نصرت حاصل ہے، نظام ہے۔ یہاں عربی زبان کی تدریس کے ساتھ اسلامی علوم پڑھائے جاتے ہیں جن میں فقہ شافعی کو مرکزیت حاصل ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور ادارہ ''قومی اسلامی تعلیمی ادارہ'' ہے جو

> کتاب کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انڈونیشیا میں اسلام مزاحمت کی ایک علامت کے طور پر اس وقت بھی موجود تھا جب انڈونیشیا ہالینڈ کی نوآبادیاتی تھا اور اس کے بعد ایک آزاد انڈونیشیا میں بھی اسلام اس حیثیت میں موجود ہے۔ انڈونیشیا میں شریعت کی تاریخ دراصل ایک غیر اسلامی یا اسلام مخالف سیاسی نظام میں ایک مناسب مقام کے حصول کی جدوجہد سے عبارت ہے

اسلامی تعلیم کے لیے اساتذہ وغیرہ تیار کرتا ہے۔ انڈونیشیا کے مضبوط قومی ریاست کے تصور کے باوجود یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ریاست اسلامی اقدار کے ساتھ مطابقت رکھ سکتی ہے۔ وزارت مذہبی امور کے مسلمان اہل کاروں کے لیے مقدس قانون کو جو اہمیت حاصل ہے وہ حکومت کے کسی دوسرے شعبہ میں حاصل نہیں۔ یہ قانون شریعت اور توحید کے اصولوں پر مبنی ہے۔

ان چار حکومتی رویوں کے ساتھ اس کتاب میں اسلامی قانون و اقدار کے حوالے سے اہل دانش و سکالرز کے رویوں کا بھی مطالعہ کیا گیا ہے۔ یہ وہ گروہ ہے جو نوآبادیاتی دور میں انڈونیشیا کی آزادی کے لیے سرگرم رہا اور پھر اس کی آزادی کے بعد بھی مصروف کار ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جو غیر مسلم ہے اور جو انڈونیشیا کے بطور قومی ریاست اقدار کا مطالعہ کرتا ہے اور اسلام کو محض ایک کلچرل عامل کے طور پر دیکھتا ہے۔ اسی طرح کا ایک گروہ ''سنٹر فار سٹریٹیجک اینڈ انٹرنیشنل سٹڈیز'' کے نام سے منظم ہے جو انڈونیشیا کی خارجہ پالیسی کو موضوع بنائے ہوئے ہے۔ مسلمان اہل دانش کا ایک طبقہ اپنے طور پر اسلام کو انڈونیشیا کی نسلی زندگی میں ایک غالب عنصر کے طور پر پیش کرتا رہا ہے۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کی دہائیوں میں یہ اگس سلیم کی مرکزیت میں کام کرتے رہے اور ۱۹۴۰ء، ۱۹۵۰ء کی دہائیوں میں محمد ناصر کے گرد۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی

میں مسلمان اہل دانش کی ایک تحریک ابھری جو انڈونیشیا کی معاشی، سماجی اور سیاسی ترقی کے لیے کام کر رہی ہے۔ یہ تحریک ۱۹۹۰ء میں آ کر جزوی طور پر حکومت سے وابستہ انڈونیشین سکالرز ایسوسی ایشن کا حصہ بن گئی۔ اس ایسوسی ایشن کے قیام سے پہلے مسلمان اہل دانش جو اس مقصد کے لیے مصروف کار تھے وہ زیادہ تر نوجوان اور متوسط عمر کے تھے۔ وہ یونیورسٹی آف شکاگو، یونیورسٹی آف الینائس جیسے اداروں سے تعلیم یافتہ تھے۔ یہ لوگ ایک طرف اسلام کے ساتھ گہری وابستگی رکھتے تھے اور دوسری طرف اسلام کے مطالعہ میں ان تجزیاتی طریقوں کو استعمال کرتے تھے جو انہوں نے مغرب سے سیکھے۔ تقویٰ اور توحید کی مرکزیت پر کھڑا یہ گروہ شریعت پر عمل درآمد کو ضروری سمجھتا تھا۔ ان لوگوں کے لیے ماضی کے مقابلہ میں معاصر دنیا کے مسلمان علماء بالخصوص ڈاکٹر فضل الرحمٰن، اسماعیل فاروقی، محمد ارکون اور سید حسین نصر کے افکار وخیالات زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح انفرادی حیثیت میں سرگرم نور خالص مجید اور امین رئیس جیسے لوگ بھی اپنے اثرات رکھتے ہیں۔ جو اصولی طور پر اس طبقے سے متعلق ہیں۔ یہ لوگ موجودہ ریاستی نظریہ کو قبول کرتے ہیں تاہم ان کا کہنا ہے کہ اسلامی اقدار کی زیادہ شمولیت سے اس نظریے کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ نور خالص مجید اور عبدالرحمٰن واحد جیسے اہل علم اسلامی اقدار اور ریاستی پالیسی کے مابین زیادہ سے زیادہ اشتراک کے قائل ہیں۔ اس گروہ کے ساتھ اہل علم کا ایک طبقہ وہ ہے جس نے مشرق وسطیٰ سے تعلیم حاصل کی۔ یہ شریعت کو نسبتاً روایتی مفہوم میں لیتے ہیں۔ یہ حضرات مصری مصنفین احمد شلتوت اور المراغی کا زیادہ حوالہ دیتے ہیں اگرچہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن جیسے اہل علم سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔

عوامی سطح پر بھی اسلامی اقدار کے ساتھ وابستگی اور تعلق کی کئی صورتیں ہیں۔ ایک رویہ وہ ہے جو غیر مسلموں کا ہے اور یہ انڈونیشیا کی آبادی کے پندرہ سے بیس فیصد پر مشتمل ہے۔ یہ اس بات کے خلاف ہیں کہ ریاستی وسماجی معاملات میں اسلام کے عمل دخل میں اضافہ ہو۔ یہ احساس عیسائیوں میں شدید تر ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہندوؤں اور بدھ مت کے پیروکاروں میں بھی موجود ہیں۔

مسلمانوں میں اسلام کے ساتھ وابستگی کا تعلق اس بات سے ہے کہ وہ کس سماجی طبقے سے متعلق ہیں، ان کا تعلیمی پس منظر کیا ہے یا سیاسی شناخت کون سی ہے۔ مثال کے طور پر اسلامی فرائض وذمہ داریوں کے بارے میں اتچ کے لوگ زیادہ باعمل ہیں اور جاوا کے لوگ کم۔ دینی مدرسے کے قریب رہنے والے اسلام سے زیادہ وابستہ ہیں اور شہری آبادی کے لوگ اس حوالے سے نسبتاً کم حساس ہیں۔ علاقائی کلچر کی تعمیر میں ''عادت'' (سماجی روایات) کو آج بھی بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ مشرقی اور وسطی جاوا میں نقطۂ نظر کے اختلاف کے باعث مسلمانوں کے دو گروہوں کے مابین تاریخی دشمنی رہی جس میں خون خرابے کے واقعات بھی ہوئے۔ سیاسی طور پر عام آدمی ''محافظ'' طبقے کے پیچھے چلتا ہے اور ریاست کی ان بنیادوں کو مانتا ہے جو پنچشیلا سے ماخوذ ہیں۔ گولکر وہاں کی مقبول ترین سیاسی جماعت ہے جو اسلام مخالف نہیں تو غیر اسلامی ضرور ہے۔ تاہم وہ مساجد کی تعمیر، رمضان میں زکوٰۃ کو جمع کرنے جیسے امور کو اہمیت دیتی ہے۔ انڈونیشیا کے مسلمانوں کی بڑی تعداد ایسی ہے جو بطور شہری اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے ساتھ ساتھ بطور مسلمان اپنے فرائض کی ادائیگی کو بہت اہمیت دیتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو زیادہ تر نہضۃ العلماء اور محمدیہ کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اسی طرح ایک گروہ احیائی مسلمانوں کا ہے جو مطالعہ قرآن وحدیث پر بہت توجہ دیتے ہیں اور اپنی اسلامی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے سنجیدہ ہیں۔ پچھلے سالوں میں ان کے وابستگان کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ آبادی کا ایک مختصر حصہ ایسے مسلمانوں پر مشتمل ہے جو انفرادی اور عائلی وخاندانی سطح پر اسلامی قانون کے اتباع کو اہمیت دیتے ہیں۔ ایک بنیاد پرست مسلمان احمد حسن (متوفی ۱۹۵۸ء) کی کتاب ''سوال وجواب'' ان لوگوں میں آج بھی بے حد مقبول ہے جو ۱۹۳۰ء میں لکھی گئی۔ اس طرح ایک اور کتاب ''چالیس مسائل'' بھی بہت پڑھی جاتی ہے۔ ان میں روزمرہ نجی وعائلی مسائل کے بارے میں اسلامی احکامات بیان کیے گئے ہیں۔

اس کتاب کے مطالعہ سے انڈونیشیا میں سیاسی، سماجی، قانونی اور ریاستی سطح پر اسلام کے کردار کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ چونکہ سیاست وشریعت اس کا اصل موضوع ہے، اس لیے اس حوالے سے زیر بحث آنے والے مباحث کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ کتاب میں چار ضمیمے بھی شامل ہیں: پہلا ضمیمہ انڈونیشیا کا ریاستی قانون نمبر ۱ برائے نکاح: ۱۹۷۴ء، دوسرا ریاستی قانون نمبر سات برائے مذہبی قانون سازی: ۱۹۸۹ء، تیسرا انڈونیشیا کا صدارتی فرمان نمبر ۱ برائے تدوین احکام اسلام: ۱۹۹۱ء اور چوتھا حکومتی قانون نمبر ۲۸ برائے وقف (زمین) مع حق ملکیت: ۱۹۷۷ء پر مشتمل ہے۔

(تلخیص وتبصرہ: عبدالحفیظ)

اسلامی نظریاتی کونسل

اسلامی کونسل کم از کم آٹھ اور زیادہ
سے زیادہ بیس ایسے ارکان پر
مشتمل ہوگی جنھیں صدر ان
اشخاص میں سے مقرر کرے گا، جو
اسلام کے اصولوں اور فلسفے کا، جس
طرح کہ قرآن پاک و سنت میں ان کا
تعین کیا گیا ہے، علم رکھتے ہوں یا
جنھیں پاکستان کے اقتصادی،
سیاسی، قانونی اور انتظامی مسائل کا
فہم و ادراک حاصل ہو۔

مختصر تعارف

مارچ ۱۹۴۹ء میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے وزیر اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان کی قیادت میں قرارداد مقاصد منظور کی، جو ۱۹۵۶ء کے آئین میں تمہید کے طور پر شامل کی گئی۔ ۱۹۸۵ء میں اس قرارداد کو آئین کے آرٹیکل ۲ الف کے طور پر دستور کا باقاعدہ حصہ بنا دیا گیا۔ قوانین کی اسلامی تشکیل کے لیے اس قرارداد کے مندرجہ ذیل اقتباسات اساسی اہمیت رکھتے ہیں:

> چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی پوری کائنات کا بلاشرکت غیرے حاکم مطلق ہے اور پاکستان کے جمہور کو جو اختیار و اقتدار اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کا حق ہوگا، وہ ایک مقدس امانت ہے۔
>
> چونکہ پاکستان کے جمہور کی منشا ہے کہ ایک ایسا نظام قائم کیا جائے، جس میں مملکت اپنے اختیارات و اقتدار کو جمہور کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے گی۔
>
> جس میں جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور عدل عمرانی کے اصولوں پر، جس طرح اسلام نے انکی تشریح کی ہے، پوری طرح عمل کیا جائے گا۔
>
> جس میں مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی حلقہ ہائے عمل میں اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق، جس طرح قرآن پاک اور سنت میں ان کا تعین کیا گیا ہے، ترتیب دے سکیں۔
>
> لہٰذا، اب ہم جمہوریہ پاکستان کے عوام ... بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے اس اعلان سے وفاداری کے ساتھ کہ پاکستان عدل عمرانی کے اسلامی اصولوں پر مبنی ایک جمہوری مملکت ہوگی......۔

دستور سازی کے عمل میں طویل تاخیر ہماری تاریخ کا ایک افسوسناک باب ہے۔ تاہم ۱۹۵۶ء میں پاکستان کا پہلا دستور منصۂ شہود پر آیا تو قرارداد مقاصد کی روشنی میں آئین کے آرٹیکل ۱۹۸(۱) میں طے کیا گیا:

> ایسا کوئی قانون وضع نہیں کیا جائے گا جو قرآن پاک اور سنت میں منضبط اسلامی احکام کے منافی ہو۔۔۔اور موجودہ قوانین کو ان احکام کے مطابق بنایا جائے گا۔

اسی آرٹیکل (۱۹۸) کی ذیلی شق (۳) میں مندرجہ بالا حکم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے قرار دیا گیا کہ:

> جناب صدر دستور کے نفاذ کے دن سے ایک سال کے اندر ایک کمیشن مقرر کرینگے۔

الف۔ کہ وہ سفارشات پیش کرے۔

i موجودہ قوانین کو احکام اسلام کے مطابق بنانے کیلئے اقدامات کے بارے میں،

ii ان مراحل سے متعلق جن میں ایسے اقدامات نافذ العمل کئے جائیں؛ اور

ب۔ کہ وہ قومی اور صوبائی مجالس مقننہ کی راہنمائی کی غرض سے احکام اسلام ایسی موزوں شکل میں مدون کرے جس میں انھیں قانونی شکل دی جاسکے۔

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں جنرل محمد ایوب خان کے اقتدار پر قبضہ، مارشل لاء کے نفاذ اور ۱۹۵۶ء کے دستور کی تنسیخ کے بعد بالآخر ۱۹۶۲ء میں جو نیا دستور آیا اس میں بھی آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت اسلامی نظریہ کی مشاورتی کونسل کی تشکیل کا فیصلہ کیا گیا۔ آرٹیکل ۲۰۴(۱) میں اس کونسل کے مندرجہ ذیل فرائض منصبی طے کئے گئے:

> مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں کو ایسی سفارشات کرنا جن کے ذریعے پاکستان کے مسلمانوں کو اپنی زندگیاں ہر لحاظ سے اسلامی نظریات کے

مطابق مرتب کرنے کے قابل بنایا جاسکے، نیز اس کے لئے ان کی حوصلہ افزائی کی جاسکے اور دستور کی پہلی ترمیم کے قانون ۱۹۶۳ء کے نافذ ہونے سے فوراً پہلے نافذ العمل تمام قوانین کا جائزہ لینا تاکہ انہیں قرآن پاک اور سنت میں منضبط اسلامی تعلیمات اور تقاضوں کے مطابق بنایا جائے۔

۱۹۷۳ء کے دستور کے آرٹیکل ۲ میں اسلام کو ریاست پاکستان کا دین قرار دیا گیا ہے اور آرٹیکل ۲۲۷ تا ۲۳۱ میں قوانین کی اسلامی تشکیل اور اس مقصد کے لئے کونسل کے کردار کی وضاحت سے تصریح کر دی گئی ہے۔ آرٹیکل ۲۲۷ (۱) میں بصراحت قرار دیا گیا ہے کہ:

> تمام موجودہ قوانین کو قرآن پاک اور سنت میں منضبط اسلامی احکام کے مطابق بنایا جائے گا، جن کا اس حصے میں بطور اسلامی احکام حوالہ دیا گیا ہے، اور ایسا کوئی قانون وضع نہیں کیا جائے گا جو مذکورہ احکام کے منافی ہو۔

اسی آرٹیکل کی ذیلی شق (۲) میں مزید تصریح کر دی گئی ہے کہ ذیلی شق (۱) کے احکام کو عملی شکل دینے کے لئے وہ طریق اختیار کیا جائے گا جو دستور کے اس حصے (یعنی جزء ۹ بعنوان اسلامی احکام) میں بیان کیا گیا ہے۔

> کونسل کے کم از کم دو ارکان سپریم کورٹ یا کسی ہائی کورٹ کے حاضر سروس یا سابق جج ہوں گے۔

آرٹیکل ۲۲۸ میں اس کی تعبیر و تصریح کرتے ہوئے قرار دیا گیا ہے کہ:

> یوم آغاز سے نوے دن کی مدت کے اندر ایک اسلامی نظریاتی کونسل تشکیل دی جائے گی جس کا اس حصے میں بطور اسلامی کونسل حوالہ دیا گیا ہے۔

اسی آرٹیکل ۲۲۸ کی ذیلی شق (۲) میں اسلامی نظریاتی کونسل کی ہیئت ترکیبی کی وضاحت کی گئی ہے:

> اسلامی کونسل کم از کم آٹھ اور زیادہ سے زیادہ بیس ایسے ارکان پر مشتمل ہوگی جنہیں صدر ان اشخاص میں سے مقرر کرے، جو اسلام کے اصولوں اور فلسفے کا، جس طرح کہ قرآن پاک و سنت میں ان کا تعین کیا گیا ہے، علم رکھتے ہوں یا جنہیں پاکستان کے اقتصادی، سیاسی، قانونی اور انتظامی مسائل کا فہم و ادراک حاصل ہو۔

آرٹیکل ۲۲۸ کی اگلی ذیلی شق (۳) کی رو سے یہ لازم قرار دیا گیا ہے کہ کونسل کے کم از کم دو ارکان سپریم کورٹ یا کسی ہائی کورٹ کے حاضر سروس یا سابق جج ہوں گے۔ اسی طرح کم از کم ایک خاتون رکن کا ہونا بھی ضروری قرار دیا گیا ہے اور کونسل کے ارکان میں کم از کم چار اسلامی علوم کی تدریس و تحقیق کے کم از کم پندرہ سالہ تجربہ کے حامل ہونے چاہئیں۔

آرٹیکل ۲۲۹ کے مطابق صدر پاکستان یا کسی صوبے کے گورنر کسی معاملے میں یہ سوال کہ: آیا کوئی مروجہ قانون احکام اسلام کے منافی ہے یا نہیں؟ کونسل کو ریفر کر سکتے ہیں۔ قومی اسمبلی یا سینٹ یا کوئی صوبائی اسمبلی بھی ایسا کوئی مسئلہ کونسل کو ریفر کر سکتی ہے بشرطیکہ اس کے ارکان کا کم از کم ۲/۵ حصہ اس کا تقاضا کرے۔

آرٹیکل ۲۳۰ میں کونسل کے جو فرائض منصبی بیان کئے گئے ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

الف۔ مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) اور صوبائی اسمبلیوں سے ایسے ذرائع اور وسائل کی سفارش کرنا جن سے پاکستان کے مسلمانوں کو اپنی زندگیاں انفرادی اور اجتماعی طور پر ہر لحاظ سے اسلام کے ان اصولوں اور تصورات کے مطابق ڈھالنے کی ترغیب اور امداد ملے جن کا قرآن پاک اور سنت میں تعین کیا گیا ہے،

ب۔ کسی ایوان، کسی صوبائی اسمبلی، صدر یا کسی گورنر کو کسی ایسے سوال کے بارے میں مشورہ دینا جس میں کونسل سے اس بابت رجوع کیا گیا ہو کہ آیا کوئی مجوزہ قانون اسلامی احکام کے منافی ہے یا نہیں،

ج۔ ایسی تدابیر کی، جن سے نافذ العمل قوانین کو اسلامی احکام کے مطابق بنایا جائے، نیز ان مراحل کی جن سے گزر کر تدابیر کا نفاذ عمل میں لانا چاہیے، سفارش کرنا۔

د۔ مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) اور صوبائی اسمبلیوں کی راہنمائی کیلئے اسلام کے ایسے احکام کی ایک موزوں شکل میں تدوین کرنا جنہیں قانونی طور پر نافذ کیا جاسکے۔)

۱۔ جب آرٹیکل ۲۹۹ کے تحت، کوئی سوال کسی ایوان، کسی صوبائی اسمبلی، صدر یا کسی گورنر کی طرف سے اسلامی کونسل کو بھیجا جائے، تو کونسل اس کے بعد پندرہ دن کے اندر اس ایوان، اسمبلی، صدر یا گورنر کو جیسی بھی صورت ہو، اس مدت سے مطلع کرے گی جس کے اندر وہ مذکورہ مشورہ فراہم کرنے کی توقع رکھتی ہو۔

۲۔ جب کوئی ایوان، کوئی صوبائی اسمبلی، صدر یا گورنر جیسی بھی صورت ہو، یہ خیال کرے کہ مفاد عامہ کی خاطر اس مجوزہ قانون کا وضع کرنا جس کے بارے میں سوال اٹھایا گیا تھا مشورہ حاصل ہونے تک ملتوی نہ کیا جائے، تو اس صورت میں مذکورہ قانون مشورہ مہیا ہونے سے قبل وضع کیا جاسکے گا۔

مگر شرط یہ ہے کہ جب کوئی قانون اسلامی کونسل کے پاس مشورے کے لئے بھیجا جائے اور کونسل یہ مشورہ دے کہ قانون اسلامی احکام کے منافی ہے تو ایوان، یا جیسی بھی صورت ہو، صوبائی اسمبلی، صدر یا گورنر اس طرح وضع کردہ قانون پر دوبارہ غور کرے گا۔

۳۔ اسلامی کونسل اپنے تقرر سے سات سال کے اندر اپنی حتمی رپورٹ پیش کرے گی

اور سالانہ عبوری رپورٹ پیش کیا کرے گی۔ یہ رپورٹ خواہ عبوری ہو یا حتمی، موصولی سے چھ ماہ کے اندر دونوں ایوانوں اور ہر صوبائی اسمبلی کے سامنے برائے بحث پیش کی جائے گی اور مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) اور اسمبلی، رپورٹ پر غور و خوض کرنے کے بعد حتمی رپورٹ کے بعد دو سال کی مدت کے اندر اس کی نسبت قوانین وضع کرے گی۔

کونسل کا انتظامی ڈھانچہ

دستور کے آرٹیکل ۲۲۸ (۴) کے تحت صدر پاکستان کونسل کے ارکان میں سے ایک کو اس کا چیئرمین مقرر فرماتے ہیں، جن کے عہدہ کی میعاد دوسرے ارکان کی طرح تین سال ہوتی ہے۔ البتہ اس میعاد کے اختتام پر ان کا دوبارہ تقرر بطور رکن/ چیئرمین کیا جاسکتا ہے۔ کونسل کے سیکرٹریٹ کی سربراہی کونسل کے سیکرٹری (گریڈ ۲۰/۲۱) کرتے ہیں، جن کا تقرر کونسل کے ریکروٹمنٹ رولز (۱۹۸۴ء) کے مطابق وفاقی/ صوبائی حکومتوں کے کسی موزوں افسر کے تبادلہ/ ڈیپوٹیشن کے ذریعے یا پریس میں اشتہار کے بعد براہ راست انتخاب کے ذریعے ہوتا ہے۔ ریکروٹمنٹ رولز کے قاعدہ نمبر ۳ کے تحت کونسل کی تمام اسامیوں (بشمول سیکرٹری/ ڈائریکٹر جنرل وغیرہ) پر تقرر کا اختیار کونسل کے چیئرمین کو حاصل ہوتا ہے، جو انہی قواعد کے قاعدہ (11)(1)9 کے تحت قائم شدہ بورڈ/ کمیٹی کی سفارش پر کیا جاتا ہے۔ کونسل کے شعبہ تحقیق کی سربراہی اس کے ڈائریکٹر جنرل (گریڈ ۲۰) کرتے ہیں۔

۱۹۵۶ء کے دستور کے آرٹیکل ۱۹۸ (۳) کے تحت جو کمیشن قائم کیا جانا تھا، وہ بوجوہ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں اس دستور کی تنسیخ تک وجود میں نہ آسکا۔

یکم اگست ۱۹۶۲ء کو سپریم کورٹ آف پاکستان کے جناب جسٹس ابو صالح محمد اکرم، ۱۹۶۲ء کے دستور کے آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت، اسلامی نظریہ کی مشاورتی کونسل کے پہلے چیئرمین مقرر ہوئے۔ ان کے بعد جناب پروفیسر علامہ علاؤالدین صدیقی، جناب جسٹس حمود الرحمٰن، جناب جسٹس (ر) محمد افضل چیمہ، جناب جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن، جناب پروفیسر ڈاکٹر عبدالواحد جے ہالیپوتہ، جناب جسٹس (ر) محمد حلیم، جناب مولانا کوثر نیازی، جناب اقبال احمد خان، جناب ڈاکٹر شیر محمد زمان کونسل کی سربراہی کی خدمت پر مامور ہوئے، اور اب ۱۵/جون ۲۰۰۴ء سے جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد خالد مسعود کونسل کی سربراہی کے منصب پر فائز ہیں۔

یکم اگست ۱۹۶۲ء سے ۲۶/ستمبر ۱۹۷۷ء تک کونسل کا مستقر لاہور میں رہا۔ اس کے بعد اسے اسلام آباد میں منتقل کیا گیا۔ ۱۹۹۵ء میں سٹیٹ بنک آف پاکستان سے متصل، ۴۶-اتاترک ایونیو، سیکٹر جی فائیو ٹو میں اپنی عمارت مکمل ہونے پر کونسل مستقل طور پر یہاں منتقل ہوگئی۔ اولاً کونسل کے صدر نشین جز وقتی بنیاد پر مقرر ہوتے تھے۔ جسٹس محمد افضل چیمہ (۲۶/ستمبر ۱۹۷۷ء تا ۲۶/مئی ۱۹۸۰ء) ہمہ وقتی بنیاد پر مقرر ہونے والے پہلے چیئرمین تھے۔

کونسل کی مطبوعات

کونسل کی مطبوعات کی کل تعداد ۷۸ ہے، ان میں سالانہ رپورٹیں بھی ہیں اور موضوعاتی رپورٹیں بھی۔ سالانہ رپورٹوں بشمول سالانہ رپورٹ ۲۰۰۴-۰۵ء کی سمری رپورٹ کی کل تعداد ۲۴ ہے۔ ۳۶ رپورٹیں اسلامی قوانین کی تشکیل کے موضوع پر ہیں، ۸ رپورٹیں معیشت کی اسلامی تشکیل کے موضوع پر ہیں، ایک رپورٹ تعلیمی اصلاحات پر، ۴ رپورٹیں معاشرتی اصلاحات پر، ایک رپورٹ ذرائع ابلاغ عامہ کی اصلاح پر، ۲ رپورٹیں استفسارات پر مشتمل ہیں۔ اسلام اور دہشت گردی کے عنوان سے نیز حدود آرڈیننس ۱۹۷۹ء پر ایک مختصر عبوری رپورٹ بھی شائع کی گئی ہے۔ ''حدود و تعزیرات، اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کا جائزہ'' اور مصری سکالر عبدالحلیم محمد ابوشقہ کی چار جلدوں میں پر مشتمل کتاب ''تحریر المرأۃ فی عصر الرسالۃ'' کا اردو ترجمہ ''آزادیٔ نسواں، عہد رسالت میں'' بھی کونسل کی طرف سے طبع ہو چکا ہے۔

موجودہ کونسل

موجودہ کونسل کے مندرجہ ذیل ارکان کرام کی تقرری ۱۵/جون ۲۰۰۷ء کو عمل میں آئی۔

۱)	جناب ڈاکٹر محمد خالد مسعود	چیئرمین
۲)	جناب مولانا عبداللہ خلجی	رکن
۳)	جناب ڈاکٹر منظور احمد	رکن
۴)	جناب جسٹس (ر) ڈاکٹر منیر احمد مغل	رکن
۵)	جناب جسٹس ڈاکٹر رشید احمد جالندھری	رکن
۶)	جناب جاوید احمد غامدی	رکن
۷)	جناب اے آر کمال	رکن
۸)	ڈاکٹر محسن مظفر نقوی	رکن
۹)	ڈاکٹر فیض بلقیس	رکن

چیئرمین کونسل اور مذکورہ بالا ارکان کا مختصر تعارف حسب ذیل ہے:

۱۔ ڈاکٹر محمد خالد مسعود (چیئرمین)

مشہور محقق، دانشور اور ماہر تعلیم ڈاکٹر محمد خالد مسعود کونسل کے چیئرمین اور مجلّہ اجتہاد کے مدیر اعلیٰ ہیں، آپ ۱۵/اپریل ۱۹۳۹ء کو پیدا ہوئے۔ آپ نے ۱۹۶۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اسلامیات کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا، ۱۹۷۳ء میں میک گل یونیورسٹی، مونٹریال کینیڈا سے اسلامیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ آپ اردو کے علاوہ فارسی، عربی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور سپینش زبانیں بھی جانتے ہیں۔ آپ انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی کوالالمپور (ملائیشیا) لیڈن یونیورسٹی ہالینڈ، احمدو بیلو یونیورسٹی، زاریہ (نائیجیریا) یونیورسٹی آف پینسلوینیا، امریکہ اور کالج

ڈی فرانس (پیرس) نیز قائداعظم یونیورسٹی اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد جیسی اہم یونیورسٹیوں میں مسندِ تدریس پر فائز رہ چکے ہیں۔ آپ بہت سی قومی و بین الاقوامی تنظیموں کے رکن ہیں۔ آپ دس کتابوں کے مصنف ہیں اور ملکی و غیر ملکی جرائد ومجلّات اور انسائیکلو پیڈیاز میں آپ کے دوسو سے زیادہ تحقیقی مقالات بھی طبع ہو چکے ہیں۔ کونسل میں آپ کی صدر نشینی کی پہلی مدت ۱۶/ جون ۲۰۰۴ء سے ۱۵/ جون ۲۰۰۷ء تک تھی، ۱۵/ جون ۲۰۰۷ء سے آپ کو تین سال کے لیے کونسل کا دوبارہ چیئرمین نامزد کیا گیا ہے۔

۲۔ مولانا عبداللہ خلجی

آپ فاضل درس نظامی ہیں، یونیورسٹی آف بلوچستان نے آپ کو پشتو آنرز کی ڈگری دی ہے، یونیورسٹی آف بلوچستان سے آپ نے ادیب عربی کا امتحان بھی پاس کیا ہے، صدر پاکستان کے مذہبی امور کے مشیر رہے ہیں، قومی اسمبلی کے رکن بھی رہے ہیں اور آپ کو اب چوتھی بار کونسل کے رکن بننے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

۳۔ ڈاکٹر منظور احمد

آپ نے لندن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، انگریزی، عربی، فارسی، اردو اور ہندی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ آپ کی متعدد تصانیف ہیں، جن میں سے Morality and Law, History of Philosophy, Pakistan: prospects and perspectives اقبال شناسی، اسلام: چند فکری مسائل بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ آپ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ریکٹر ہیں اور اب دوسری بار کونسل کے رکن نامزد ہوئے ہیں۔

۴۔ جسٹس (ر) ڈاکٹر منیر احمد مغل

آپ ایم اے، ایل ایل بی اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریوں کے حامل ہیں، لاہور ہائی کورٹ میں جج رہے، پیسکو، واپڈا لاہور کے قانونی مشیر ہیں، یونیورسٹی لاء کالج لاہور میں قانون کے استاد رہے ہیں، آپ نے بہت سی کتب تصنیف کی ہیں۔ جن میں سے تفسیر قرآن، امام غزالی کی منہاج العابدین اور امام خصاف کی ادب القاضی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ آپ نے قرآن، حدیث، فقہ اور قانون سے متعلق مختلف موضوعات پر بہت سے مقالات بھی لکھے ہیں۔ آپ دوسری بار کونسل کے رکن نامزد ہوئے ہیں۔

۵۔ جسٹس ڈاکٹر رشید احمد جالندھری

جسٹس ڈاکٹر رشید احمد جالندھری ۲۲/ فروری ۱۹۳۲ء کو جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۲ء کو انہوں نے جامعہ عباسیہ بہاولپور سے سند فراغت حاصل کی۔ ۱۹۵۵ء میں انہوں نے جامعہ ازہر سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی، ۱۹۶۸ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے مختلف اداروں میں کام کیا، ۱۹۷۴ء میں ادارہ تحقیقات اسلامی کے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے کام کیا، ۸۴-۱۹۸۳ء میں بلوچستان یونیورسٹی میں تدریسی خدمات سرانجام دیں۔ ۲۰۰۲ء میں سپریم کورٹ (شریعت بنچ) کے جج بنائے گئے۔ ۱۹۹۲ء سے ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر اور ادارہ کے میگزین المعارف کے ایڈیٹر ہیں۔ علم تفسیر اور مفسرین (انگریزی سے اردو ترجمہ) اور ابو القاسم القشیری کے علاوہ دیگر کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ڈاکٹر محمد خالد مسعود کی سربراہی میں تشکیل پانے والی کونسل میں پہلے بھی رکن تھے اور اب بھی رکن ہیں۔

۶۔ جناب جاوید احمد غامدی

آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور سے انگلش لٹریچر میں بی اے آنرز کیا ہے، المورد، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سائنسز کے بانی اور صدر ہیں۔ آپ انگریزی ماہنامہ Renaissance اور اردو ماہنامہ اشراق کے چیف ایڈیٹر ہیں، آپ کی متعدد تصانیف ہیں، جن میں سے (۱) البیان (۲) میزان (۳) برہان (۴) مقامات اور (۵) خیال و خامہ بطور خاص قابل ذکر ہیں، سول سروس اکیڈمی لاہور میں آپ اسلامک سٹڈیز کے استاد رہے ہیں، مولانا امین احسن اصلاحی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔

۷۔ ڈاکٹر عبدالرزاق کمال

آپ نے پی ایچ ڈی کی ڈگری مانچسٹر یونیورسٹی، سے ایم اے (اکنامکس) کی ڈگری اکنامک انسٹی ٹیوٹ کولوراڈو نیز ایم اے (اکنامکس) کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے بھی حاصل کی۔ اس وقت گورنر، اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے کنسلٹنٹ ریسرچ کے طور پر کام کر رہے ہیں، سرکاری اداروں میں کام کا بہت وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز، قائداعظم یونیورسٹی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف ڈویلپمنٹ آف اکنامکس اور فاطمہ جناح ویمن یونیورسٹی بلوچستان میں ایم ایس سی، ایم فل اور پی ایچ ڈی لیول پر تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے رہے ہیں۔ پاکستان کی معاشیات اور دیگر موضوعات پر مختلف کتب کے علاوہ آپ کے بہت سے علمی و تحقیقی مقالات بھی مختلف مجلّات میں طبع ہوئے ہیں۔

۸۔ ڈاکٹر سید محسن مظفر نقوی

آپ نے ۱۹۹۰ء میں کراچی یونیورسٹی سے اسلامیات میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی، این سی سٹیٹ یونیورسٹی سے تقابل ادیان میں ڈاکٹریٹ کیا۔ ہائر اسلامک ایجوکیشن کے لیے آپ نے نجف عراق میں ۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۷ء تک قیام کیا، پاکستان کے دینی مدارس سے بھی علمی استفادہ کیا۔ عربی، فارسی، انگریزی اور اردو زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ قرآن ایک حیرت انگیز کتاب، ترجمہ وشرح اصول الکافی، امام جعفر صادق اور ان کا عہد، امام مہدی اور احادیث رسول، دہشت گردی، اسباب، نتائج اور

حل، امام حسین، سیرت و کردار، مذہب اور معاشرہ اور فہم اسلام کے جدید خطوط وغیرہ آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ آپ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر کراچی، زہراء پبلی کیشن انٹرنیشنل (جنوبی افریقہ لندن اور پاکستان) اور اسلامک سنٹر کیرولانیا میں تدریس کا بھی وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔

۹۔ ڈاکٹر فیض بلقیس

آپ پی ایچ ڈی اکنامکس (مانیٹری اکنامکس) ایم اے، اکنامکس (یونیورسٹی آف پنجاب) ایم اے اکنامکس (یونیورسٹی آف واٹرلو، کینیڈا) کی ڈگریوں کی حامل ہیں۔ آپ نے مئی ۱۹۷۴ء سے ۱۵/فروری ۲۰۰۷ء تک سینئر پروفیسر کی حیثیت سے پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف ڈویلپمنٹ اکنامکس، پاکستان میں کام کیا ہے اور ۱۶/فروری ۲۰۰۷ء سے اب تک ڈیپارٹمنٹ آف اکنامکس، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، ویمن کیمپس میں سربراہ کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ معاشیات کے مختلف پہلوؤں پر آپ کی بہت سی کتب اور تحقیقی مقالات طبع ہو چکے ہیں، حال ہی میں آپ کو کونسل کا رکن نامزد کیا گیا ہے۔

کونسل کے افسران

۱۔ جناب ریاض الرحمٰن، سیکرٹری، ۲۔ جناب منور حسن، ایڈمن آفیسر

شعبہ تحقیق و ترجمہ

۱- جناب زرخلیل، چیف ریسرچ آفیسر
۲- جناب محمد خالد سیف، سینئر ریسرچ آفیسر
۳- جناب انعام اللہ، ریسرچ آفیسر
۴- جناب غلام دستگیر شاہین، ریسرچ آفیسر
۵- مس نادیہ عمال ملک، ریسرچ آفیسر
۶- جناب سید مراد علی شاہ، سینئر ٹرانسلیشن آفیسر
۷- جناب محمد اشرف طارق، ٹرانسلیشن آفیسر
۸- جناب محمد افضل، ٹرانسلیشن آفیسر

دیگر شعبے

۱- جناب محمد نذیر رانجھا، لائبریرین
۲- جناب ظہیر الدین بابر، کمپیوٹر پروگرامر
۳- جناب مسرت حسین، پبلی کیشن آفیسر

محل وقوع

پلاٹ نمبر ۴۶، اتاترک ایونیو، جی ۵/۲، نزد اسٹیٹ بنک بلڈنگ، اسلام آباد

رابطہ کے لیے

فون جناب چیئرمین: ۹۲-۵۱-۹۲۰۴۷۳۶
جناب سیکرٹری: ۹۲-۵۱-۹۲۰۶۰۵۹
ایڈمن آفیسر: ۹۲-۵۱-۹۲۰۵۶۵۲
فیکس: ۹۲۵۱۹۲۱۷۳۸۱
ای میل: contact@cii.gov.pk
ویب سائٹ: www.cii.gov.pk
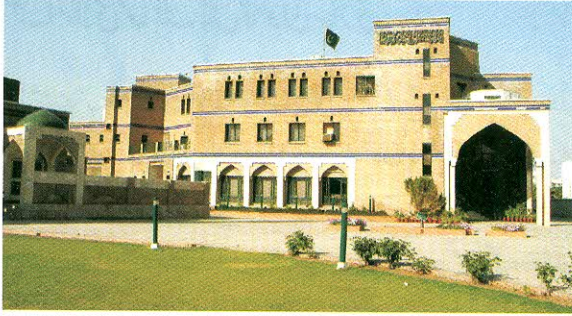
چند تحقیقی منصوبے

۱۔ کونسل کی سفارشات کا اشاریہ (زیر طبع)

کونسل کی طرف سے پیش کی گئی تمام رپورٹوں کے موضوعاتی اشاریہ کو مرتب کرلیا گیا ہے۔ اس اشاریہ کی ترتیب سے مقصود کونسل کے سرانجام دیئے ہوئے کام سے استفادہ کو آسان بنانا ہے، اس اشاریہ کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے گا نیز ویب سائٹ پر بھی دستیاب ہوگا۔

۲۔ رپورٹ اصلاح قیدیان و جیل خانہ جات

سابقہ کونسل نے قید خانوں کے حالات اور متعلقہ قوانین کا اسلامی پس منظر میں جائزہ لینے کے لیے مؤرخہ ۴/جنوری ۲۰۰۲ء کو جیل اصلاحات کمیٹی تشکیل دی تھی۔ کمیٹی نے اچھے اجلاس منعقد کر کے مذکورہ بالا مسائل پر غور اور مختلف جیل خانہ جات کا دورہ کر کے حالات معلوم کرنے کے بعد اپنی رپورٹ مرتب کر کے کونسل میں پیش کی۔ کونسل نے اپنے اجلاس نمبر ۱۵۲ (۱۵-۱۸/ستمبر ۲۰۰۳ء) میں بعض ملاحظات کے ساتھ اس رپورٹ کی طباعت کی منظوری دی تھی مگر تا حال یہ رپورٹ طبع نہیں ہو سکی۔ کونسل کے بعض فاضل ارکان اسے دوبارہ ملاحظہ کر رہے ہیں تاکہ ان کے ملاحظات کی روشنی میں اس قابلِ اشاعت بنایا جاسکے۔

۳۔ مغربی ممالک میں مسلمانوں کے مسائل

مغربی ممالک کے مسلمانوں کے مسائل، مشکلات اور ان کے حل کیلئے تجاویز و آراء

معلوم کرنے کے لیے کونسل میں مختلف ممالک کے اہل علم ودانش حضرات کے لیکچرز کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس لیکچر سیریز میں محترمہ ڈاکٹر ایوا بورے گیرو نے سپین میں مسلمان، جناب جمال ملک نے جرمنی میں مسلمان ڈاکٹر فارش احمد نور نے اسلام کے بارے میں مغربی دنیا میں مباحث، ڈاکٹر زاہد حسین بخاری نے ۱۱/ستمبر کے بعد امریکی معاشرے میں مسلمانوں کا نمایاں کردار، سر اقبال سکرانی نے برطانیہ میں مسلمان اور محترمہ لینا لارسن نے ناروے میں مسلمان اور عورتوں کے مسائل کے موضوع پر لیکچر دیئے، ان لیکچرز کو مرتب کر کے طباعت کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔

۴۔ اسلامی ممالک میں قانون سازی

گزشتہ پچاس سالوں میں اسلامی ممالک میں قانون سازی کے لیے، جو کوششیں ہوئی ہیں، ان قوانین کو جمع کیا جائے گا۔ اس کا مقصد اس موضوع پر معلومات کی فراہمی کے علاوہ عالم اسلام کے تجربات سے استفادہ بھی ہے۔ اس مقصد کے لیے لائبریری سے استفادہ کے ساتھ ساتھ مختلف اسلامی ممالک کے دورے بھی کیے جائیں گے اور قانون ساز اداروں کے ساتھ مل کر نیٹ ورک قائم کیا جائے گا۔ تاحال مندرجہ ذیل ممالک کے عائلی، فوجداری اور معاشی قوانین کے متون یکجا کیے جا چکے ہیں۔

ترکی، ملائیشیاء، سعودی عرب، الجزائر، مراکش، سوڈان، لیبیا، تیونس، انڈونیشیاء، ایران، نائیجیریا، اردن، صومالیہ اور مصر

۵۔ فقہی لغت

فقہی وقانونی اصطلاحات کے مختصر تعارف پر مشتمل فقہی لغت کے نام سے ایک مجموعہ کی ترتیب بھی زیر غور ہے۔

۶۔ مقاصدِ شریعت

اس مجموعہ میں مقاصد شریعت پر لکھی گئی، اہم کتب کے مباحث کی اردو زبان میں تلخیص کی جائے گی نیز اس میں اصولِ استنباط سے متعلق بحث بھی شامل ہوگی۔

۷۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹیں: ایک تجزیاتی جائزہ

کونسل کی طرف سے شائع ہونے والی تمام سالانہ رپورٹوں، قوانین کی اسلامی تشکیل، معیشت کی اسلامی تشکیل، معاشرتی، تعلیمی اور ذرائع ابلاغ سے متعلق رپورٹوں، جن کی مجموعی تعداد ۸۷ ہے، سے متعلق ایک تجزیاتی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے، جو فی الحال ترتیب وتدوین کے مراحل میں ہے۔

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل تحقیقی اور تجزیاتی منصوبوں پر کام جاری ہے۔

۱۔ تعزیرات پاکستان کا جائزہ
۲۔ قوانین کی اسلامی تشکیل۔ تجزیاتی رپورٹ (ڈاکٹر آزاد)
۳۔ اسلام اور عالمی ذرائع ابلاغ (تجزیاتی رپورٹ)
۴۔ جدید علم الکلام اور دعوت اسلام۔ تجزیاتی رپورٹ برائے رسالہ اجتہاد
۵۔ پاکستان میں دینی صورت حالت۔ تجزیاتی سالانہ رپورٹ
۶۔ اسلامی بینکاری کے تصور اور نظام کا جائزہ۔ تجزیاتی رپورٹ
۷۔ قرضوں کا اجراء اور معافی کے متعلق قوانین۔ ریسرچ نوٹ
۸۔ نجکاری کے متعلق موجودہ قوانین۔ تجزیاتی رپورٹ
۹۔ نظام زکوٰۃ وعشر۔ تجزیاتی رپورٹ
۱۰۔ عائلی قوانین بچوں کے حق سے متعلق موجودہ قوانین۔ تجزیاتی رپورٹ
۱۱۔ غیر مسلم شہریوں کے متعلق موجودہ قوانین۔ تجزیاتی رپورٹ
۱۲۔ کونسل کی معاشی سفارشات۔ ۲۰۰۶ء کی سالانہ کانفرنس
۱۳۔ زرعی اصلاحات (زمینداری اور جاگیرداری حقائق ومسائل) تجزیاتی رپورٹ
۱۴۔ نکاح وطلاق سے متعلق موجودہ قوانین۔ تجزیاتی رپورٹ
۱۵۔ میراث سے متعلق موجودہ قوانین۔ تجزیاتی رپورٹ
۱۶۔ ویب سائٹ کی اپ ڈیٹنگ۔ تجزیاتی رپورٹ
۱۷۔ صحت عامہ سے متعلق موجودہ قوانین
۱۸۔ تعلیم سے متعلق موجودہ قوانین
۱۹۔ وقف سے متعلق موجودہ قوانین
۲۰۔ قصاص ودیت سے متعلق موجودہ قوانین
۲۱۔ احتساب سے متعلق موجودہ قوانین
۲۲۔ فلاحی ریاست سے متعلق موجودہ قوانین
۲۳۔ آجر واجیر سے متعلق موجودہ قوانین

حالیہ مطبوعات

۱۔ اسلام اور دہشت گردی

کونسل نے محسوس کیا وطن عزیز میں امن وامان اور سکون واطمینان کی صورت حال کے بارے میں ہر سنجیدہ فکر آدمی پریشان اور مضطرب ہے اور معاشرے میں عدم تحفظ کا شدید احساس پیدا ہو چکا ہے۔ پوری دنیا کی طرح پاکستان بھی سیاسی، مذہبی اور عالمی طور پر دہشت گردی اور تخریب کاری کے خطرے سے دوچار ہے۔ عالمی سطح پر دہشت گردی کا ہدف بھی مسلمان ہیں لیکن ستم ظریفی یہ کہ بین الاقوامی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو دہشت گرد اور اسلام کو دہشت گردی کا مذہب قرار دیا جا رہا ہے۔ اس احساس کے پیش نظر کونسل نے اصحاب علم وفضل پر مشتمل ایک مذاکرہ گروپ تشکیل دیا، جس کے جناب چیئرمین کونسل ڈاکٹر محمد خالد مسعود کے زیر صدارت دو اجلاس ہوئے، ان اجلاسوں میں دہشت گردی کے

مسئلہ پر کئی جہتوں سے غور کیا گیا۔ یہ کتابچہ حک و اضافہ کے ساتھ انہی مباحث سے ترتیب دیا گیا ہے اور یہ فروری ۲۰۰۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔

۲۔ حدود آرڈیننس: ایک تنقیدی مطالعہ (انگریزی)

اس رپورٹ میں حدود سے متعلق کونسل نے سفارشات پیش کیں۔ اسی طرح تحفظ حقوق نسواں بل میں ترامیم پر غور کرتے ہوئے اس بات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے کہ ان سے پاکستان پینل کوڈ، ضابطہ فوجداری اور حدود لاز کے تحت صوبہ پنجاب اور وفاق میں کتنے مقدمات رجسٹرڈ ہوئے، ان میں سے کتنے مقدمات کا فیصلہ ہوا اور کیا فیصلہ ہوا یہ رپورٹ ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئی۔

۳۔ آزادیٔ نسواں، عہد رسالت میں

مصری سکالر عبدالحلیم محمد ابوشقہ نے قرآن وحدیث کے وسیع مطالعہ اور تجزیہ کے بعد چار جلدوں میں ''تحریر المرأۃ فی عہد الرسالۃ'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی تھی، جس میں عہد رسالت میں خواتین کے سیاسی، سماجی، دینی اور معاشی کردار اور خواتین سے متعلق دیگر اہم مسائل پر بیش بہا معلومات فراہم کر دی تھیں، قارئین کرام کے استفادہ کے لیے کونسل نے اس کتاب کا اردو زبان میں ترجمہ کروایا ہے، جو ''آزادیٔ نسواں، عہد رسالت میں'' کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔

۴۔ سہ ماہی ''اجتہاد''

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اسلامی قانون جمود کا شکار ہے اور علماء وفقہاء کی جانب سے عصری تقاضوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان اور عالم اسلام میں بہت سے تحقیقی ادارے کام کر رہے ہیں، او آئی سی اسلامی ممالک اور یورپ میں فتاویٰ کے ادارے قائم ہیں اور ان اداروں سے فتاویٰ کے مجموعے شائع ہو رہے ہیں لیکن ان سب اداروں کی علمی و تحقیقی سرگرمیاں مناسب طریقے سے ہمارے سامنے نہیں آتیں، اس قسم کی علمی و تحقیقی اور اجتہادی کاوشوں سے روشناس کرانے کے لیے سہ ماہی ''اجتہاد'' کے نام سے اس مجلّہ کو جاری کیا گیا ہے، جس کا یہ دوسرا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ مجلّہ کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کے لیے قارئین کرام کی تجاویز و آراء کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۵۔ حدود وتعزیرات: نظریاتی کونسل کی سفارشات کا جائزہ

اس کتاب میں حدود وتعزیرات سے متعلق اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کا قرآن وسنت اور فقہی روایت کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ اس باب میں ہمارے قدیم علمی لٹریچر میں کن آراء کا اظہار کیا گیا ہے۔

ایڈن برگ سنٹر مسجد

سفارشات اسلامی نظریاتی کونسل

سرحد میں ادارہ حسبہ کا قیام

۱- ادارہ حسبہ کا قیام مجوزہ صورت میں مقاصد شریعت کی تکمیل کی بجائے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں قرآن وسنت کے احکام کو متنازعہ بنانے کا باعث بن سکتا ہے اور مسائل کو حل کرنے کی بجائے مفاسد کا دروازہ کھول سکتا ہے۔ قانون بن جانے کی صورت میں کسی وقت کوئی حکومت بھی اس کو اپنے سیاسی اغراض ومقاصد کے حصول کے لئے غیر منصفانہ طریقے پر استعمال کر سکتی ہے۔

۲- حسبہ کے ادارے کے قیام کا مقصد ملک میں رائج قانون بشمول مروجہ اسلامی قوانین کی تعمیل میں کوتاہیوں اور بالخصوص انتظامیہ کی ناانصافیوں کا ازالہ ہونا چاہئے، اخلاقی اور خاص طور پر ایسے امور کو حسبہ میں شامل کرنے سے جو معروف نہیں ہیں اور جن پر لوگ متفق نہیں ہیں نہ صرف حسبہ کا ادارہ بے وقار ہو سکتا ہے بلکہ اس طرح حسبہ اپنے اصل مقصد یعنی ملک میں عادلانہ حکمرانی کو یقینی بنانے کی بجائے فروعات میں الجھ کر رہ جائے گا۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل امور خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔

الف۔ موجودہ حالات میں قانون کی حکمرانی اور عوام کو انتظامیہ اور بالا دست طبقات کی ناانصافیوں سے نجات احتساب کا اولین مقصد ہونا چاہئے اس کے لئے نئے ادارے قائم کرنے کی بجائے پہلے سے موجود احتسابی اداروں کو زیادہ مضبوط اور مؤثر بنانے کی ضرورت ہے۔

اسلامی ریاست کی ایک اہم ذمہ داری امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے اور یہ ایک ایسا فریضہ ہے، جو اسلامی ریاستوں کو دیگر ریاستوں سے ممتاز کرتا ہے۔ اسلامی ریاست پر یہ ذمہ داری اسلامی اخلاقیات کے فروغ، اسلامی اقدار کی نشو ونما اور معاشرہ کے عمومی اسلامی مزاج کی بقا، تحفظ اور غیر اسلامی اخلاقیات واقدار سے معاشرے کو محفوظ رکھنے کے لیے عائد کی گئی ہے۔ غالباً اسی تصور کے پیش نظر حکومت سرحد نے ادارہ حسبہ کے قیام کا پروگرام بنایا اور اس ادارہ کے قیام کے لیے ایک بل تیار کیا۔

حکومت سرحد (گورنر ہاؤس پشاور) نے ادارہ حسبہ کے قیام کا یہ بل اپنے مراسلہ نمبر پی/ ایس/ جی ا(۲)/۳۲۴۰-۲۰۰۳/ ۲۵/ ڈبلیو/ ای مؤرخہ ۲۱/اکتوبر ۲۰۰۳ء کے ساتھ رائے معلوم کرنے کے لیے کونسل کو ارسال کیا تھا مگر اس وقت کی کونسل کی مدت اس مراسلہ کے موصول ہونے سے قبل، ۱۵/اکتوبر ۲۰۰۳ء کو ختم ہوگئی تھی، اس لیے دفتر کونسل کی جانب سے حکومت سرحد کو یہ اطلاع دی گئی کہ کونسل کی تشکیل نو کے بعد یہ مسئلہ کونسل کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

ادارہ حسبہ کے قیام کی اصولی تجویز قبل ازیں کونسل ہی کی طرف سے ۱۹۹۳ء میں پیش کی گئی تھی، جس میں حسبہ کا ادارہ بطور فیڈرل حسبہ اتھارٹی تجویز کیا گیا اور اس کے قیام کے لیے مجوزہ مسودہ بھی پیش کیا گیا تھا (ملاحظہ فرمائیں: رپورٹ معاشرتی اصلاحات، ص ۱۰۸-۱۲۵، مطبوعہ ۱۹۹۳ء) لیکن بعد میں وفاقی محتسب کے ادارہ کے قیام کے بعد اس ادارہ کی ضرورت نہیں رہی تھی، اس لیے حتمی رپورٹ میں ادارہ حسبہ کی اصولی تجویز تو شامل تھی لیکن اس کے قیام کا مجوزہ مسودہ شامل نہیں کیا گیا تھا۔ وزارت مذہبی امور کی جانب سے اس تجویز کا مسودہ بعنوان ''اقامت صلوٰۃ، امر بالمعروف ونہی عن المنکر (حسبہ کے ادارہ کا قیام) آرڈیننس ۲۰۰۱ء'' پیش کیا گیا تھا، جس کے بارے میں کونسل نے اپنے ملاحظات پیش کیے تھے

ب- حسبہ کے مجوزہ مسودہ میں دفعہ نمبر ۲۳ کے تحت جو ۱۲ اختیارات بیان کئے گئے ہیں ان میں سے اکثر واضح اور متعین نہیں ہیں اور معروف ومنکر کی تعریف پر پورا نہیں اترتے۔ چنانچہ ان کا نفاذ اکثر محتسب اور حسبہ فورس کی صوابدید پر منحصر ہوگا۔ مجوزہ مسودے میں دفعہ ۲ (۲،۴) میں درج تعریفات سے بھی اس خدشے کو بالخصوص تقویت ملتی ہے جہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذکر تو ہے لیکن معروف ومنکر کی بنیادی اور اہم اصطلاحات کی تعریفات نہیں کی گئی ہیں اور انہیں مزید مبہم بنا دیا گیا ہے۔ کونسل کی رائے میں معروف اور منکر کی تعریف کتاب وسنت کی روشنی میں ایسی تعبیر ہو جو مختلف فرقوں کے نزدیک معتبر ومعروف ہو۔

ج- فقہ جعفریہ میں حسبہ کے احکام موجود نہیں ہیں۔

۳- مجوزہ بل دستور پاکستان کی کئی شقوں، خصوصاً آرٹیکل ۱۷۵(۳) بابت عدلیہ کی آزادی) اور قرارداد مقاصد (جو موجودہ آئین کا حصہ ہے) سے متصادم ہے کیونکہ مجوزہ مسودے میں (دفعہ نمبر ۳(۱)) محتسب کی تقرری کو

وزیر اعلیٰ کے مشورے سے مشروط کر کے اس کی حیثیت کو سیاسی بنا دیا گیا ہے۔ محتسب کے تقرر کا اختیار صرف گورنر کو ہونا چاہیے۔ اسی طرح مشاورتی کونسل اور مصالحتی کمیٹیوں کے قیام (مجوزہ حسبہ بل دفعہ نمبر ۱۴، ۱۸، ۲۴) سے بھی محتسب کی آزادی متاثر ہو سکتی ہے اور اس کے فیصلوں پر سیاسی دباؤ پڑ سکتا ہے۔ محتسب چاہے تو کسی سے بھی مشورہ کر سکتا ہے لیکن اسے مخصوص افراد یا اداروں سے مشورے کا پابند کرنا مناسب نہیں۔

۴- محتسب کے فرائض کے لحاظ سے اس کے عہدے کی نوعیت جج کے عہدے سے مماثل ہے اس لئے اس کی مطلوبہ استعداد دستور میں درج شریعت کورٹ کے جج بننے کی اہلیت کے مطابق ہونی چاہیے۔ مجوزہ مسودے (دفعہ ۳ (۲) میں درج اضافی شرائط ''وفاقی شرعی عدالت'' اور ''مستند عالم دین'' غیر ضروری ہیں۔

> قانون کی حکمرانی اور عوام کو انتظامیہ اور بالا دست طبقات کی نا انصافیوں سے نجات احتساب کا اولین مقصد ہونا چاہئے اس کیلئے نئے ادارے قائم کرنے کی بجائے پہلے سے موجود احتسابی اداروں کو زیادہ مضبوط اور مؤثر بنانے کی ضرورت ہے۔

۵- محتسب کے فیصلے کے خلاف عرضداشت گورنر کو ہونا چاہیے۔ مجوزہ بل میں اس کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ اس طرح کی قانونی گنجائش نہ ہونے کی صورت میں مجوزہ بل کی دفعہ نمبر ۲۱ کھلم کھلا استبداد کا دروازہ کھول سکتی ہے۔ مذکورہ شق بابت استثناء میں محتسب کے کسی بھی حکم کو کسی بھی عدالت کی کسی قسم کی مداخلت سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے حتیٰ کہ اس حکم کی قانونی حیثیت کے بارے میں بھی کسی قسم کا سوال نہیں اٹھایا جا سکتا۔

۶- مجوزہ بل میں دفعہ ۲۲ کے تحت مذکور ''حسبہ فورس'' کی بجائے حسبہ رضا کاران (مطوّع) کی تشکیل ہونی چاہئے۔ بہر حال ان کے فرائض منصبی کی قانونی وضاحت ضروری ہوگی۔ اسلامی احکام کی رو سے ان کو دانش و حکمت کے ساتھ وعظ و ارشاد کا طریق عمل اختیار کرنا چاہیے۔

۷- پاکستان میں محتسب کا قانون اور ادارہ پہلے سے موجود ہے اور بنیادی طور پر حسبہ کے مقاصد کے لئے مرکز اور تین صوبوں میں مفید کام سرانجام دے رہا ہے۔ پہلے سے موجود محتسب کا ادارہ انتظامیہ کے خلاف شکایات کے علاوہ ناانصافیوں اور اخلاقی خرابیوں مثلاً رشوت ستانی وغیرہ کے بارے میں متعلقہ محکموں سے باز پرس کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور ان اداروں کو مشورہ بھی دے سکتا ہے۔ مجوزہ بل اس قانون سے تصادم پیدا کرے گا۔ کونسل کی سفارش ہے کہ متوازی ادارے قائم کرنے کی بجائے سرحد میں صوبائی محتسب کا قیام عمل میں لایا جانا بہتر ہوگا۔

۸- مجوزہ بل میں ضلعی اور تحصیل محتسب کے تقرر کی بھی تجویز ہے۔ جب کہ لوکل باڈیز آرڈی ننس کے تحت پہلے ہی ضلعی محتسب کا ادارہ موجود ہے (دیکھئے دی نارتھ ویسٹ فرنٹیر پراونس لوکل گورنمنٹ آرڈی ننس، ۲۰۰۱، این ڈبلیو ایف پی آرڈیننس نمبر ۱۴، ۲۰۰۱، دفعہ ۱۳۴، اور شیڈول ۳)۔ اس طرح جہاں ان اداروں میں باہمی تصادم کا خطرہ ہے وہاں یہ تجویز محتسب کے کئی مختلف متوازی نظامات کو جنم دے گی۔ البتہ لوکل باڈیز آرڈیننس کی رو سے ڈسٹرکٹ محتسب کو وزیر لوکل باڈیز کے تحت بتایا گیا ہے۔ یہ انصاف کے تقاضوں کے منافی ہے۔ محتسب کا ادارہ انصاف کے حصول میں آزاد ہونا چاہیے۔

۹- کونسل یہ بھی سفارش کرتی ہے کہ محتسب کو برطرف کرنے کا اختیار سپریم جوڈیشل کونسل کو ہی ہونا چاہیے جیسا کہ پاکستان میں محتسب کے مروجہ قانون میں کہا گیا ہے۔

۱۰- کونسل یہ بھی سفارش کرتی ہے کہ محتسب کی میعاد ملازمت میں بھی توسیع نہیں ہونی چاہیے تاکہ توسیع کی خواہش اس کے فیصلوں پر اثر انداز نہ ہو سکے۔

۱۱- کونسل امید کرتی ہے کہ مجوزہ بل پر بحث کے وقت کونسل کی سفارشات کو شامل بحث کیا جائے گا اور ان کی روشنی میں بل میں مناسب ترامیم کی جائیں گی۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: سالانہ رپورٹ ۲۰۰۱ء، ص ۶۳-۹۳)۔ کونسل نے سرحد حکومت کی طرف سے ارسال کردہ مجوزہ مسودے پر اپنے ۱۵۴ویں اجلاس (۱۲-۱۳/اگست ۲۰۰۴ء) میں شق وار غور کیا اور کافی بحث و تمحیص کے بعد طے کیا کہ موجودہ شکل میں مسودہ بل مقاصد شریعت کو پورا کرنے کی بجائے احکام اسلام کو متنازعہ بنا دے گا لہٰذا کونسل نے مسودہ میں ترامیم کے لیے اتفاق رائے سے جو سفارشات منظور کیں، وہ افادہ عام کے لیے شائع کی جا رہی ہیں۔

(محمد خالد سیف)

حسبہ ایکٹ کا مکمل متن

حسبہ ایکٹ کا مکمل متن بطور ضمیمہ اگلے صفحہ پر دیا جا رہا ہے، تاکہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کا سیاق و سباق پوری طرح واضح ہو سکے۔

حسبہ ایکٹ مکمل متن

تمہید

ہرگاہ کہ اس تمام کائنات میں حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے اور اس ملک خداداد کے شمال مغربی سرحدی صوبہ میں عوام کے منتخب نمائندوں کو اس کے تفویض کردہ اختیارات ایک مقدس امانت ہیں۔

وہرگاہ کہ اسلامی نظام کی ترویج کا تانا بانا امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے گرد گھومتا اور پروان چڑھتا ہے اور اس مقصد کے حصول کے علاوہ دیگر اقدامات کے ایک ایسے ادارہ احتساب کا قیام بھی ضروری ہے جو معاشرے کے ہر طبقے بشمول خواتین، اقلیت وکم سن بچوں کے حقوق کی موثر طور پر نگرانی کرسکے اور انہیں معاشرے میں وقوع پذیر ہونے والے ممکنہ برائیوں اور ناانصافیوں سے بچاسکے۔

وہرگاہ کہ یہ بھی ضروری ہے کہ احتساب کے حوالے سے محتسب کے دائرہ اختیار کو سرکاری انتظامیہ و دفاتر تک پھیلایا جائے تاکہ انتظامیہ میں ممکنہ ناہمواریوں، ناانصافیوں، زیادتیوں اور اختیارات کے بے جا استعمال کا ازالہ کیا جاسکے۔

۱۔ مختصر عنوان، وسعت اور آغاز

۱۔ اس قانون کو شمال مغربی سرحدی صوبہ حسبہ ایکٹ مجریہ ۲۰۰۳ء کے نام سے پکارا جائیگا۔

۲۔ اس کا اطلاق پورے صوبہ سرحد پر ہوگا۔

۳۔ یہ فوری طور پر نافذ العمل ہوگا۔

۲۔ تعریفات

اس ایکٹ میں مذکور اصطلاحات کی تعریف (بشرط موافقت سیاق وسباق) درج ذیل ہوگی۔

۱۔ ''ایجنسی'' سے مراد محکمہ، کمیشن یا دفتر صوبائی حکومت، کارپوریشن یا کوئی دوسرا ادارہ جو کہ صوبائی حکومت نے قائم کیا ہو یا اس کے زیر کنٹرول ہو لیکن اس میں عدالت عالیہ اور اس کے تحت اور زیر کنٹرول عدالت ہائے شامل نہیں ہوں گے۔ البتہ صوبائی اسمبلی کا سیکرٹریٹ اس میں شامل ہوگا۔

۲۔ ''امر بالمعروف'' سے مراد ہے نیکی کا حکم دینے کی ذمہ داری کو پورا کرنا جیسا کہ قرآن حکیم اور سنت نبوی ﷺ میں بیان کیا گیا ہے۔

وضاحت

قانون ہذا کی اغراض کیلئے ''امر بالمعروف'' سے مراد ایسے معاملات میں نیکی کا حکم دینا ہے جہاں سوائے قانون ہذا کے تحت مہیا کی گئی صورت کے اصلاح کی کوئی دوسری قانونی، عدالتی یا انتظامی صورت موجود نہ ہو۔

۳۔ حسبہ فورس سے مراد وہ فورس ہے جو محتسب کو پولیس فورس سے وقتاً فوقتاً مہیا کی جائے۔

۴۔ ''نہی عن المنکر'' سے مراد ہے برائی سے روکنے کی ذمہ داری پوری کرنا جیسا کہ قرآن مجید اور سنت نبوی ﷺ میں اس کا تقاضا کیا گیا ہے۔

وضاحت

قانون ہذا کی اغراض کے لئے نہی عن المنکر سے مراد ایسے معاملات میں برائی سے روکنا ہے جہاں سوائے قانون ہذا کے تحت مہیا کی گئی صورت کے اصلاح کی کوئی دوسری قانونی، عدالتی یا انتظامی صورت موجود نہ ہو۔

۵۔ بدانتظامی میں ہر وہ فیصلہ، اقدام اور سفارش اور عمل اور کوتاہی شامل ہوگی جو......

ا۔ خلاف قانون، وخلاف قاعدہ، خلاف ضابطہ یا طے شدہ ضابطہ کار کے خلاف ہو لیکن اس میں ایسے فیصلے یا اقدام شامل نہیں ہونگے جس کیلئے معقول وجوہات موجود ہوں یا نیک نیتی کے تحت صادر کئے گئے ہوں یا اٹھائے گئے ہوں۔

ب۔ جانبدارانہ، تکلیف دہ، نامعقول، غیر منصفانہ، سنگدلانہ اور امتیازی ہو یا

ج۔ غیر متعلقہ دلائل پر مبنی ہو یا

د۔ قانونی اختیارات کا ناجائز استعمال یا پھر قانونی اختیارات کے استعمال میں غفلت جس کا مقصد ذاتی اغراض کا حصول ہو جیسا کہ رشوت، اقرباء پروری، بے جا حمایت اور اختیارات سے تجاوز۔

ر۔ غفلت، بے توجہی، تاخیر، صلاحیت کا فقدان، عدم دلچسپی یا اسی طرح کے دیگر عوامل جو ذمہ داری اور فرائض کی انجام دہی میں روا رکھا گیا ہو۔

۶۔ ''دفتر'' سے مراد حسبہ صوبہ سرحد کا دفتر ہے۔

۷۔ ''صوبائی مشاورتی کونسل'' سے مراد وہ کونسل ہے جو ایکٹ ہذا کے تحت قائم کی جائے۔

۸۔ ''صوبہ'' یا ''صوبہ سرحد'' سے مراد شمال مغربی سرحدی صوبہ ہوگا۔

۹۔ ''محتسب'' سے مراد صوبائی محتسب اور ضلعی محتسب ہوگا جو ایکٹ ہذا کے تحت مقرر کیا جائے گا۔

۱۰۔ ''قواعد'' سے مراد ایکٹ ہذا کے تحت بنائے گئے قواعد ہوں گے۔

۱۱۔ ''پبلک سرونٹ'' سے مراد دفعہ ۲۱ تعزیرات پاکستان سال (۱۸۶۰ء) میں بیان کردہ اشخاص سے ہے۔

۱۲۔ ''سٹاف'' سے مراد ملازم یا دفتر کا کمشنر، منتخب/ نامزد شریک کار، مشیر، ماہر، ماتحت، افسر رابطہ افسر وغیرہ ہوگا۔

۱۳۔ ''حکومت'' سے مراد حکومت صوبہ سرحد ہوگا۔

۱۴۔ ''عالم دین'' سے مراد (H-E-C) (ہائیر ایجوکیشن کمیشن) سے منظور شدہ وفاقہائے میں سے کسی وفاق کا شہادۃ العالمیہ کا حامل ہونے کے ساتھ کم از کم میٹرک پاس شخص ہے۔

۱۵۔ ''ماہر وکیل'' سے مراد وہ شخص ہے جو وکالت کے پیشہ میں دس سال کا تجربہ رکھتا ہو۔

۱۶۔ ''صحافی'' سے مراد وہ شخص ہے کہ جو ایم۔ اے جرنلزم ہو یا شعبہ صحافت میں دس سالہ تجربہ رکھتا ہو۔

۳۔ محتسب کا تقرر

ا۔ صوبہ سرحد کیلئے ایک محتسب ہوگا جس کا تقرر گورنر صوبہ سرحد، وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد کے مشورے سے کریگا۔

۲۔ محتسب وہ شخص ہوگا جو مستند عالم دین اور وفاقی شرعی عدالت کا جج بننے کا اہل ہو۔

۳۔ چارج سنبھالنے سے قبل محتسب گورنر صوبہ سرحد کے روبرو شیڈول میں دیئے گئے حلف نامہ کے مطابق اپنے عہدے کا حلف اٹھائے گا۔

۴۔ محتسب جملہ امور کی انجام دہی میں اور اختیارات خود کے استعمال میں آزادی، دیانتداری اور محنت سے کام لے گا اور صوبہ کے تمام حکام ان کی معاونت کرنے کے پابند ہوں گے۔

۴۔ میعاد

ا۔ صوبائی محتسب کے عہدہ پر کسی شخص کا تقرر ۴ سال کیلئے ہوگا البتہ مجاز اتھارٹی کو اس مدت میں مزید توسیع کرنے کا اختیار ہوگا۔

۲۔ محتسب کسی بھی وقت تحریری استعفیٰ پیش کر کے خود کو فارغ کر سکتا ہے۔

۵۔ ممانعت

ا۔ محتسب اپنی تقرری کے دوران اور کوئی منافع بخش عہدہ یا پیشہ اختیار نہیں کر سکے گا۔

۲۔ محتسب اپنی میعاد تقرری کے اختتام سے دو سال کے عرصہ تک قومی یا صوبائی اسمبلی کا ممبر بننے کا اہل نہ ہوگا۔

۶۔ محتسب کے شرائط ملازمت اور تنخواہ وغیرہ

ا۔ صوبائی محتسب ان جملہ مراعات، الاؤنسز کا تنخواہ کا حقدار ہوگا جو وفاقی شرعی عدالت کے جج کو حاصل ہیں۔

۲۔ ضلعی محتسب ان جملہ مراعات تنخواہ الاؤنسز کا حقدار ہوگا جو سیشن جج کو حاصل ہیں۔

۳۔ محتسب کو ذہنی یا جسمانی معذوری یا بدعنوانی کے ارتکاب کی بناء پر معزول کیا جا سکتا ہے اور اس سلسلے میں محتسب کو قبل از وقت نوٹس دیا جائے گا اور اگر محتسب اپنی معزولی کے وجوہات کو غلط سمجھتا ہے تو اسے یہ حق حاصل ہوگا کہ وصولی نوٹس کے ایک ہفتہ کے اندر عدالت عالیہ سے رجوع کرے جس کی شنوائی عدالت عالیہ پشاور کے ڈویژن بنچ کے روبرو ہوگی اور اگر ایسی سماعت ۹۰ دن کے اندر مکمل نہ ہوئے تو محتسب کے خلاف نوٹس معزولی مؤثر ہو جائے گی۔

۴۔ اگر محتسب مذکورہ دفعہ کے ذیلی دفعہ ۳ کے تحت سماعت کی درخواست کرے تو اسی تاریخ سے وہ اپنا فرض منصبی بجالانے سے فوراً رک جائے گا اور گورنر سرحد اس کی جگہ قائم مقام محتسب مقرر کرے گا۔

۵۔ اگر محتسب کو بدعنوانی کے الزام کے تحت ہٹایا گیا ہو تو وہ کسی سرکاری محکمے میں ملازمت اور قومی یا صوبائی اسمبلی کا ممبر بننے کا اہل نہ ہوگا۔

۷۔ قائم مقام محتسب

ا۔ اگر صوبائی محتسب کسی وجہ سے مثلاً رخصت وغیرہ کی بناء پر اپنے دفتر میں حاضر نہ ہو تو مجاز اتھارٹی کسی بھی ضلعی محتسب کو اسکی جگہ قائم مقام صوبائی محتسب مقرر کریگی۔

۲۔ اگر صوبائی محتسب کا عہدہ کسی اور وجہ سے خالی ہو تو گورنر قائم مقام محتسب مقرر کریگی۔

۸۔ سٹاف کی تقرری اور شرائط ملازمت

ا۔ محتسب کے سٹاف ممبران کا تعین اور ان کی شرائط ملازمت اور تنخواہ والاؤنسز حکومت مختص کرے گی۔

ب۔ محتسب اور اس کے اسٹاف ممبران وغیرہ کے اخراجات آئین کے آرٹیکل ۱۱۸ میں مذکور فنڈ سے ادا کئے جائیں گے۔

ج۔ ضلع محتسب جدول ب میں دیئے گئے حلف نامہ کے مطابق صوبائی محتسب کے روبرو اپنے عہدے کا حلف اٹھائینگے۔

۹۔ محتسب کے اختیارات وفرائض

محتسب کسی شخص کی تحریری یا زبانی درخواست پر یا عدالت عالیہ، عدالت عظمیٰ یا کسی بھی عدالت یا صوبائی اسمبلی کے ریفرنس پر یا از خود نوٹس لیکر۔

ا۔ کسی بھی ایجنسی یا اس کے اہلکار یا ملازم کے خلاف بدانتظامی کے الزام یا الزامات کی تفتیش کریگا۔

ب۔ صوبائی سطح پر اسلامی اخلاق اور آداب کی نگرانی کریگا۔

ج۔ صوبائی حکومت کے قائم کردہ یا اس کے زیر کنٹرول ذرائع ابلاغ کی اس نہج پر نگرانی کریگا کہ نشریات اسلامی اقدار کے ترویج کیلئے کارآمد ہوں۔

د۔ اشخاص، ایجنسی ہائے اور حکام کو جو صوبائی حکومت کے زیر انتظام کام کرتے ہوں خلاف شریعت کام کرنے سے روکنے کے لئے احکامات جاری کریگا اور اچھی حکمرانی کی ترغیب دے گا۔

ذ۔ ایسی ہدایات اور اصول وضع کریگا جو اس دفعہ کے تحت کام کرنے والے حکام کی کارکردگی کو موثر بنانے کے لئے ضروری ہو۔

ر۔ صوبائی انتظامیہ کے کام کو سہل اور مؤثر بنانے کے لئے مدد فراہم کریگا۔ شرط یہ ہے کہ محتسب اس امر یا امور میں دخل نہ دے گا جو کسی بھی مجاز عدالت میں زیر سماعت ہوں یا جو حکومت اور بیرونی حکومتوں اور ایجنسیوں کے معاہدہ وغیرہ سے متعلق ہوں اور یا ان امور سے متعلق ہوں جو دفاع، بری، بحری اور ہوائی فوج اور ان کے متعلق قوانین سے وابستہ ہوں۔

ز۔ ایکٹ ہذا کے مقاصد کے حصول کیلئے خصوصاً بدانتظامی کے اسباب اور معاشرتی ناانصافی دور کرنے کے لئے مطالعاتی وتحقیقی تربیت کیلئے مناسب قدم اٹھائیگا۔

س۔ محتسب اپنے اختیارات وفرائض کی بجاآوری کیلئے ماہرین ومعاونین کی خدمات حسب ضرورت بلامعاوضہ یا بہ ادائیگی معاوضہ حاصل کرنے کا مجاز ہوگا۔

۱۰۔ ضابطہ کار اور شہادۃ

ا۔ شکایات تحریری طور پر یا زبانی طور پر یا متاثرہ فرد یا افراد کی جانب سے یا ان کی فوتیدگی کی صورت میں ان کے ورثاء کی طرف سے محتسب کے دفتر میں خود محتسب یا متعلقہ اسٹاف ممبر کو دستی طور پر یا بذریعہ ڈاک، ای میل اور فیکس وغیرہ سے پہنچایا جائیگا۔

۲۔ اگر محتسب کسی معاملہ میں تفتیش کرنا چاہے تو متعلقہ شکایت کی بابت ایجنسی کے پرنسپل دفتر یا اس

کے ذیلی دفتر کو براہ راست نوٹس جاری کرتے ہوئے جوابدہی کا حکم دے گا اور اگر مناسب وقت پر متعلقہ ایجنسی یا اس کے زیر کنٹرول افسر مجاز کی طرف سے جواب موصول نہ ہو تو محتسب از خود تفتیش کا آغاز کرے گا یہ تفتیش غیر رسمی ہوگی تاہم مخصوص حالات میں محتسب کسی بھی ضابطہ کار کو عمل میں لا سکتا ہے محتسب کو اختیار ہوگا کہ وہ ایکٹ ہذا کے تحت بنائے گئے قواعد کی رو سے متاثرہ فریق یا اس کی طرف سے پیش کئے جانے والے گواہوں کا خرچہ اسے ادا کرے۔ محتسب کو اختیار ہوگا کہ وہ بذاتِ خود یا اس کا نامزد کردہ اہل کار متعلقہ ایجنسی کے دفتر کا ریکارڈ چیک کرے بشرطیکہ مملکت کے راز سے متعلق نہ ہو۔ اگر محتسب کسی شکایت پر کسی قسم کی کارروائی مناسب نہیں سمجھتا تو وہ شکایت کنندہ کو اس سے متعلق اطلاع دے گا۔ محتسب کو اختیار ہوگا کہ ایکٹ ہذا میں تفویض شدہ اختیارات کو روبہ عمل لانے کیلئے ضابطہ کار اور طریقہ کار از خود وضع کرے۔

۱۱۔نفاذ احکامات

شکایت پر کارروائی مکمل کرنے کے بعد محتسب کو اختیار ہوگا کہ وہ اس پر عمل درآمد کیلئے متعلقہ محکمہ کے افسر مجاز کو حکم نامہ جاری کرے اور ساتھ ساتھ دوسرے اقدامات جو وہ مناسب سمجھے اٹھائے۔ متعلقہ ایجنسی حکم نامہ میں درج میعاد کے اندر اپنی طرف سے اٹھائے گئے اقدام سے محتسب کو مطلع کرے گا اور حکم عدولی کی صورت میں متعلقہ ایجنسی/ حاکم اہل کار کے خلاف محتسب کی سفارش پر درج ذیل کارروائی ہوگی۔

ا۔ حکومت صوبہ سرحد کا ملازمین سے برخاستگی کے قانون مجریہ ۲۰۰۰ء کے تحت مقرر کردہ کوئی ایک یا زائد کارروائی۔

ب۔ دوران تفتیش محتسب اور اس کے اہلکار کے ساتھ تعاون نہ کرنے کی صورت میں متعلقہ حاکم اہلکار کے خلاف مداخلت بکار سرکار کے جرم میں کارروائی۔

۲۔ ایکٹ ہذا کے تحت کارروائی کے لئے محتسب کو وہ جملہ اختیارات حاصل ہوں گے جو کہ ضابطہ دیوانی کے تحت فریقین کی طلبی ان کے بیانات قلمبند کرنے، دستاویزات پیش کرنے، شہادت حاصل کرنے کی بابت عدالت کو حاصل ہیں۔

۳۔ اگر محتسب مطمئن ہو کہ زیر بحث شکایت کی بابت کسی بھی سرکاری اہل کار نے قابل تعزیر جرم کا ارتکاب کیا ہے یا اس کے خلاف دیوانی مقدمہ قائم ہو سکتا ہے تو متعلقہ ایجنسی کو حسب قانون مذکورہ بالا کارروائی کا حکم دے گا۔

۱۲۔دستاویزات تک رسائی

محتسب اور اس کے اہل کار یا حسبہ فورس کا کوئی ممبر تفتیش کی عرض سے اور دستاویزات تک رسائی کے لئے کسی بھی سرکاری دفتر میں داخل ہونے کا مجاز ہوگا اور دوران تفتیش متعلقہ ریکارڈ کا معائنہ اور نقولات حاصل کرنے کا مجاز ہوگا۔ بشرطیکہ محتسب کا مذکورہ اہل کار ریکارڈ سے کوئی دستاویز قبضے میں لینے کی صورت میں رسید حوالہ کرنے کا پابند ہوگا۔

۱۳۔توہین محتسب

محتسب کو توہین عدالت کی سزا دینے میں وہ اختیارات حاصل ہوں گے جو کہ عدالت عالیہ کو حاصل ہیں:

۱۴۔صوبائی مشاورتی کونسل

ا۔ صوبائی محتسب اپنے لئے ایک صوبائی مشاورتی کونسل مقرر کرے گا جس کا وہ خود سربراہ ہوگا جس کی صورت حسب ذیل ہوگی۔

الف۔ دو مستند عالم دین
ب۔ دو سینئر وکلاء
ج۔ ایک صحافی اور
د۔ دو ایسے حکومت کے نمائندے جو بی، پی، ایس ۲۰ میں تعینات ہوں۔

۱۵۔اجلاس مشاورتی کونسل

ا۔ صوبائی محتسب حسب ضرورت کسی بھی امر یا امور میں مشاورت کے لئے صوبائی مشاورتی کونسل کا اجلاس بلائے گا اور اس کیلئے وقت اور جگہ کا تعین کرے گا۔

۲۔ صوبائی محتسب کو اختیار ہوگا کہ وہ مشاروتی کونسل کے غیر سرکاری ممبران کو مناسب اعزازیہ ادا کرے۔

۱۶۔ضلعی محتسب

ا۔ صوبائی محتسب ایک یا ایک سے زائد ضلعوں کے لئے ضلعی محتسب مقرر کرے گا۔

۲۔ صوبائی مشاورتی کونسل کا غیر سرکاری ممبر بننے کی اہلیت کے حامل کسی بھی شخص کو ضلع محتسب مقرر کیا جا سکے گا۔

۳۔ ایک سے زائد اضلاع کے لئے ضلعی محتسب مقرر کرنے کی صورت میں اس کے مرکزی دفتر کا تعین صوبائی محتسب کریگا۔

۱۷۔تفویض اختیارات

محتسب تحریری حکم کے ذریعے اپنے اختیارات تحریر میں مذکور طریقے و شرائط کے مطابق ضلعی محتسب کو منتقل کرنے کا مجاز ہوگا۔

۱۸۔ضلعی مشاورتی کونسل

ا۔ ضلعی محتسب اپنی تقرری کے فوراً بعد کم از کم پانچ رکنی ضلعی مشاورتی کونسل قائم کرے گا جس کا سربراہ وہ خود ہوگا ممبران میں سے ایک عالم دین، ایک قانون دان، ایک صحافی اور ایک ایسا شخص جو متعلقہ ضلع کا معزز ہو اور اچھی شہرت کا حامل ہو اور ایک ضلعی افسر جو صوبائی حکومت کے زیر کنٹرول ہو۔

۲۔ ضلعی مشاورتی کونسل ان امور پر مشورہ دے گی جو اسے وقتاً فوقتاً ضلع محتسب حوالہ کرے گا۔

۱۹۔تحصیل محتسب

ضلعی محتسب، صوبائی محتسب کی اجازت سے حسب ضرورت تحصیل کی سطح پر نمائندہ مقرر کر سکے گا۔

۲۰۔ملازم سرکار

محتسب اور اس کے اہل کار بشمول حسبہ فورس تعزیرات پاکستان کے دفعہ ۲۱ کے تحت پبلک سرونٹ تصور ہوں گے۔

۲۱۔ استثناء

کوئی بھی عدالت یا ادارہ محتسب کے حکم یا اس کی کارروائی وعدم صحت کے سوال پر کسی قسم کی مداخلت کا مجاز نہ ہوگا اور نہ ہی کوئی بھی عدالت اس بابت کوئی حکم امتناعی جاری کر سکے گی۔

۲۲۔ حسبہ فورس

ایکٹ ہذا کے تحت امور کی انجام دہی کے لئے محتسب کو حسب ضرورت پولیس فورس مہیا کی جائیگی۔

۲۳۔ محتسب کے اختیارات (خصوصی)

دفعہ ۹ کے تحت تفویض شدہ اختیارات کو متاثر کئے بغیر محتسب کو درج ذیل اختیارات حاصل ہونگے۔

۱۔ پبلک مقامات پر اسلام کی اخلاقی اقدار کی پابندی کروانا۔

۲۔ تبذیر یا اسراف کی حوصلہ شکنی خصوصاً شادیوں اور اسطرح کے دیگر خاندانی تقریبات کے موقع پر۔

۳۔ جہیز دینے میں اسلامی حدود کی پابندی کروانا۔

۴۔ گداگری کی حوصلہ شکنی کرنا۔

۵۔ افطار اور تراویح کے وقت اسلامی شعائر کے احترام اور ادب وآداب کی پابندی کروانا۔

۶۔ عیدین کی نمازوں کے وقت ایسی مساجد کے آس پاس جہاں نماز جمعہ ہورہی ہو کھیل تماشے اور تجارتی لین دین کی حوصلہ شکنی کرنا۔

۷۔ جمعہ اور عیدین کی نمازوں کی ادائیگی اور انتظام میں غفلت کا سد باب کروانا۔

۸۔ کم عمر بچوں کو ملازم رکھنے کی حوصلہ شکنی کرنا۔

۹۔ غیر متنازعہ مالی دعاوی کے تصفیے میں غیر ضروری تاخیر کو روکنا۔

۱۰۔ جانوروں پر ظلم روکنا۔

۱۱۔ مساجد کی دیکھ بھال میں غفلت کا سد باب کروانا۔

۱۲۔ آذان وفرض نمازوں کے وقت اسلامی شعائر کے احترام وآداب کی پابندی کروانا۔

۱۳۔ لاوڈ اسپیکر کا غلط استعمال اور مساجد میں فرقہ ورانہ تقاریر سے روکنا۔

۱۴۔ غیر اسلامی معاشرتی آداب کی حوصلہ شکنی کرنا۔

۱۵۔ پبلک مقامات پر ناشائستہ رویہ اختیار کرنے سے روکنا۔

۱۶۔ آوارہ گردی کا تدارک کروانا۔

۱۷۔ پیشہ ور تعویذ فروشی، گنڈے، دست شناس، اور جادوگری کا سد باب کرنا۔

۱۸۔ اقلیتی حقوق کا تحفظ خصوصاً ان کے مذہبی مقامات اور وہ جگہ جہاں مذہبی روایات ادا کیے جا رہے ہوں کا تقدس ملحوظ رکھنا۔

۱۹۔ غیر اسلامی رسومات جس سے خواتین کے حقوق متاثر ہوں خصوصاً غیرت کے نام پر قتل کے خلاف اقدام اٹھانا، میراث میں خواتین کو محروم رکھنے کا سد باب، رسم ''سورہ'' کا تدارک کروانا اور خواتین کے شرعی حقوق کی فراہمی کو یقینی بنانا۔

۲۰۔ ناپ تول کی نگرانی اور ملاوٹ کا تدارک کروانا۔

۲۱۔ مصنوعی گرانی کا سد باب کروانا۔

۲۲۔ سرکاری املاک کی حفاظت کی نگرانی کروانا۔

۲۳۔ سرکاری محکمہ جات میں رشوت ستانی کا تدارک کروانا۔

۲۴۔ سرکاری اہلکاروں میں عوام کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا۔

۲۵۔ والدین کی نافرمانی پر مواخذہ کرنا۔

۲۶۔ کوئی دوسرا امر یا امور جو وقتاً فوقتاً صوبائی محتسب مشاورتی کونسل کے مشورہ سے متعین کرے۔

۲۷۔ (الف) غیر متنازعہ مالی امور میں متاثرہ فریق کی مناسب دادرسی کرنا۔

(ب) قتل، اقدام قتل یا ایسے دیگر جرائم میں جس میں سے امن وامان میں خلل واقع ہونے کا اندیشہ ہو متعلقہ فریق یا قبیلوں کے درمیان مصالحت کروانا۔

۲۴۔ مصالحتی کمیٹی

۱۔ صوبائی محتسب، ضلع محتسب کے مشورہ سے دفعہ ۲۳ کے شق (۲۷) کے تحت امر/امور کی انجام دہی کے لئے ہر تھانہ کی سطح پر ایک مصالحتی کمیٹی قائم کرے گا جو درج ذیل پانچ ارکان پر مشتمل ہوگی:

۱۔ مستند عالم دین۔
۲۔ ایک مقامی وکیل۔
۳۔ مقامی ایم پی اے کا ایک نمائندہ۔
۴۔ علاقے کا ایک معزز۔
۵۔ متعلقہ تھانے کا ایس ایچ او یا اس کا نمائندہ۔

۲۔ صوبائی محتسب، ضلعی محتسب کے مشورہ پر مصالحتی کمیٹی کے ممبران میں سے کسی کو کسی وقت معزول کر سکتا ہے۔

۲۵۔ جرم ناقابل دست اندازی پولیس

ایکٹ ہذا کے دفعہ ۲۳ کے تحت امور کی انجام دہی سے متعلق محتسب کے حکم کی خلاف ورزی ناقابل دست اندازی پولیس جرم ہوگا جس کی سزا (۶) ماہ تک قید اور مبلغ ۲ ہزار روپے تک جرمانہ ہوگی۔

۲۶۔ اختیارات قواعد

صوبائی محتسب ایکٹ ہذا کے مقاصد کے حصول کے لئے اور اسے موثر بنانے کے لئے حسب ضرورت ایکٹ ہذا سے موافق قواعد مرتب کریگا۔

۲۷۔ بالاتر حیثیت

ایکٹ ہذا اپنے مضامین (Provisions) کی حد تک مروجہ نافذ العمل کسی بھی قانون سے بالاتر حیثیت کا حامل ہوگا۔

۲۸۔ ایکٹ ہذا کے نفاذ میں کسی مشکل یا رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے صوبائی حکومت مناسب نوٹیفکیشن جاری کرنے کا مجاز ہوگی۔

اسلامی نظریاتی کونسل

سفارشات
حدود و تعزیرات

کونسل کے ۱۶۳ ویں اجلاس (۲۰-۲۱/ دسمبر ۲۰۰۶ء) کے فیصلے کے مطابق حدود و تعزیرات سے متعلق سفارشات کا ڈرافٹ تیار کیا گیا، جسے دیگر اراکین کونسل کی خدمت میں برائے ملاحظہ ارسال کر دیا گیا اور پھر اس ڈرافٹ کو کونسل کی لیگل کمیٹی کے اجلاس ہشتم (۲۶/ فروری ۲۰۰۷ء) میں بھی پیش کیا گیا۔ ان میں اسے بعض سفارشات کے بارے میں اراکین نے تحریری یا لیگل کمیٹی کے اجلاس میں زبانی طور پر اختلاف کا اظہار کیا۔ اس تناظر میں سفارشات کا ڈرافٹ مع اختلافی نوٹس کونسل کے سامنے غور وخوض کے لیے پیش کیا گیا۔ اس ڈرافٹ کی سفارشات سے اکثر ارکان نے مکمل اتفاق رائے کا اظہار کیا، چند امور جن پر کثرت رائے سے فیصلہ کیا گیا ان کے بارے میں اختلافی نوٹ روداد میں شامل کر دیئے گئے۔ یہ سفارشات اس صفحہ پر دی جا رہی ہیں۔

۱- زنا کی انتہائی سزا سو کوڑے اور چوری کی انتہائی سزا ہاتھ کاٹنا ہے۔ یہ سزائیں اسی وقت دی جائیں گی، جب جرم اپنی نوعیت کے لحاظ سے اور مجرم اپنے ذاتی، تمدنی اور سماجی حالات کے لحاظ سے کسی رعایت کا مستحق نہ ہو۔ عدالت ان اعتبارات سے کسی مجرم کو رعایت کا مستحق سمجھے تو وہ اسے کوئی کم تر سزا بھی دے سکتی ہے۔

۲- زنا بالرضا اور زنا بالجبر دو الگ الگ جرم ہیں۔ عورت اگر اپنے ساتھ زنا بالجبر کی شکایت لے کر آتی ہے تو اس سے چار گواہوں کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا اس صورت میں وہ مستغیث ہے اور ریاست پابند ہے کہ اس کے خلاف اس جرم کی تحقیق کرے، مجرم کو پکڑے اور کسی بھی طریقے سے جرم ثابت ہو جائے تو مجرم کو سزا دے۔

۳- زنا بالرضا کے جرم میں اگر چار گواہ پیش نہ کیے جا سکیں تو ملزم باعزت طور پر بری ہو جائے گا۔ زنا کے الزام میں اس کو پھر کسی دوسرے قانون کے تحت کوئی سزا نہیں دی جا سکتی۔ قرآن کا منشا یہی ہے کہ اس معاملے میں تعلیم و تربیت اور تلقین و نصیحت کا طریقہ اختیار کیا جائے اور سزا اسی وقت دی جائے، جب کم سے کم چار گواہ عدالت میں آ کر اس جرم کے ارتکاب کی گواہی دیں، الا یہ کہ معاملہ لعان کا ہو اور ملزم قسمیں کھانے سے انکار کر دے یا اپنے جرم کا خود اقرار کر لے یا کسی خاص صورتِ حال میں اس کا جرم آپ سے آپ ثابت قرار پائے۔

۴- حرابہ اور فساد فی الارض کو صرف ڈکیتی تک محدود نہ رکھا جائے۔ قتل، دہشت گردی اور زنا، زنا بالجبر کی صورت اختیار کر لے تو ان جرائم کو بھی حرابہ قرار دیا جائے اور ان کے مرتکبین کو ان کے حالات کے لحاظ سے وہ تمام سزائیں دی جائیں جو قرآن کی سورۂ مائدہ میں حرابہ اور فساد فی الارض کے مجرموں کے لیے بیان ہوئی ہیں۔

۵- موت کی سزا صرف قتل نفس اور فساد فی الارض کے جرم میں دینی چاہیے۔ قرآن کا صریح حکم ہے کہ ان دو جرائم کے سوا یہ سزا کسی جرم میں بھی دینا جائز نہیں ہے۔

۶- قصاص کے لیے اولیاء کی مرضی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ ان کی طرف سے معافی کے باوجود لیا جا سکتا ہے، لیکن قاتل کو رعایت دینا پیشِ نظر ہو تو اولیاء کی رضامندی ضروری ہے۔ اس کے بغیر اسے کوئی رعایت نہیں دی جا سکتی۔

۷- قتل خطا اور قتل عمد دونوں میں دیت اسلامی شریعت کا واجب الاطاعت حکم ہے، لیکن اس کی مقدار، نوعیت اور دوسرے امور میں قرآن کی ہدایت یہی ہے کہ معروف، یعنی معاشرے کے دستور اور رواج کی پیروی کی جائے۔ قرآن کے اس حکم کی رو سے ہر معاشرہ اپنے ہی معروف کا پابند ہے اور معروف پر مبنی قوانین کے بارے میں یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ حالات اور زمانہ کی تبدیلی سے ان میں تغیر کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ عاقلہ وغیرہ کی بحثیں اب بالکل بے معنی ہیں۔ مسلمانوں کا نظمِ اجتماعی اس معاملے میں اپنے حالات و مصالح کے لحاظ سے جو قانون چاہے، بنا سکتا ہے۔

۸- یہ صرف پانچ جرائم ہیں جن کی سزا شریعت میں مقرر کی گئی ہے، یعنی زنا، قذف، قتل و جراحت، محاربہ اور چوری۔ ان کے علاوہ باقی سب جرائم کا معاملہ مسلمانوں کے نظمِ اجتماعی سے متعلق ہے۔ وہ ان کے لیے جو سزا مناسب سمجھے، مقرر کر سکتا ہے۔

۹- جرائم کی گواہی کے معاملے میں عورت اور مرد یا مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ زنا کی تہمت کے سوا اسلامی شریعت میں گواہی کے لیے کوئی نصاب بھی مقرر نہیں کیا گیا۔ چنانچہ حدود کے جرائم بھی ان سب طریقوں سے ثابت ہوں گے جن سے جرم اس زمانے میں ثابت ہوتے ہیں یا آئندہ ہوں گے۔ مسلمانوں کے نظمِ اجتماعی پر اس معاملے میں کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔

۱۰- قانون کی باقاعدہ تدوین کے بعد جج کے مسلمان ہونے کی شرط غیر ضروری ہے۔ غیر مسلم جج بھی قانون کو پوری طرح سمجھ لینے کے بعد ہر نوعیت کے مقدمات کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔

تقریب رونمائی

سہ ماہی مجلّہ ''اجتہاد''

اور

''آزادئ نسواں، عہدِ رسالت میں''

محمد خالد سیف

اسلامی نظریاتی کونسل کے زیراہتمام طبع ہونے والے سہ ماہی مجلّہ ''اجتہاد'' اور نامور مصری سکالر جناب عبدالحلیم محمد ابوشقہ کی کتاب ''تحریر المرأۃ فی عصر الرسالۃ'' کے اردو ترجمہ ''آزادئ نسواں، عہد رسالت میں''، کی تقریب رونمائی بروز جمعرات مورخہ ۲ر اگست ۲۰۰۷ء کو کونسل کے آڈیٹوریم میں چیئرمین کونسل جناب ڈاکٹر محمد خالد مسعود کی زیرصدارت منعقد ہوئی۔ کارروائی کا باقاعدہ آغاز جناب قاری عبدالحنان حامد، اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد کی تلاوت قرآن مجید سے ہوا۔ جناب خورشید احمد ندیم مہمان ایڈیٹر مجلّہ ''اجتہاد'' نے اپنے تمہیدی کلمات میں اس مجلّہ کی ضرورت واہمیت اور افادیت کو بیان کیا۔ اس شمارے کا مرکز ومحور علامہ اقبال کا مشہور خطبہ ''الاجتہاد فی الاسلام'' تھا۔ انہوں نے اس خطبہ کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کا قیام برصغیر پاک وہند کی ملت اسلامیہ کی جدید تاریخ کا نقطۂ آغاز ہے اور اس نئے دور میں اجتہاد کی ضرورت کو پہلی مرتبہ علامہ اقبال نے واضح کیا۔ اس تاریخی پس منظر میں جب بھی اجتہاد کی بات ہوگی، یہ خطبہ اس کا پہلا حوالہ قرار پائے گا، انہوں نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ایک اسلامی معاشرہ اگر زندہ معاشرے کے طور پر رہنا چاہتا ہے، تو اس معاشرے کی بقا اور تحفظ کے لیے ''اجتہاد'' بے حد ناگزیر ہے کیونکہ اجتہاد کے بغیر کسی زندہ اور متحرک معاشرے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ جناب خورشد احمد ندیم نے اجتہاد کے اس شمارہ کے دیگر مندرجات پر بھی روشنی ڈالی۔

فیصل آباد سے تشریف لانے والے مشہور ادیب وشاعر اور مصنف جناب ڈاکٹر ریاض مجید نے اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے سہ ماہی مجلّہ ''اجتہاد'' کے اجراء کو نہایت مستحسن اقدام قرار دیا۔ جناب پروفیسر فتح محمد ملک، چیئرمین مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد نے چیئرمین کونسل جناب ڈاکٹر محمد خالد مسعود کو ان مساعی جمیلہ پر بھرپور خراج تحسین پیش کیا، جو وہ مختلف علمی وفقہی میدانوں میں سرانجام دے رہے ہیں، جن میں سے ایک کونسل کی طرف سے اس مجلّہ کا اجراء بھی ہے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں ہے کہ علامہ اقبال مجتہد نہیں تھے بلکہ محض ایک شاعر اور فلسفی تھے کیونکہ انہوں نے جہاں اجتہاد کی ضرورت واہمیت پر زور دیا، وہاں قیام پاکستان کا تصور پیش کر کے انہوں نے خود بھی اجتہاد کیا۔ اسی طرح جب بعض علماء دیو بند نے یہ موقف اختیار کیا کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں، تو انہوں نے اس کے برعکس، یہ کہا کہ اسلام رنگ ونسل اور خون کے رشتوں سے بالاتر ہے اور اسلام میں نیشنلزم کے تصور کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس تقریب کا دوسرا حصہ کونسل کے زیر اہتمام مصری مصنف عبدالحلیم محمد ابوشقہ کی کتاب ''تحریر المرأۃ فی عصر الرسالۃ'' کے اردو ترجمہ ''آزادئ نسواں، عہد رسالت میں''، سے متعلق تھا۔ راقم الحروف کے ذمہ اس کتاب کا تعارف تھا لہٰذا اس سلسلہ میں عرض کیا گیا کہ آج کا دن اسلامی نظریاتی کونسل کی تاریخ میں اس حوالہ سے نہایت اہم ہے کہ یہ کونسل کا یوم تاسیس ہے۔ ۲ر اگست ۱۹۶۲ء کو کونسل معرض وجود میں آئی تھی، اس وقت سے یہ دن ہر سال آتا اور خاموشی سے گزر جاتا تھا مگر محترم ڈاکٹر محمد خالد مسعود جب سے کونسل کی صدر نشینی کے منصب پر فائز ہوئے ہیں، تو انہوں نے آئینی ودستوری فرائض کی بجا آوری کے ساتھ ساتھ کونسل میں پہلی مرتبہ علمی وتحقیقی سرگرمیوں کی داغ بیل ڈال کر کونسل کو گوشہ گمنامی سے نکال کر ماہ شب چہاردہم بنا دیا

> عہد رسالت مآب میں خواتین کو اسلام نے جو مقام ومرتبہ عطا کیا اور انہیں ناروا پابندیوں سے آزادی دلوائی تاکہ وہ مردوں کے شانہ بشانہ معاشی ومعاشرتی زندگی میں فعال کردار ادا کرسکیں، اس کتاب میں اسی بات کی آیات کریمہ اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں وضاحت کی گئی ہے۔

ہے اور امید ہے کہ آپ کی مساعی جمیلہ کی برکت سے کونسل علم وتحقیق اور بصیرت واجتہاد کے آسمان پر آفتاب نصف النہار بن کر جگمگانے لگے گی۔

محترم ڈاکٹر صاحب نے کونسل میں جن علمی وتحقیقی سرگرمیوں کا آغاز کیا، ان میں حالات حاضرہ پر مختلف سیمینارز، کانفرنسز اور مذاکروں کا انعقاد ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی سہ ماہی مجلّہ ''اجتہاد'' کا اجراء ہے، جس کا تعارف اور جس سے متعلق اہل علم کا تبصرہ آپ سماعت فرما چکے ہیں۔

اسی ضمن میں محترم ڈاکٹر صاحب کا ایک نہایت خوش آئند اور مستحسن اقدام کتاب ''آزادئ نسواں، عہد رسالت میں''، کی کونسل کی طرف سے طباعت واشاعت ہے۔ یہ مشہور مصری سکالر عبدالحلیم محمد ابوشقہ کی عربی کتاب ''تحریر المرأۃ فی عصر الرسالۃ'' کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب چار اجزاء پر مشتمل ہے:

جزء اول میں:

مسلمان عورت کی شخصیت کے خدوخال

جزء دوم میں:

معاشرتی زندگی میں مسلمان عورت کی شرکت

جزء سوم میں:

اجتماعی زندگی میں خواتین کی شرکت کی مخالفت کرنے والوں سے مکالمہ اور

جزء چہارم میں:

مسلمان خواتین کا لباس اور زیب زینت جیسے اہم مسائل کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ اسلام نے سب سے پہلے خواتین کے حقوق اور ان کے شرف کے تحفظ کا جو چارٹر عطا کیا ہے، اس کے بغیر ہم ان کے معاشرتی اور سماجی رتبے میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتے۔ اسلام نے عبادت، وراثت، شہادت، نکاح وطلاق اور انسانی زندگی سے متعلق دیگر تمام مسائل میں خواتین کو جس آزادی سے ہمکنار کیا اور معاشرت، معیشت اور سیاست کے میدان میں کام کرنے کے لیے جو حقوق عطا فرمائے، انہیں قرآن کریم اور صحیح بخاری ومسلم کی احادیث مبارکہ کی روشنی میں اس کتاب میں نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور دلنشین اسلوب میں اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ مسلم خواتین اسلامی معاشرے کا ایک نہایت فعال حصہ ہیں، معاشرے کی ترقی میں ان کا کردار بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ خواتین ہر جگہ اور ہر شعبہ میں اپنے فرائض بخوبی انجام دے سکتی ہیں۔ سیاست، تجارت، وکالت، طب اور انسانی زندگی کا کوئی شعبہ بھی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کے لیے شجر ممنوعہ نہیں ہے۔

عہد رسالت مآب میں خواتین کو اسلام نے جو مقام ومرتبہ عطا کیا اور انہیں ناروا پابندیوں سے آزادی دلوائی تاکہ وہ مردوں کے شانہ بشانہ معاشی ومعاشرتی زندگی میں فعال کردار ادا کرسکیں، اس کتاب میں اسی بات کی آیات کریمہ اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں وضاحت کی گئی ہے۔ مختصر یہ کہ یہ کتاب اسلامی معاشرے میں خواتین کے مقام ومرتبہ کے بارے میں متعدد غلط فہمیوں اور ان کی بنیاد پر خواتین کے معاشرتی زندگی میں فعال کردار میں حائل رکاوٹوں کا ازالہ کرتی ہے۔ اس کتاب کے مصنف مشہور مصری سکالر عبدالحلیم محمد ابوشقہ ہیں، وہ ایک طویل عرصہ تک الاخوان المسلمون کے رکن رہے، حسن البنا شہید سے انہوں نے استفادہ کیا، محدث العصر شیخ محمد ناصر الدین البانی کے سامنے بھی انہوں نے زانوئے تلمذ طے کیے، مختلف تعلیمی اداروں میں مسند تدریس پر فائز رہے اور پھر انہوں نے المسلم المعاصر کے نام سے ایک مجلّہ بھی جاری کیا۔ ان کی سب سے بڑی وجہ شہرت ان کی یہی کتاب ہے۔ محترم ڈاکٹر محمد خالد مسعود نے اس کتاب کا اردو ترجمہ کے لیے انتخاب کیا، کونسل کے اپنے تین رفقاء کار سے اس کا ترجمہ کروایا اور کونسل کی طرف سے اسے زیور طبع سے آراستہ کرانے کا اہتمام فرمایا ہے۔

ایک اہم کتاب

آزادی نسواں، عہد رسالت میں

مولانا محمد اسحاق بھٹی

عورتوں کے بارے میں اسلام کے احکام بالکل واضح ہیں۔ قرآن وسنت کی رو سے جو فرائض مردوں پر عائد ہوتے ہیں، وہی عورتوں پر عائد ہوتے ہیں۔ جس طرح مردوں کو امور شرعیہ پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اسی طرح عورتوں کو بھی دیا گیا ہے۔ کارِ خیر کا ثواب عورتوں کو بھی ملے گا اور مردوں کو بھی۔ فعل بد کی سزا عورت کو بھی دی جائے گی اور مرد کو بھی۔

آغاز اسلام سے لے کر اب تک تاریخ کے کسی مرحلے میں عورت کے مرتبے کو گھٹایا نہیں گیا۔ جہاد بے حد نازک اور مشکل ترین مسئلہ ہے، لیکن عصر نبوت میں صحابیات کے میدان جنگ میں شرکت کے شواہد کتب احادیث وسیر میں موجود ہیں۔

اس قسم کے واقعات بھی کتابوں میں مرقوم ہیں کہ بعض نہایت اہم معاملات میں خود کسی عظیم شخصیت کی عورت نے ڈھارس بندھوائی۔ نبی ﷺ کی ذات اقدس کو خیر البشر قرار دیا گیا ہے اور بلاشبہ آپ کائنات انسانی کی سب سے اعلیٰ وارفع شخصیت ہیں، لیکن پہلی وحی کے وقت آپ کو جو گھبراہٹ سی پیدا ہوئی، اسے رفع کرنے اور آپ کو اطمینان دلانے کا باعث حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بنیں۔

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر فقاہت سے نوازا تھا کہ احکام دینیہ کا چوتھا حصہ انہی کی وجہ سے ہم تک پہنچا۔ یہ بات عورت کی فضیلت وعظمت پر دلالت کناں ہے۔ اس میں کوئی مرد اس کا حریف نہیں۔

عورت بوقت ضرورت حکمران بھی ہوسکتی ہے اور اس کی مثالیں مسلمانوں کی تاریخ میں موجود ہیں۔ برصغیر میں رضیہ سلطانہ کی

مترجمین کی طرف سے پوری کوشش کی گئی ہے کہ اردو ترجمہ میں مصنف کے پیغام کا لب ولہجہ پوری صحت کے ساتھ برقرار رہے۔ امید ہے کہ قارئین کرام اسے ایک معیاری ترجمہ پائیں گے البتہ مترجمین کا مصنف کے تمام افکار ونظریات سے اتفاق ضروری نہیں۔ کوئی بھی انسانی کام حرف آخر نہیں ہوتا، کتاب کے ترجمہ وطباعت کے مراحل قلت وقت کے پیش نظر بہت عجلت میں طے کیے گئے ہیں، جس کی وجہ سے بہت سی خامیاں رہ گئی ہیں، انہیں انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

جناب ڈاکٹر طاہر محمود، استاذ شعبہ اصول الدین، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، جناب مولانا محمد اسحاق بھٹی (مصنف کتب کثیرہ) لاہور اور جناب پروفیسر عبدالجبار شاکر، ڈائریکٹر جنرل شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد نے بھی اس تقریب رونمائی سے خطاب کیا۔ مولانا محمد اسحاق بھٹی کا تحریری تبصرہ شامل اشاعت ہے۔

جناب مولانا ابوعمار زاہد الراشدی، گوجرانوالہ نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میری اس کتاب سے سولہ سال سے آشنائی ہے، میری شدید خواہش تھی کہ اس کتاب کا اردو میں ترجمہ شائع ہو، میں نے ''اجتہاد'' کے پہلے شمارے میں جب اس کتاب کے ترجمہ کا اشتہار دیکھا تو میری خوشی کی کوئی انتہاء نہ رہی کہ میں اپنے ایک دیرینہ خواب کی تعبیر دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے کہا کہ اس کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے اپنے موقف کی تائید میں قرآنی آیات کے ساتھ اکثر وبیشتر صحیح بخاری ومسلم کی احادیث سے استناد کیا ہے۔

حکومت ایک مضبوط اور کامیاب حکومت تھی۔ اس وقت بے شمار علمائے کرام اس خطۂ ارض میں موجود تھے جو رضیہ سلطانہ کی حکومت میں مختلف محکموں میں خدمات سرانجام دیتے تھے۔

چاند بی بی علاقہ گجرات کی بہت سمجھدار حکمران تھی، جس سے خود مغل حکمران بھی اتنی بڑی طاقت کے باوجود پریشان رہے۔ بھوپال میں یکے بعد دیگرے کئی خواتین تخت حکومت پر متمکن ہوئیں اور متعدد مشہور علمائے کرام ان کے دور حکمرانی میں ریاست بھوپال کے تعلیم وتدریس اور افتاء وغیرہ کے محکموں میں مصروف عمل رہے۔ حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی نے بعض علمائے عظام کو سفارشی خطوط دے کر ریاست کے بعض محکموں میں ملازمت دلائی۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے امداد الفتاویٰ میں ایک استفتاء کے جواب میں عورت کی حکمرانی کو جائز قرار دیا ہے۔

۱۹۶۴ء میں اکثر علمائے کرام نے پاکستان کے صدارتی انتخابات میں ایوب خان کے مقابلہ میں فاطمہ جناح کی حمایت کی، جن میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی پیش پیش تھے۔ اس زمانہ میں مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی کا فتویٰ بھی اخبارات میں شائع ہوا تھا، جس میں فاطمہ جناح کی حمایت کی گئی تھی۔

اب بھی بعض معروف دین دار گھرانوں کی بعض لائق احترام خواتین اسمبلیوں اور سینٹ میں موجود ہیں اور سرکار سے باقاعدہ تنخواہ وصول کرتی ہیں اور سرکاری قواعد کے مطابق تنخواہ کے علاوہ انہیں مراعات بھی حاصل ہیں۔

اس تمہید کا حاصل یہ ہے کہ عورت حکمران بھی ہوسکتی ہے، وزیر بھی ہوسکتی ہے، اسمبلیوں اور سینٹ کا انتخاب بھی لڑسکتی ہے، جنگ وجہاد میں بھی حصہ لے سکتی ہے، سرکاری محکموں میں ملازمت بھی کرسکتی ہے۔

جناب عبد الحلیم محمد ابوشقہ کی کتاب ''تحریر المرأۃ فی عصر الرسالۃ'' اپنے موضوع کی نہایت اہم کتاب ہے۔ اس کے الگ الگ چار حصوں میں خواتین کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ قرآن وحدیث اور اسلامی تاریخ کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان نے اس کا اردو ترجمہ ملک کے ثقہ اہل علم سے کرایا ہے۔ مثلاً کتاب کا حصہ اول جو ''مسلمان عورت کی شخصیت کے خدوخال'' کے عنوان پر مشتمل ہے، کونسل کی طرف سے اس کتاب کے ترجمہ کی اشاعت ایک بہت مبارک اقدام ہے۔ مشہور سماجی کارکن محترمہ طاہرہ عبداللہ نے دیگر مقررین کے برعکس یہ موقف اختیار کیا کہ اس کتاب کے ترجمہ اور کونسل کی طرف سے اس کی طباعت واشاعت کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ مصنف نے جن اہداف کے حصول کا ذکر کیا ہے، وہ مرد وزن میں عدم مساوات کے نظریے پر مبنی ہیں۔ جنسی امتیاز کے خلاف کئی سالوں کی مسلسل جدوجہد کے بعد خواتین جو کامیابی حاصل کرچکی ہیں اور اب وہ زندگی کے ہر شعبے میں سرگرم عمل ہیں مصنف کے موقف کی تائید وحمایت ان مہذب اور تعلیم یافتہ خواتین کو پھر سے پیچھے لے جانے کی کوشش ہے۔ انہوں نے کہا کہ آج خواتین کو غربت، عدم تحفظ، جسمانی اور جنسی تشدد اور فرسودہ معاشرتی رسم ورواج جیسے مسائل کا سامنا ہے لہٰذا ان مسائل کے حل کی طرف اہل فکر کی توجہ مبذول کرنی چاہیے۔

جناب ڈاکٹر محمد خالد مسعود چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل نے تمام مقررین اور مہمانان گرامی کا اس تقریب میں شرکت کرنے پر شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ کونسل کی طرف سے پوری کوشش کی جاتی ہے کہ تمام مکاتب فکر کو کھل کر بات کرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ قرآن اور احادیث نبویہ کی مروج تعبیرات کے علاوہ دیگر تعبیرات بھی ہوسکتی ہیں لہٰذا کسی ایک تعبیر پر اصرار اور اپنے موقف کے خلاف کسی دوسری تعبیر کا انکار اور اس بارے میں بہت شدید موقف اختیار کرنا اہل علم کے شایان شان نہیں۔ کتاب کے حوالے سے ان کا کہنا تھا کہ عہد رسالت مآب ﷺ میں خواتین کو جو حقوق حاصل تھے، اس کتاب میں انہیں کتاب

وسنت کے نصوص کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ اسلام سے قبل دوسرے معاشروں میں عورت برائی کا مجسمہ قرار دی جاتی تھی، اسلام ہی نے سب سے پہلے خواتین کے مقام ومرتبہ کا تعین کیا، انہیں ہر قسم کے حقوق عطا کیے، وراثت سے حصہ دیا اور انہیں معاشرے کا ایک نہایت فعال عنصر قرار دیا۔ ابوشقہ نے ان تمام امور کو کتاب وسنت کے نصوص کی روشنی میں نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اسی وجہ سے ترجمہ کیلئے اس کتاب کا انتخاب کیا گیا تاکہ اردو قارئین بھی اس سے استفادہ کرسکیں۔ امید ہے یہ کتاب خواتین کے مقام ومرتبہ اوران کے حقوق وفرائض سے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کے ازالہ کے لیے مدد ومعاون ثابت ہوگی۔

آزادی نسواں ایک ایسا موضوع ہے جسکے حوالے سے مسلمان معاشرے دنیا میں زیر بحث رہے ہیں۔ اور بالعموم یہ گمان کیا جاتا ہے کہ مغرب میں عورت کو جو آزادی اور حقوق حاصل ہیں، آج کی مسلمان عورت اس سے محروم ہے۔ جو عالم اسلام کے مختلف حصوں میں آباد ہے یہ تاثر اگر اسلام کے بجائے۔ مسلمان معاشروں سے منسوب کیا جائے تو اس میں صداقت موجود ہے۔ اگر ہم صرف پاکستان کے حوالے سے دیکھیں تو آج بھی یہاں ''ونی'' اور ''قرآن سے شادی'' جیسی رسوم جاری ہیں۔ جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت مرتبہ انسانیت سے گرا کر ایک دوسرے درجہ کی مخلوق بنادیا گیا ہے۔

اس حقیقت کے اعتراف کے ساتھ اگران رسوم کو اسلام سے منسوب کیا جائے تو اس نقطہ نظر کی غلطی بالبداہت واضح ہے اسلام اصلاً قرآن وسنت کا نام ہے اوران مآخذ

ڈاکٹر غلام مرتضیٰ آزاد، جناب محمد خالد سیف اور جناب انعام اللہ نے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ ان تینوں مترجمین کا شمار ملک کے مشاہیر اصحاب علم میں ہوتا ہے۔

حصہ دوم ''معاشرتی زندگی میں مسلمان عورت کی شرکت'' کے موضوع کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس حصہ کا ترجمہ جناب محمد خالد سیف نے کیا ہے۔ فاضل مترجم متعدد کتابوں کے مصنف، کئی تحقیقی کتابوں کے مترجم، نامور مقالہ نگار اور نہایت محتاط محقق ہیں۔

حصہ سوم ''اجتماعی زندگی میں خواتین کی شرکت کی مخالفت کرنے والوں سے مکالمہ'' کے موضوع پر محیط ہے۔ اس موضوع کو زیر بحث لانا ضروری تھا۔ فاضل مصنف عبدالحلیم محمد ابوشقہ نے اس کے ضروری پہلوؤں کو وضاحت سے بیان کیا ہے

اور لائق مترجم ڈاکٹر غلام مرتضیٰ آزاد نے اس کو سلیس اردو میں منتقل کرنے کا فریضہ انجام دیا ہے۔

کتاب کے حصہ چہارم کا موضوع ہے ''مسلمان خواتین کا لباس اور زیب وزینت'' اس حصۂ کتاب کا ترجمہ جناب انعام اللہ نے کیا ہے، جورواں دواں اور شستہ ترجمہ ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل نے جناب عبدالحلیم محمد ابوشقہ کی عربی کتاب ''تحریر المرأۃ فی عصر الرسالۃ'' کا ''آزادئ نسواں، عہد رسالت میں'' کے نام سے اردو ترجمہ شائع کرکے ایک اہم خدمت سرانجام دی ہے۔ اس دور میں اس قسم کی معلومات کا لوگوں کے علم میں آنا وقت کی ضرورت ہے۔

کتاب پر تقدیم اسلامی نظریاتی کونسل کے لائق تکریم چیئرمین جناب ڈاکٹر محمد خالد مسعود نے لکھی ہے۔ ترجمہ کے لیے کتاب کے انتخاب اور مترجمین کے انتخاب پر میں کونسل کے چیئرمین صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

(مولانا محمد اسحاق بھٹی ادارہ ثقافت اسلامیہ کے سابق ریسرچ فیلو ہفت روزہ ''الاعتصام'' اور ماہنامہ ''المعارف'' کے سابق مدیر اور بہت سی کتب کے مصنف ہیں)

میں کوئی چیز ایسی نہیں۔ جو اس تاثر کی تائید کرتی ہو۔

ابوشقہ کی یہ کتاب اس حوالے سے ناقابل تردید شواہد پیش کرتی ہے۔ اور ہمارے سامنے ایک دوسری تصویر آتی ہے۔

دور حاضر میں چونکہ اسلام کے ناقدین کی یہ عام غلطی ہے کہ وہ مسلمان معاشروں کی خرابیوں کو اسلام سے منسوب کردیتے ہیں۔ اس لئے یہ کتاب اس پراپیگنڈے کی تردید کے لئے کفایت کرتی ہے۔

اردو قارئین یقیناً اس حوالے سے اس کتاب کو مفید پائیں گے۔

اس سے یہ بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی معاشرہ قرآن وسنت کی بنیاد پر منظم ہو تو اس میں مرد و زن کے درمیان وہ اختلاف جنم نہیں لیتا جس کا سامنا دور حاضر کے معاشروں کو ہے۔ اسلامی تعلیمات پر عمل کی صورت میں مرد وعورت ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ انسانی معاشرت کے ارتقاء میں معاون بن جاتے ہیں۔

تہذیب حاضر کا ایک بڑاالمیہ یہ ہے کہ اس نے حقوق کے نام پر مرد وعورت کو ایک دوسرے کے مدمقابل لا کھڑا کیا ہے۔ جس سے جہاں ازدواجی زندگی کا حسن ختم ہوگیا ہے، وہاں مرد اور عورت ایک دوسرے سے خطرہ محسوس کرنے لگے ہیں۔ اسلئے وہ ہمیشہ ایسے قوانین اور فلسفوں کی تلاش میں رہتے ہیں جو انہیں ایک دوسرے کے شر سے محفوظ رکھ سکیں۔ قرآن وسنت جس اساس پر باہمی تعلقات کو استوار کرتے ہیں اس محبت اور اخوت کی وہ فضا جنم لیتی ہے۔ جسکی موجودگی میں کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا۔

امریکی ایجنڈا اور مسلم معاشرہ

۵/ مارچ ۲۰۰۷ء کو اسلامی نظریاتی کونسل نے ''امریکی ایجنڈا اور مسلم معاشرے'' کے موضوع پر ایک گول میز مذاکرے کا اہتمام کیا، جس میں سیدہ عارفہ زہراء، چیئرپرسن، قومی کمیشن برائے وقارِ نسواں، ڈاکٹر منظور احمد، رکن اسلامی نظریاتی کونسل اور ریکٹر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اور ڈاکٹر انیس احمد، ریکٹر رفاہ یونیورسٹی کے علاوہ کیلیفورنیا یونیورسٹی اردن، امریکہ کے پروفیسر مارک لی وائن نے شرکت کی۔ جناب مشاہد حسین سید، سینیٹر، محترمہ گل بینہ بلال اور مولانا زاہد الراشدی اپنی دیگر مصروفیات کی بناء پر شریک نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر محمد خالد مسعود نے زیرِ بحث مسئلے کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان میں رائے عامہ منقسم ہے۔ تاہم قدامت پسند ہوں یا لبرل دونوں کو شکایت ہے کہ ان کے اہداف کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ امریکی پالیسیاں ہیں، جنہیں وہ ''امریکی ایجنڈا'' کا نام دیتے ہیں۔ قدامت پسندوں کا کہنا ہے کہ مغربی خصوصاً امریکی اقدار کی اشاعت بڑھتی جا رہی ہے اور اس سے پاکستانی ثقافت اور معاشرتی قدریں روز بروز کمزور پڑتی جا رہی ہیں۔ مذہبی طبقات کہتے ہیں کہ ملک میں قانونی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی اصلاحات کا جو سلسلہ جاری ہے، وہ امریکہ کے اشارے پر اور اس کے دباؤ کے تحت ہو رہا ہے۔ ''روشن خیال میانہ روی'' اور ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' اور ''صنفی امتیاز کے انسداد'' اور ''صنفی انصاف'' کی باتیں دراصل ''امریکی ایجنڈے'' کا حصہ ہیں۔ امریکہ پاکستان میں امریکی طرز کا معاشرہ تشکیل دینا چاہتا ہے۔ لبرل بھی ''امریکی ایجنڈا'' سے شاکی ہیں۔ ان کے خیال میں ملک کی ترقی اور اصلاح میں یہی امریکی ایجنڈا بڑی رکاوٹ ہے۔ فرقہ واریت اور انتہا پسندی چند مسلم ممالک کے مقامی مسائل تھے، لیکن مشرقِ وسطیٰ میں امریکہ کی پالیسیوں کی وجہ سے یہ ایک عالمی مسئلہ ہے۔ اور اب فرقہ واریت اور دہشت گردی ایک ایسی سیاسی شکل اختیار کر گئی ہے کہ جو ملک اس سے نمٹنے کی کوشش کرتے ہیں اور جو دانشور اس پر بات کرتے ہیں انہیں امریکی ایجنٹ کہہ کر آسانی سے خاموش کرایا جا سکتا ہے۔ اس مسئلے کے عالمی پس منظر کی وجہ سے اس کا مقامی پہلو بالکل دب کر رہ گیا ہے حتیٰ کہ اب مغرب میں دہشت گردی اسلام کے نام سے منسوب ہو گئی ہے۔ مسلمان دانشوروں کا یہ استدلال کہ دہشت گردی کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ''اعتذاری اسلام'' قرار دیا جا رہا ہے۔ یہ صورت حال پاکستان کے لیے خاص طور پر تکلیف دِہ ہے۔ ملکی حالات لازمی طور پر معاشی اور سیاسی اصلاحات کے متقاضی ہیں۔ ان اصلاحات کو امریکی ایجنڈا قرار دے کر ان کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری طرف مغرب کی عالمگیریت طاقت کی زبان استعمال کرتی اور مشرقِ وسطیٰ میں ظلم اور بربریت کی پشت پناہی کرتی ہے۔ چونکہ آج عالمگیریت نے ایک طرح کا ابہام پیدا کر دیا ہے، اس لیے اس موضوع پر کھل کر بات کرنے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر مارک لی وائن نے کہا کہ اسلام اور مغرب کے تعلقات میں خودکش بمباری اور دہشت گردی کے واقعات نے منفی کردار ادا کیا ہے۔ امریکی مفادات کو اگر امریکی ایجنڈا کا نام دیا جائے تو وہ حقیقت ہے۔ امریکہ ابھی تک اپنے ملک سے باہر دشمن سے جنگ لڑ رہا تھا۔ امریکہ پر حملہ، یہ پہلو بالکل نیا ہے۔ اس لیے امریکی سلامتی کے لیے اسلامی ممالک میں سیاسی استحکام اولین ترجیح ہے۔ تاہم یہاں کسی قسم کی دوررس تبدیلیاں امریکی مفاد میں نہیں۔ آج کی عالمگیریت کی وجہ سے عالمی صورت حال میں ایک ڈرامائی تبدیلی آئی ہے اور وہ ہے اصلاح احوال کے لیے فوج اور ہتھیاروں کا استعمال۔ امریکہ میں بش انتظامیہ کے تحت طاقت اور اسلحہ کا نظریاتی بنیادوں پر استعمال شروع ہوا ہے، جس میں مشرقِ وسطیٰ کی سیاسی صورت حال میں حسب خواہش تبدیلی، تیل کی قیمتوں میں استحکام، اسلحہ کی دوڑ، جمہوریت اور فلسطینی مسئلہ میں عملی دلچسپی ان نظریاتی بنیادوں کے چند عوامل ہیں۔

آج امریکی مفادات کو صحیح طریقے سے سمجھنا ضروری ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ افغانستان میں جمہوریت کا قیام امریکی ایجنڈا ہے، تو امریکہ کبھی اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا کیونکہ امریکہ کا مفاد یہ نہیں ہے۔ بظاہر امریکہ کو افغانستان اور عراق میں اور القاعدہ کے خلاف ناکامی ہوئی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ امریکہ کی ناکامی اور نااہلیت کا ثبوت نہیں۔ ان ممالک میں جمہوریت کا قیام امریکہ کا ایجنڈا نہیں ہے۔ امریکہ جو کچھ چاہتا تھا وہ حاصل کر چکا ہے۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ امریکہ میں انتظامیہ کی تبدیلی سے امریکی پالیسی میں تبدیلی آئے گی صحیح نہیں۔

اسلامی ممالک کی معاشی ترقی، رشوت ستانی کا انسداد، جمہوریت کا قیام امریکی ایجنڈا نہیں ہے۔ یہ کام یہ ملک خود کریں تو کریں امریکہ اسے اپنا ایجنڈا نہیں سمجھتا۔ اسلامی ممالک کے لیے یہ سمجھنا بہت ضروری ہے کہ امریکی مفادات کیا ہیں؟ امریکی پالیسیاں کیا ہیں؟ ان کا تسلسل ہمیشہ قائم رہے گا اور انتظامیہ کی تبدیلیوں سے ان میں تبدیلی نہیں آئے گی۔ امریکہ اپنے مفادات کے حصول کو اولین ترجیح دے گا۔ ان مفادات کا مطالعہ اور تجزیہ بیرونی اصولوں کی روشنی میں نہیں، ان کے اپنے اغراض ومقاصد کی روشنی میں کرنے سے بات سمجھ میں آسکتی ہے۔

سیدہ عارفہ زہرا نے کہا کہ جمہوریت اور اچھی حکومت امریکی ایجنڈا نہیں ہے۔ عالمی سطح پر ہی نہیں خود امریکہ میں مقامی اور قومی سطح پر بھی نہیں۔ تاہم موجودہ امریکی انتظامیہ ان تصورات اور خیالات کو بہت کامیابی سے اپنے مفاد میں استعمال کر رہی ہے۔ پاکستان کے دانشوروں پر یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ عالمگیریت کے مسائل پاکستان ہی نہیں امریکہ کو بھی درپیش ہیں۔

ڈاکٹر منظور احمد نے اسلامی ممالک میں لبرل تحریکوں کے بارے میں بتایا کہ یہ شروع میں ترقی پسند اور جدیدیت پسند تحریکیں تھیں، لیکن بتدریج نظریاتی تحریکیں بن گئیں۔ برصغیر میں ان کی ابتداء سرسید سے ہوتی ہے اور یہیں سے پتہ چلتا ہے کہ شروع سے یہ تحریک علمی اور فکری طور پر کمزور تھی۔ لبرلزم ایک فکری تحریک کی بجائے ثقافتی تقریب بن گیا، جس نے ثقافت کی ظاہری شکلوں پر زور دیا لیکن فکری بنیادوں کی طرف توجہ نہیں دی۔ سرمایہ داری فکر نے اپنے مقاصد کے لیے قدامت پسندوں اور لبرل کے درمیان تضاد کو زیادہ اجاگر کیا۔ جمہوریت کے بارے میں اس قدر اختلاف سامنے آیا کہ یہ بھی ایک نظریاتی قدر بن کر رہ گئی۔

آج ہمیں اس بات پر غور کرنا ہے کہ عالمگیریت ناگزیر ہے، اس میں ہمیں کوئی اختیار نہیں۔ اس لیے ہمیں اس کے لیے ویسی ہی طرز فکر اپنانا ہوگی۔ اگر اس میں ہمیں اپنی اختلافی اور دینی اقدار سے تصادم نظر آتا ہے، تو ہمیں فکری استدلال کا وہ طریقہ اپنانا ہوگا، جس میں مکالمے کے ذریعے اتفاق رائے کا حصول ہو سکے۔ صلح وآشتی کی ضرورت ہے اور عالمگیر اقدار پر اتفاق رائے قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ امریکی ایجنڈا اور عالمگیریت دو مختلف چیزیں ہیں۔ ان کو اکثر ایک سمجھ لیا جاتا ہے، جس سے خرابی پیدا ہوتی ہے۔

ڈاکٹر انیس احمد نے عالمی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ آج کا بنیادی مسئلہ عالمی سطح پر یک طرفہ فیصلوں کا رجحان ہے۔ دنیا میں صرف ایک طاقت اور امریکی تسلط ہے۔ کوئی قوم اس تسلط سے آزاد نہیں۔ سیاسی طور پر صرف امریکی کارڈ رائج الوقت سکہ ہے۔ آج کی ضرورت اس یک قطبی اور دو قطبی عالمگیریت سے نجات اور ایسی دنیا کا قیام ہے، جس میں قومیں ایک یا دو قوتوں کی محتاج نہ ہوں۔

> آج امریکی مفادات کو صحیح طریقے سے سمجھنا ضروری ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ افغانستان میں جمہوریت کا قیام امریکی ایجنڈا ہے، تو امریکہ کبھی اس میں کامیاب نہیں ہوسکتا کیونکہ امریکہ کا مفاد یہ نہیں ہے۔

معاشرت میں تسلسل، جمود اور تقلید سے نہیں بلکہ خود احتسابی اور نظر ثانی کے مسلسل عمل سے آتا ہے۔ ہم اجتہاد کی بات کرتے ہیں لیکن اجتہاد کا کوئی نظام، طریق تحقیق اور باقاعدہ طریق کار تشکیل نہیں پاسکا۔ ابھی تک اجتہاد کے لیے سازگار ماحول پیدا نہیں ہوسکا۔ ابھی تک ہر نئی بات کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ہر نئی فکر سوالات کی زد میں آتی ہے۔ جب تک ہم قرآن وسنت کو بنیاد بنا کر اجتہاد کا نظام تشکیل نہیں دیں گے، اس وقت تک بات نہیں بنے گی۔ اس وقت امت مسلمہ جس انتشار اور افتراق کا شکار ہے، وہ خود امریکہ کے مفاد میں ہے۔ ہمیں اپنے مفادات کے لیے خود کام کرنا ہے، ہمیں خود فیصلہ کرنا ہے کہ ہمیں کونسی اصلاحات درکار ہیں۔ ہمارے حق میں کیا بہتر ہے۔ اس فیصلے کے بعد ہمیں اس کی پروا نہیں ہونا چاہیے کہ امریکی ایجنڈا کیا ہے۔

(ادارہ تحریر)

آئر لینڈ کا ایک اسلامی مرکز

چیئرمین کونسل کا دورہ اُردن

بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت

۲۱ر ستمبر ۲۰۰۷ء کو ''اسلامی جمہوری تہذیبی روایت'' کے موضوع پر اردن کے شہر عمان میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں بہت سے اسلامی ممالک کے اہل علم ودانش نے شرکت کا اعزاز حاصل کیا۔ پاکستان سے اس کانفرنس میں محترم ڈاکٹر محمد خالد مسعود، مدیر اعلیٰ ''اجتہاد'' وچیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل نے شرکت فرمائی، قارئین کرام کے استفادہ کے لیے اس کانفرنس کے اختتامی اعلامیہ کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔ (محمد خالد سیف)

''مرکز قدس برائے مطالعہ سیاسیات'' اور کونراڈ اڈینا ور آرگنائزیشن کی دعوت پر عمان میں ۱-۲ر ستمبر ۲۰۰۷ء کو دوسری بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی، جس کا موضوع تھا ''اسلامی جمہوری تہذیبی روایت'' اور جس کی دوسری نشست کے لیے ''حکومت کے لیے اسلامی اقدار اور اس کے فلسفہ کی دستوری حیثیت''، کے موضوع کا انتخاب کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس میں عربی، اسلامی بیس ممالک کے ان پچاس سرگرم عمل مفکرین اور دانشوروں نے شرکت کی، جو اپنے ممالک اور معاشروں کے وسیع سیاسی وفکری وژن کے نمائندے تھے۔

مشترکہ اعلامیہ

شرکاء نے اس کانفرنس کے انعقاد کو مستحسن اقدام قرار دیا کہ اس سے مئی ۲۰۰۶ء میں منعقد ہونے والی پہلی کانفرنس کے شروع کیے ہوئے کام کی تکمیل اور اس کے حتمی فیصلوں اور سفارشات پر عمل درآمد کا موقع ملے گا۔ شرکاء نے اس بات پر زور دیا کہ صالح حکومت کے لیے اسلامی اقدار اور اس کے فلسفہ کی دستوری حیثیت کا موضوع سیاسی اور علمی طور پر بہت اہمیت کا حامل ہے، جس کا ایک طرف اسلامی تحریکوں اور مسلم دانشوروں کی صفوں میں ہونے والے مکالمہ کی گہرائی اور ترقی سے تعلق ہے اور دوسری طرف اس کا دوسری سیاسی وفکری تحریکوں کے ساتھ علمی گفتگو سے تعلق ہے، نیز اس سے ان تحریکوں کے ساتھ سیاسی وابستگی کو پذیرائی حاصل ہوگی۔

شرکاء نے اس بات سے اتفاق کیا کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ عربی واسلامی ممالک میں جمہوری اصلاح وتبدیلی کے عمل کو رجعت پسندی اور اُن آلام ومصائب کی شدت کے علی الرغم جاری رہنا چاہئے، جن سے اس عمل کو گزشتہ کئی سالوں میں دوچار ہونا پڑا۔ شرکاء کانفرنس نے اتفاق کیا کہ اس بات کی بھی شدید ضرورت ہے کہ سیاسی اسلام کی تحریک کو تبدیلی کی ان کارروائیوں میں ضم کردیا جائے، جو عربی واسلامی معاشروں میں جاری اور جمہوریت کی طرف ترقی کے سفر پر گامزن ہیں۔ اس کارروائی میں تشدد، غلو اور انتہاء پسندی کی تحریکوں کے مقابلہ میں نظر وفکر اور کردار کے اعتبار سے اس تمام سیاسی، فکری اور تنظیمی استحقاق کو ملحوظ رکھنا ہوگا، جس کا یہ کارروائی تقاضا کرتی ہے۔

عربی واسلامی دنیا میں جمہوری تبدیلی کے تجزیہ نے واضح کردیا ہے کہ جب تک اسلامی تحریکوں کو مدغم نہیں کیا جائے گا، یہ عمل کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکے گا۔ اس کے بغیر یہ عمل رجعت پسندی اور آلام ومصائب کا تختۂ مشق بنا رہے گا البتہ ادغام وانسلاک کے بھی کچھ تقاضے ہیں، جو حکومتوں اور تنظیموں کے لیے واجب ہیں مثلاً اسلامی اقدار اور اس کے فلسفہ کی دستوریت کے لیے کوشش بھی اسی سیاق میں اس طرح آتی ہے کہ یہ اس تحریک کو عصر حاضر کی روح اور تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے میں سازگار فضا مہیا کرتی ہے اور مجرد نظریہ کے لیے متفق علیہ دستوری فقہ اور معاشرتی قوانین وقانون سازی کی تبدیلی کی صلاحیت وقابلیت پیدا کرتی ہے۔

کانفرنس کے شرکاء نے یہ دو دن جوہری مسائل سے متعلق گہرے علمی مباحث میں گزارے، جس کے نتیجہ میں بالاتفاق یا کثرت رائے سے درج ذیل دستوری اقدار ومبادی کے بارے میں مشترکہ رائے تشکیل پائی، جو اسلامی تعلیمات واقدار سے ہم آہنگ ہیں، ہمارے ملکوں اور معاشروں میں انسانی اقدار کی اشاعت کے لیے ایک صالح اساس فراہم کرتے اور انتہاء پسندی ورجعت پسندی کو ناقابل قبول قرار دیتے ہوئے عمیق اور جامع جمہوری تبدیلی کے لیے بنیاد قرار پاتے ہیں:

اولاً: حکومت اور سیاسی نظام کی صورت میں

- اسلام نے حکومت یا سیاسی نظام کے لیے کوئی معین شکل مقرر نہیں کی، اسے عدل، حریت اور مساوات پر مبنی اجتہاد کے لیے کھلا امر قرار دے دیا ہے، جو مصالح کی فراہمی اور مفاسد کے ازالہ کا ضامن ہو۔ کانفرنس کے شرکاء کے افکار وآراء نے ایک ایسی معاصر حکومت کی تشکیل وترقی کی نشاندہی کی، جو قوانین اور فقہ کے اعتبار سے ایک ماڈل ہو۔
- طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔
- معاصر انسانی دنیا میں حکومتوں کی مختلف شکلیں اور صورتیں ہیں مثلاً شاہی، جمہوری، پارلیمانی، مخلوط، مرکزی وغیر مرکزی مگر اہمیت نظام حکومت کی شکل وصورت کی نہیں، بلکہ اہمیت عوام کی مصلحت، قیادت واستقلال کی حفاظت اور آزادی، ترقی اور خوش حالی کو حاصل ہے۔

- اسلام نے کسی دینی حکومت کی بنیاد نہیں رکھی، یہ بات نہ شرعی طور پر ثابت ہے اور نہ تاریخی طور پر، جدید حکومت شہری حکومت ہے، جس کے فرائض محدود اور غیر جامع ہیں، منصب حکومت پر منتخب شہری فائز ہوتے ہیں، اس میں قانون سازی کا عمل منتخب اسمبلیاں اور پارلیمنٹ آزادی کے ساتھ صاف شفاف شکل میں سرانجام دیتی ہیں۔

- جہاں تک دین اور حکومت میں تعلق قائم کرنے اور دونوں میں امتیاز کی بات ہے، تو حکومتوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ سیاسی اغراض کے لیے دینی امور میں مداخلت کریں، جیسا کہ فقہاء اور علماء دین کے لیے سیاسی امور میں مداخلت جائز نہیں، البتہ دیگر ہم وطنوں کی طرح انفرادی طور پر وہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لے سکتے ہیں، اس لیے واجب ہے کہ دینی ادارے اور حکومت کے دیگر اداروں میں فرق کیا جائے البتہ یہ دونوں ادارے ایک قانون اور ایک نظام کی چھت کے نیچے کام کریں گے۔

اسلام نے کسی دینی حکومت کی بنیاد نہیں رکھی، یہ بات نہ شرعی طور پر ثابت ہے اور نہ تاریخی طور پر۔

- جدید حکومت جغرافیائی حکومت کی اساس پر قائم ہوتی ہے، کسی ملک میں شہریت اختیار کرنا اور اس کا تشخص جغرافیائی بنیاد پر ہے، اس میں قوانین اور قانون سازی اسی بنیاد پر رائج ہوگی، امامت کے تصور پر مبنی حکومت خلافت کی حکومت ہے۔ امامت کا مسئلہ ایک تاریخی جبر کی بات تھی، جواب باقی نہیں ہے البتہ امت کے لیے حکومت کی کسی ایک صورت کے مطابق برضا ورغبت قیام کا دروازہ اب بھی کھلا ہے۔

- نظام حکومت کی رو سے شوریٰ حاکم کو پابند کرے گی کہ وہ شورائی امور کی جدید انتظامی تقاضوں کے مطابق تحدید کرے مثلاً وہ طے کرے کہ انتخاب کب ہوں گے؟ استفتاء کے ادارے کون سے ہیں؟ وغیرہ۔

ثانیاً: شہریوں کے حقوق و فرائض

- حکومت شہریوں کے ان تمام بنیادی حقوق وفرائض کی کفیل ہوگی، جو نظام اور آداب عامہ کے خلاف نہ ہوں۔

- شہریت حقوق وواجبات کا سرچشمہ اور فرد اور حکومت کے تعلق کو قائم رکھنے کے لیے واحد انتظامی اور طے شدہ بنیاد ہے۔

- تمام شہری برابر ہیں، حقوق وواجبات اور سرکاری مناصب پر فائز ہونے کے اعتبار سے مساوی ہیں، رنگ، نسل، جنس، دین اور مذہب کی بنیاد پر ان میں کوئی فرق نہیں۔

- افراد اور جماعتوں کے انفرادی، عمومی اور شخصی حقوق محفوظ اور جبر واکراہ کی تمام صورتوں سے پاک ہیں، حکومت کا فرض ہے کہ وہ ان حقوق سے مستفید ہونے کا سب کو موقع فراہم کرے اور ان کی تنفیذ کے لیے کام کرے۔

- کانفرنس کے شرکاء کی رائے میں احترام کے اعتبار سے، اسلام مرد وعورت میں انسانی مساوات کا بانگ دہل اعلان کرتا ہے، انہوں نے ہر اس فکر یا تصرف یا کردار کو مسترد کر دیا ہے، جو عورت کی عزت وتکریم یا زندگی کے مختلف میدانوں میں اس کے حقوق میں کمی کرے، خواہ اس فکر یا تصرف یا کردار کے مسلمانوں کی بعض غلط عادات وروایات سے کیسے ہی شواہد کیوں نہ پیش کیے گئے ہوں۔ شرکاء کی رائے میں عورت سے متعلق فقہی سرمایہ کے ان بعض پہلوؤں پر بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے، جن کی قطعی نصوص سے تائید نہیں ہوتی، خصوصاً وہ پہلو جن کا تعلق شہری وسیاسی حقوق سے ہے۔

- اس سیاق وسباق میں شرکاء نے اس بات پر زور دیا کہ عورت کو سرکاری اداروں میں کامل شرکت کا حق حاصل ہے، وہ تمام حقوق اور آزادیوں میں مرد کے شانہ بشانہ مساوات کی مالک ہے، جس کی وجہ سے وہ ملک کے سربراہ کے منصب اور قضاء سے متعلق تمام مناصب پر فائز ہو سکتی ہے۔

- حکومت ونظام مملکت میں غیر مسلم شہریوں کی شراکت دیگر ہم وطنوں کی طرح ان کا شرعی ودستوری حق ہے، ان کی آراء کا احترام واجب ہے۔

- عقیدے کی آزادی ہر شہری کا حق ہے، جسے دستوری وقانونی تحفظ حاصل ہے۔

- صحافت، ذرائع ابلاغ، رائے اور تعبیر کی آزادی کا اس کی مختلف صورتوں میں فرد اور جماعت کے لیے حق محفوظ ہے۔

- تنظیموں، جماعتوں اور مقامی شہری آرگنائزیشن کا حق محفوظ ہے۔

- ہر شخص کو کام، تعلیم، مناسب رہائش، صحت اور اچھی زندگی بسر کرنے کا حق حاصل ہے۔

- احوال شخصیہ سے متعلق ان تمام قوانین میں سب فرقوں اور مذاہب کے حقوق کا احترام کیا جائے گا، جنہیں منظوری کے لیے پارلیمنٹ میں پیش کرنا مقصود ہو جیسا کہ ہر ملک میں قابل اعتماد قانون کے لیے یہ بات طے شدہ ہے۔

یہ اعلامیہ عمان میں مؤرخہ ۲ ستمبر ۲۰۰۷ کو جاری ہوا۔

کانفرنس کے شرکاء

☆ ابوالعلاء ماضی، قائد حزب وسط، مصر۔

☆ ڈاکٹر احمد خالدی، سابق وزیر قانون، سربراہ دستور ساز کمیٹی، فلسطین

☆ ڈاکٹر احمد راوی، مدیر یورپی وقف تنظیم، سابق سربراہ اتحاد منظمات اسلامیہ، لندن

☆ ڈاکٹر زبیر عروس، پروفیسر سوشیالوجی، جامعۃ الجزائر، الجزائر

☆ ڈاکٹر طیب زین العابدین، سیکرٹری جنرل کونسل برائے دینی بقائے باہمی، پروفیسر علوم سیاسیات، جامعہ خرطوم، سوڈان

☆ ڈاکٹر اسامہ فرید عبدالخالق، جماعت الاخوان المسلمین، مصر

☆ ڈاکٹر مرتضٰی محطوری، رکن کونسل علماء یمن، پروفیسر جامعہ صنعاء، یمن

☆ ڈاکٹر انیس قاسم، ماہر قانون، فلسطین

☆ ڈاکٹر باسم زبیدی، پروفیسر علوم سیاسیات، جامعہ بیرزیت، فلسطین

☆ ڈاکٹر بومدین بوزید، پروفیسر فلسفۂ سیاسیات، جامعہ دہران، الجزائر

☆ جواد عصفور، محقق، جمعیت تجدید و اجتماعی ثقافت، بحرین

☆ حسن ابوھنیہ، محقق، حرکات اسلامیہ، اردون

☆ ڈاکٹر خبری امین، سربراہ شعبہ جنرل قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، ملایشیا

☆ ڈاکٹر رحیل غرایبہ، وائس سیکرٹری جنرل اسلامک ورک فرنٹ، اردن

☆ زکی میلاد، مدیر اعلیٰ مجلّہ ''الکلمۃ''، سعودی عرب

☆ سامح فوری، قومی مسائل سے متعلق محقق و مصنف، مصر

☆ ڈاکٹر سلیم عبداللہ جبوری، رکن عراقی پارلیمنٹ، عراق

☆ ڈاکٹر صبری سمرہ، محقق و سیاسی تجزیہ نگار، اردن

☆ ڈاکٹر عائشہ حجامی، پروفیسر جنرل قانون، جامعہ مراکش، مغرب

☆ معالی عاطف بطوش، وکیل و سابق وزیر، اردن

☆ ڈاکٹر عبداللہ بریدی، صحافی و پروفیسر جامعہ قصیم، سعودی عرب

☆ ڈاکٹر عثمان طسنان، پروفیسر کلیہ ادیان، جامعہ انقرہ، ترکی

☆ عریب رنتاوی، ڈائریکٹر جنرل، مرکز قدس برائے مطالعہ سیاسیات، اردن

☆ ڈاکٹر عصام سلمان، پروفیسر قانون، جامعہ لبنان، مشیر مرکز عربی برائے ترقی قانون، لبنان

☆ عیسیٰ شارقی، محقق جمعیت تجدید و اجتماعی ثقافت، بحرین

☆ ڈاکٹر فرید عبدالخالق، دست راست امام حسن البناء، بانی جماعت الاخوان المسلمین، رکن تاسیسی کونسل و سابق رکن مکتب ارشاد، مصر

☆ ڈاکٹر قطب مصطفٰی سانو، پروفیسر اصول فقہ، فقہ مقارن، اسلامی معاشیات، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، ملایشیا

☆ محمد ابورمان، محقق و مصنف، حرکات اسلامیہ، اردن

☆ محمد احسان الیف محقق، بین الاقوامی اسلامی مرکز، انڈونیشیا

☆ ڈاکٹر محمد بزور، اسلامک ورک فرنٹ کی طرف سے رکن پارلیمنٹ، اردن

☆ ڈاکٹر محمد حموری، ماہر قانون و سابق وزیر، اردن

☆ ڈاکٹر محمد مقاطع، پروفیسر دستوری قانون، جامعہ کویت، کویت

☆ ڈاکٹر محمد جنجار، نائب مدیر کنگ عبدالعزیز آل سعود آرگنائزیشن برائے علوم اسلامیہ و شہریت، مغرب

☆ ڈاکٹر محمد خالد مسعود، چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل، پاکستان

☆ محمد شریعتی، اسلامی محقق و مصنف، و سابق مشیر صدر ایران، ایران

☆ محمد قحطان، رکن مجلس قیادت، حزب اصلاح، یمن

☆ مروان شحادہ، محقق، حرکات اسلامیہ، اردن

☆ ڈاکٹر مصطفٰی علی، سیکرٹری جنرل، تنظیم برائے سلامتی ادیان، کینیا

☆ ڈاکٹر منصور عواملہ، پروفیسر لاء کالج، اردن یونیورسٹی، اردن

☆ سید ہانی فحص، مصنف و اسلامی مفکر، لبنان

☆ ڈاکٹر ہشام حمامی، رکن جماعت اخوان المسلمین، مصر

☆ ہالہ سالم، ڈائریکٹر جنرل، مرکز قدس برائے مطالعہ سیاسیات، اردن

اجتہاد

اختلاف رائے اور ہمارے رویے

حسن الامین

اسلامی نظریاتی کونسل کے بارے میں ہماری معلومات بس اس قدر تھیں، جتنی کہ سکول اور کالج کے زمانہ میں ہمیں مطالعہ پاکستان کی کسی درسی کتب میں دی جاتیں اور مجھے یقین ہے کہ پروفیسر ڈاکٹر محمد خالد مسعود اس ادارے کے سربراہ نہ بنتے، تو ابھی تک ہماری معلومات میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہ ہو پاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کے بارے میں ہم بس اتنا جانتے تھے کہ یہ بھی پبلک سیکٹر میں قائم ایک آئینی ادارہ ہے، جس کا کام ریاستی قانون سازی کے حوالہ سے اسلام کی تعبیر وتشریح میں پارلیمنٹ کی مدد کرنا ہے۔ عملی طور پر ہم سمجھتے تھے (اور کچھ زیادہ غلط نہیں سمجھتے تھے) کہ یہ بس ایک ادارہ ہے، جیسے کہ اس نوعیت کے دوسرے ادارے ہوا کرتے ہیں مثلاً اسلامی کانفرنس کی تنظیم یا اکنامک کوآپریشن آرگنائیزیشن، جن کے نام اور کتابی اہداف تو لمبے چوڑے ہوتے ہیں لیکن عملی فائدہ کوئی زیادہ نہیں ہوتا۔ جس طرح ان دیگر اداروں کے بارے میں ہمیں لمبے چوڑے مضمون پڑھنے کو ملتے، بالکل یہی حال اسلامی نظریاتی کونسل کا بھی تھا اور یقیناً یہ نکتہ نظر ابھی تک جوں کا توں رہتا، اگر اس ادارے کے چند انقلابی اقدامات سے ہم واقف نہ ہو چکے ہوتے، اس کے اندر منعقد ہونے والی کئی علمی وفکری مباحثوں، گفتگوؤں، راؤنڈ ٹیبل کانفرنسز میں شریک ہونے کا موقع نہ ملتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک جلیل القدر علمی شخصیت، جو ہمارے جیسے بنجر اور قحط الرجال کی حالت میں زندہ معاشرہ میں اگر نایاب نہیں، تو کمیاب ضرور ہیں، پروفیسر محمد خالد مسعود اس کے سربراہ نہ ہوتے۔ پروفیسر صاحب نے اس ادارے کے کام اور دائرہ کار کو ایک نئی شناخت دی ہے، اب نظر آتا ہے کہ علمی، تحقیقی اور ملکی وملی مسائل پر سوچ وبچار کرنے والے ادارے محض شاندار عمارتوں سے نہیں بلکہ ان کے اندر ہونے والے تحقیقی کام اور جاری اکیڈمک پروجیکٹس سے بنتے ہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل اب ایک نئی شناخت، نئی سوچ اور ایک مختلف لائحہ عمل کے ساتھ ان مسائل کو موضوع بحث بنا رہی ہے، جن کا براہ راست تعلق ہمارے سماج کے ساتھ ہے اور یہ وہ مسائل ہیں، جن کو یا تو ہم مسائل ہی نہیں سمجھتے اور یا پھر کم اہم جان کر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ایسے کئی مسائل پر گذشتہ کچھ عرصہ میں کونسل کی جانب سے بڑی پیش رفت دیکھنے میں آئی ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی کے طور پر میں کونسل کے اندر ہونے والی رونمائی کی ایک تقریب کا ذکر کروں گا، جس میں اسلامی نظریاتی کونسل کے ایک نئے جریدے ''اجتہاد'' اور مسلم خواتین کے مسائل پر عبدالحلیم محمد ابوشقہ کی عالمی شہرت کی حامل کتاب ''تحریر المرأۃ فی عصر الرسالۃ'' کے چار جلدوں پر مشتمل ترجمے کی رونمائی شامل تھی۔ ان دو وقیع کاموں کا تعارف تو میں اگلے کالم میں کروں گا، یہاں میں اس نشست کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں، جو اس مجلّے اور ترجمے کے ضمن میں منعقد ہوئی۔ نوجوان اسکالر اور جریدے کے مہمان مدیر خورشید احمد صاحب ندیم نے اپنے تعارفی کلمات میں کہا کہ ''بیسویں صدی میں جس شخصیت نے اجتہاد کے لیے بنیادی خطوط پر کام کیا وہ علامہ اقبال تھے۔ وہ خود کوئی مجتہد نہیں تھے بلکہ ایک فلسفی تھے اور اس منصب سے انہوں نے میدان سیاست میں قائداعظم کا انتخاب کیا، تو فقہ کی تدوین نو کے لیے ان کی نگاہ انتخاب مولانا انور شاہ کشمیری پر پڑی''۔ انہوں نے بتایا کہ ''ایک معاشرہ کا تشخص اگر اسلامی ہے اور یہ ایک زندہ معاشرہ کے طور پر قائم رہنا چاہتا ہے، تو اجتہاد اس معاشرہ کے قیام اور بقا کے لیے لازم ہے اور اجتہاد کے بغیر کسی زندہ اور متحرک معاشرہ کا وجود ناممکن ہے''۔ پروفیسر فتح محمد ملک نے اس رائے سے اختلاف کیا کہ علامہ اقبال ایک مجتہد نہیں تھے اور محض ایک فلسفی تھے، کیونکہ علامہ نے قیام پاکستان کا تصور دے کر ایک اجتہاد ہی کیا۔

> علمی، تحقیقی اور ملکی و ملی مسائل پر سوچ و بچار کرنے والے ادارے محض شاندار عمارتوں سے نہیں بلکہ ان کے اندر ہونے والے تحقیقی کام اور جاری اکیڈمک پروجیکٹس سے بنتے ہیں۔

اس تقریب میں جو واقعہ باعث تحریر بنا، وہ بعض شرکائے محفل کا وہ رویہ تھا، جو تحریک حقوق نسواں کی مشہور شخصیت محترمہ طاہرہ عبداللہ کی تقریر کے بعد سامنے آیا۔ محترمہ نے نسبتاً تند وتیز جملوں میں عصر حاضر کی مسلم خواتین کے ان مسائل کا ذکر کرنا چاہا، جو

بدقسمتی سے ہمارے اہل مذہب کے ہاں بہت کم زیر بحث آتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ آج کی مسلمان خاتون جن مسائل کا شکار ہے، وہ غربت، جہالت، عدم تحفظ، جسمانی اور جنسی تشدد، زندگی کے اہم امور میں فیصلہ کرتے وقت ان کی رائے نہ

> اسلامی نظریاتی کونسل اب ایک نئی شناخت، نئی سوچ اور ایک مختلف لائحہ عمل کے ساتھ ان مسائل کو موضوع بحث بنارہی ہے۔

پوچھنا، زندگی کی بنیادی سہولیات تک رسائی کا فقدان وغیرہ ہیں، جب کہ مذہبی لوگ جب بھی عورت کا ذکر کرتے ہیں، تو وہ جنسی تسکین اور فحاشی وعریانی سے زیادہ نہیں کرتے۔ ان کی تقریر ختم ہوتے ہی کئی مرد حضرات اپنی نشستوں سے اٹھے اور شاید ان مسائل کا ذکر چھیڑنے سے اپنی "مردانگی" کو خطرے میں محسوس کرتے ہوئے جذباتی انداز میں ہال سے باہر نکلے۔ یہ ایک ایسا رویہ تھا جو نہ صرف یہ کہ غیر علمی تھا بلکہ ناشائستہ بھی تھا۔

ہم جس دنیا میں رہتے ہیں، یہ تحریک کے اصول پر قائم ہے اور اس میں تیزی سے بدلتے حالات اور واقعات روزانہ کے حساب سے نت نئے سوالات کو جنم دیتے رہتے ہیں۔ اپنے وجود اور شناخت کے لحاظ سے متنبہ رہنے والے معاشرے تو اس بات کا غیر معمولی اہتمام کرتے ہیں کہ وہ ان سوالات کے کافی وشافی جوابات فراہم کریں کیونکہ جو تہذیب وتمدن اپنے سامنے اٹھنے والے سوالات کے تسلی بخش جوابات فراہم نہیں کرسکتی، وہ فنا ہوجایا کرتی ہے، فکری خلجان اور انتشار کا شکار ہوجاتی ہے، اس کا وجود اور شناخت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ لیکن جواب دینا تو درکنار، کیا ان سوالات کو اٹھانے کی بھی ہمت نہیں کرنی چاہئے؟ کیا محترمہ طاہرہ عبداللہ کے اٹھائے گئے سوالات کو محض اس وجہ سے نظر انداز کیا جائے کہ ایک خاتون کس طرح یہ جرأت کرسکتی ہے کہ وہ اتنے سارے مردوں کے سامنے ان سوالات کو اٹھائے؟

پہلے زمانے میں نت نئے موضوعات پر اجتہاد اور تحقیق کا یہ کام افراد اپنی انفرادی حیثیت میں ہی سرانجام دے سکتے تھے لیکن اب بالخصوص، صنعتیت (industrialization) کے عمل نے انسانی سماج کے لیے بہت سی پیچیدگیوں کو جنم دیا ہے اور مغرب میں یہ کام جامعات اور غور وفکر کے اداروں (think tanks) نے سنبھال لیا ہے اور بہت بڑے پیمانے پر یہ کام بغیر کسی توقف کے جاری وساری رہتا ہے۔ بلاشک، اجتہاد اور تحقیق کی اہمیت اور ضرورت اپنی جگہ، لیکن اس تقریب میں شرکت سے یہ احساس دامن گیر ہوا کہ نت نئے علمی سوالات کو سہنے اور شائستہ انداز میں اختلاف کرنے کا ہمارا سماجی رویہ بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے، جس کا مشاہدہ ہم صبح وشام اپنے گردوپیش میں کررہے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے اجتہاد جب ہوگا تو ایک سے ایک نئی آراء سامنے آتی جائیں گی جن میں ظاہر ہے کچھ ایسی ہوں گی، جن سے قدیم، روایتی اور پہلے سے راسخ آراء پر شدید ضرب بھی پڑتی ہوگی، تو ہم اگر اس نئی رائے سے اتفاق نہیں کرتے تو کم از کم ہمارے اندر اس کو سننے اور برداشت کرنے کا حوصلہ تو ہونا چاہئے کیونکہ اجتہاد اور تحقیق کی روایت صرف ان معاشروں میں ہی پنپ سکتی ہے، جہاں اختلاف رائے کی آزادی کو ایک بنیادی قدر کے طور پر مان لیا جائے اور جہاں اپنی رائے کی غلطی کے احتمال کے ساتھ کسی اور کی رائے کو صحیح ماننے کا جذبہ بھی موجود ہو۔ اہل مذہب کے عدم برداشت کی مثال لیں، تو ہم نے ڈاکٹر فضل الرحمٰن جیسی گراں قدر علمی شخصیت کو امریکہ میں پناہ لینے پر مجبور کردیا اور "خاکی بھائیوں" کا طرز عمل دیکھیں تو ڈاکٹر عائشہ صدیقہ کو اپنی کتاب ".Military Inco" کی رونمائی کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے اور اس کے بعد ان کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے!! تحقیق اور اجتہاد کی بات تو بعد میں کریں، پہلے عدم برداشت جیسے سماجی رویے کو بدلنے کی ضرورت ہے اور اس کو بدلنے میں سب سے مؤثر لوگ اگر کوئی ہوسکتے، ہیں تو وہ علماء کرام ہی ہیں۔

(روزنامہ مشرق، ۱۴ راگست ۲۰۰۷)

اسلامی نظریاتی کونسل
چند نئے امکانات

حسن الامین

جیسا کہ گذشتہ کالم میں ذکر ہوچکا کہ پروفیسر ڈاکٹر محمد خالد مسعود کی قیادت میں اسلامی نظریاتی کونسل نے کئی ایک نئی سرگرمیوں کا آغاز کیا ہے، جن کو آئین اور قانون جیسے فنی موضوعات کے بیچ کام کرنے والے ادارے کی خشک فضاؤں میں تازہ ہوا کا نیا جھونکا قرار دینا زیادہ مناسب ہوگا۔ کئی دہائیوں سے محض روایت کے بندھنوں میں مقید اس کونسل کی جانب سے دو نئی تخلیقات سامنے آئیں ہیں: ایک تو سہ ماہی جریدہ "اجتہاد" کا اجراء ہے، جس کا جون کا شمارہ چھپ کر آچکا ہے اور دوسرا، مسلم خواتین کے مسائل پر عربی میں چھپنے والی عبدالحلیم محمد ابوشقہ کی شہرہ آفاق کتاب "تحریر المرأۃ فی عصر الرسالۃ" کے چار جلدوں پر مشتمل ترجمے کی اشاعت ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے جن تین محققین نے اس کتاب کو عربی سے آسان اور سلیس اردو میں ترجمہ کیا، وہ جناب محمد خالد سیف، جناب ڈاکٹر غلام مرتضیٰ آزاد اور جناب انعام اللہ ہیں۔ یہ بلاشبہ، اپنے موضوع پر ایک غیر معمولی کتاب ہے، جو حقوق نسواں کے حوالہ سے ہمارے معاشرے میں موجود دونوں انتہاپسندانہ نکتہ ہائے نظر کے درمیان اعتدال قائم کرتی ہے اور ایک پل کا کام دیتی ہے۔ یہ کتاب نہ صرف یہ کہ ان لوگوں کے اعتراضات کا کافی حد تک جواب دیتی ہے جن کے خیال میں اسلام میں خواتین کو مردوں کی غلامی

میں دے دیا گیا ہے اور عورت کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ یہ تسکین ہوس کا ذریعہ ہے۔ اس کا مطالعہ ان مذہبی لوگوں کے لیے بھی نہایت لازم ہے، جن کے خیال میں عورت اپنی عقل اور فہم کے اعتبار سے ناقص اور ایک کم تر مخلوق کے درجہ میں ہے، جس کو سماج میں اپنی مرضی سے کوئی آزادانہ کردار ادا کرنے اور اپنی پوری شخصیت کے ساتھ سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ کتاب اگر ایک طرف پہلے نقطہ نظر کے حامل افراد کے ان اعتراضات کا تسلی بخش جواب دیتی ہے، جو خود کو سیکولر یا لبرل کے نام سے یاد کرتے ہیں، تو دوسری طرف یہ ان اہل مذہب کے استدلال کو بھی سپورٹ نہیں کرتی، جو خود کو روایت پسند طبقات کے نام سے موسوم کرتے ہے۔ یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے جن کے موضوعات یہ ہیں:

۱۔ مسلمان عورت کی شخصیت کے خدوخال

۲۔ معاشرتی زندگی میں مسلمان عورت کی شرکت

۳۔ اجتماعی زندگی میں خواتین کی شرکت کی مخالفت کرنے والوں سے مکالمہ

۴۔ مسلمان خواتین کا لباس اور زیب و زینت

مذہب کے عنوان اور مختلف مکاتب فکر کے مذہبی اداروں کی جانب سے سینکڑوں کی تعداد میں چھپنے والے رسائل و جرائد، جن میں شاید بہت ہی کم ایسے ہیں، جو ہمارے سماج کے حقیقی مسائل کو موضوع بحث بناتے ہیں اور شاید ایسے جرائد تو آٹے میں نمک کے برابر ہوں، جن کے مضامین میں مستعمل اصطلاحات، ان کا طرز بیان اور اسلوب ایک عام جدید تعلیم یافتہ انسان کی سمجھ میں آتا ہو، ایسے میں کیا ہی اچھا ہو اگر ان کے بیچ کسی ایسے جریدہ کا نمود ہو، جو ایک طرف تو ہمارے معاشرے کے حقیقی، عصری اور سلگتے مسائل کو مذہب کی روشنی میں ایڈریس کرے اور دوسری طرف ان کو ایک عام فہم اسلوب میں قارئین تک پہنچائے اور پھر ان تمام مختلف آراء کو ایک ہی جگہ اکٹھا کر کے پہنچائے جن کے بارے میں ایک عام آدمی جاننا چاہتا ہے۔ ہماری یہ دیرینہ آرزو اب پوری ہو چکی ہے کیونکہ اسلامی نظریاتی کونسل نے "اجتہاد" کے نام سے ایک نئے سہ ماہی جریدے کا آغاز کیا ہے، جس میں مسلمانوں کو درپیش عصری اور عملی نوعیت کے مسائل پر کیے جانے والے اجتہادی کام کو شائع کیا جائے گا۔ اس کا پہلا شمارہ (جون 2007) منصۂ شہود پر آ چکا ہے۔

اس پہلے شمارے کی خاص بات یہ ہے کہ اس نے اپنے سفر کا آغاز علامہ محمد اقبال کے تصور اجتہاد سے کیا ہے، جو ہمارے ہاں نسبتاً کم متنازعہ ہے۔ اس کے بارے میں جریدے کے مہمان مدیر لکھتے ہیں کہ "علامہ اقبال نے جن مسائل کی نشان دہی کی تھی، وہ کتنے اہم ہیں اور انہیں مخاطب بنائے بغیر محض قدیم فقہی کتب پر انحصار کرتے ہوئے ایک جدید مسلمان معاشرے کی تشکیل ممکن نہیں۔۔۔ اجتہاد اگر متحرک زندگی کا مسئلہ ہے، تو یہ تصور فی نفسہ، اس بات کا متقاضی ہے کہ اسے ایک مسلسل عمل قرار دیا جائے، دوسرے لفظوں میں، معاشرتی و ریاستی سطح پر ایسے افراد اور ادارے موجود رہیں، جو روزمرہ آنے والی تبدیلیوں پر نظر رکھیں اور ریاستی قوانین و معاشرتی روایات کا اس حوالے سے جائزہ لیتے رہیں کہ وہ بدلتے حالات میں فرد اور اجتماعیت کی اسلامی شناخت کو برقرار رکھنے کے لیے کس حد تک معاون ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک طرف روایت کے ساتھ ہمارا تعلق برقرار رہے اور دوسری طرف ہم روح عصر سے بھی پوری طرح مربوط رہیں"۔ (اداریہ، اجتہاد، جون 2007ء)۔

اس پہلے شمارے کی خاص بات یہ ہے کہ اس نے اپنے سفر کا آغاز علامہ محمد اقبال کے تصور اجتہاد سے کیا ہے، جو ہمارے ہاں نسبتاً کم متنازعہ ہے۔

اس جریدے میں جس مضمون کو مرکزیت حاصل ہے، وہ علامہ اقبال کا خطبہ ''الاجتہاد فی الاسلام'' ہے۔ جریدہ اجتہاد کے مہمان مدیر کی رائے میں، علامہ اقبال کے اس خطبے سے چند اہم سوالات کی نشان دہی ہوتی ہے:

۱- دور جدید میں اجتہاد ایک انفرادی معاملہ ہے یا اجتماعی؟

۲- ایک مسلمان ریاست میں کیا پارلیمنٹ کو حق اجتہاد حاصل ہے؟

۳- آج اجتہاد مطلق کی ضرورت ہے یا اجتہاد فی المذہب کی؟

۴- اجتہاد کے لیے نصوص کی قدیم تفسیر کافی ہے یا اس کی تفہیم نو کی بھی ضرورت ہے؟

۵- ایک اسلامی ریاست کے لیے کیا جمہوری ہونا بھی ضروری ہے؟

پروفیسر خالد مسعود سے جب اس نئے جریدے کی ضرورت اور افادیت کے حوالہ سے بات ہوئی تو انہوں نے اس کی انفرادیت کو یوں نمایاں کیا کہ "اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم خود سے کوئی اجتہاد کر کے اس میں شائع کریں اور نہ ہی اس کی نوعیت ان تحقیقاتی مجلّات کی ہے، جن میں نہایت ہی اکیڈمک زبان و بیان میں لکھے گئے تحقیقی مقالے (research papers) شائع ہوتے ہیں، بلکہ اس کا مقصد مسلمان معاشروں میں جنم لینے والے حقیقی اور زندہ معاشی، معاشرتی، سماجی، قانونی، سیاسی، تعلیمی اور تہذیبوں کی کشمکش کے حوالہ سے جنم لینے والے مسائل پر مختلف مکاتب فکر کی جانب سے کیے جانے والے اجتہاد کو ایک ہی پرچے میں، آسان اور سلیس زبان میں عام قارئین تک پہنچانا ہے"۔ جیسا کہ اگلے شمارے کا موضوع اسلام اور مغرب ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی ان نئی سرگرمیوں نے اجتماعی اجتہاد اور تحقیق کے کئی نئے امکانات کو جنم دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی یہ نئی کاوش اپنی ثمر آوری اور منفعت کے لحاظ سے بانجھ نہیں، بلکہ پروفیسر مسعود کا یہ بویا ہوا بیج اپنی خیر و برکت کے لحاظ سے شجر سایہ دار بنے گا اور اس کی کئی شاخیں اور کئی نسلیں ہوں گی، کیونکہ

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی!

(روزنامہ مشرق، ۵ راگست ۲۰۰۷)

حدود شرعیہ

اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات

مولانا زاھد الراشدی

اسلامی نظریاتی کونسل ایک آئینی ادارہ ہے جسے اس غرض سے تشکیل دیا گیا تھا کہ دستور پاکستان میں ملک کے تمام مروجہ قوانین کو قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھالنے کی جو ضمانت دی گئی ہے، اس کی تکمیل کے لیے حکومت پاکستان کی مشاورت کرے۔ اس کی عملی شکل یہ ہے کہ جدید قانون کے ممتاز ماہرین اور جید علماے کرام پر مشتمل ایک کونسل تشکیل دی جاتی ہے جو حکومت کے استفسار پر یا اپنے طور پر ملک میں رائج کسی بھی قانون کا اس حوالے سے جائزہ لیتی ہے کہ وہ قرآن وسنت کے مطابق ہے یا نہیں اور اگر وہ اس قانون کو اسلامی تعلیمات کے منافی تصور کرتی ہے تو اس کی خامیوں کی نشان دہی کرتی ہے اور اس کے متبادل قانون کا مسودہ ایک سفارش کی صورت میں مرتب کر کے حکومت کے سپرد کر دیتی ہے۔ دستور کی رو سے حکومت اس بات کی پابند ہے کہ وہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو قومی یا صوبائی اسمبلی میں پیش کر کے اس کے مطابق قانون سازی کرے۔

۱۹۷۳ء کے دستور سے قبل یہ ادارہ ''اسلامی مشاورتی کونسل'' کے نام سے اور اس سے پہلے ''تعلیمات اسلامیہ بورڈ'' کے نام سے قائم رہا ہے اور ملک کے بہت سے سرکردہ ماہرین قانون اور ممتاز علماے کرام مختلف اوقات میں اس میں خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنے قیام کے بعد سے اب تک سینکڑوں قوانین کا جائزہ لیا ہے اور ان کے بارے میں اپنی تجاویز اور سفارشات حکومت پاکستان کے سامنے پیش کی ہیں جن کے حوالے سے دستور کا یہ تقاضا کہ انھیں متعلقہ اسمبلیوں میں پیش کر کے قانون سازی کے مرحلہ سے گزارا جائے، ابھی تک تشنہ تکمیل ہے بلکہ اب تک یہ صورت حال رہی ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات اور اس کے مرتب کردہ مسودہ ہائے قانون کی پیشانی پر ''صرف سرکاری استعمال کے لیے'' کا لیبل چسپاں کر کے اس کی اشاعت کو شجرۂ ممنوعہ قرار دیا جاتا رہا ہے، لیکن جب سے ڈاکٹر خالد مسعود اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین بنے ہیں، یہ صورت حال قدرے تبدیل ہو رہی ہے۔ وہ کونسل کو عوامی بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور کونسل سے ہٹ کر علما اور دانش وروں کے وسیع حلقے کو اپنی مشاورت کے دائرے میں شامل کرنے کی تگ ودو میں مصروف ہیں۔ ان کی سربراہی کے دور میں کونسل کی طرف سے اسلامی احکام وقوانین کے حوالے سے مختلف سیمینارز کے انعقاد

اور متعدد سفارشات پیش کرنے کے علاوہ ''اجتہاد'' کے نام سے ایک سہ ماہی مجلّہ کا اجرا بھی کیا گیا ہے جس کا مقصد عالم اسلام کے مختلف اطراف میں اجتہاد کے حوالے سے ہونے والی علمی کاوشوں سے پاکستان کے دینی وعلمی حلقوں کو متعارف کرانا اور اس طرح باہمی ربط ومشاورت کا ماحول پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ جدید مسائل کے بارے میں اجتہادی ضروریات سے انھیں آگاہ کرنا ہے۔

اجتہاد کے بارے میں ہم اس وقت دو انتہا پسندانہ رویوں سے دوچار ہیں۔ ایک طرف سرے سے اجتہاد کی ضرورت سے انکار کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف اجتہاد کے نام پر امت کے چودہ سو سالہ علمی مسلمات اور اجماعی اصولوں کا دائرہ توڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے جبکہ حق ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے اور اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ امت مسلمہ کے اجماعی اصولوں اور علمی مسلمات کے دائرے میں رہتے ہوئے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں امت مسلمہ کے مسائل ومشکلات کا حل پیش کیا جائے اور خاص طور پر نئے پیش آمدہ مسائل کے قابل قبول دینی وعلمی حل کی کوئی صورت نکالی جائے۔

اس وقت اسلامی قوانین، دستوری دفعات اور عدالتی فیصلوں پر نظر ثانی کے تقاضے مختلف حلقوں کی طرف سے سامنے آ رہے ہیں اور دھیرے دھیرے ایسی فضا قائم ہو رہی ہے کہ اگر ان تقاضوں کے حوالہ سے اصولی ترجیحات کا ابھی سے تعین نہ کیا گیا تو اسلامائزیشن کے حوالہ سے سپریم کورٹ آف پاکستان، وفاقی شرعی عدالت اور اسلامی نظریاتی کونسل کا اب تک کا پورے کا پورا عمل نظر ثانی کی زد میں آ جائے گا۔ یہ ادارے اس سلسلہ میں مزید کسی پیش رفت کی بجائے اپنے سابقہ کام کی صفائیاں پیش کرنے اور ان میں رد وبدل کرنے میں ہی مصروف رہیں گے اور یہ ''ریورس گیئر'' پاکستان میں اسلامائزیشن کے عمل کو ایک بار پھر ''زیرو پوائنٹ'' تک واپس لے جائے گا۔

ہمیں اسلام کے نام پر نافذ ہونے والے قوانین پر نظر ثانی کی ضرورت سے انکار نہیں ہے اور اگر کسی مسودہ قانون میں کوئی فنی سقم رہ گیا ہے یا اس پر عمل درآمد کی راہ میں کوئی رکاوٹ موجود ہے تو قرآن وسنت کے اصولوں کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس پر نظر ثانی سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا لیکن یہ عمل ہمارے داخلی تقاضوں اور ضروریات کے حوالہ سے ہونا چاہیے اور اس سلسلہ میں بیرونی عوامل اور دباؤ کو قبول کرنے کا کسی

سطح پر بھی تاثر قائم نہیں ہونا چاہیے، ورنہ ضروری اور جائز نظر ثانی بھی شکوک وشبہات کا شکار ہو کر اس عمل پر عوام اور دینی حلقوں کے اعتماد کو مجروح کرنے کا باعث بن جائے گی۔ اس لیے میں اسلامائزیشن کی راہ میں حائل داخلی مشکلات اور اسلامی قوانین پر نظر ثانی کے دونوں حوالوں سے ''اسلامی نظریاتی کونسل'' کے سامنے مندرجہ ذیل تجاویز رکھنا چاہوں گا:

۱۔ اسلامی قوانین پر نظر ثانی کے خارجی دباؤ یعنی بین الاقوامی تقاضوں کا جائزہ لینے کے لیے ایک الگ ''ورکنگ گروپ'' قائم کرنے کی ضرورت ہے جو بین الاقوامی قوانین اور تقاضوں کے ساتھ شرعی قوانین کے تضادات کی نشاندہی کرے، ان تضادات کے اسباب اور پس منظر کی وضاحت کرے اور ان کے حوالہ سے شرعی قوانین کی افادیت، اہمیت اور ضرورت کو واضح کرتے ہوئے اس سلسلہ میں عالمی سطح پر اٹھائے جانے والے اعتراضات اور شکوک وشبہات کا جدید اسلوب اور خالصتاً علمی انداز میں جواب دے۔ ہم اس وقت اس معاملہ میں قومی سطح پر ''تذبذب'' کا شکار ہیں اور اسلامی قوانین کے بارے میں عالمی تقاضوں اور دباؤ کو نہ پوری طرح قبول کر رہے ہیں اور نہ ہی مسترد کر رہے ہیں۔ یہ طرز عمل درست نہیں ہے اور اس سے پاکستان میں اسلامائزیشن کے بارے میں ابہام اور کنفیوژن میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہمیں علمی انداز میں ان سوالات کا سامنا کرنا چاہیے اور علم ودانش کی اعلیٰ ترین سطح پر ان سوالات کا جائزہ لیتے ہوئے شکوک وشبہات کا علمی جواب دینا چاہیے۔ ہمارے نزدیک اس کام کے لیے ''اسلامی نظریاتی کونسل'' سب سے بہتر فورم ہے اور کونسل اس کام کے لیے حسب معمول دوسرے اہل علم کا تعاون بھی حاصل کر سکتی ہے۔
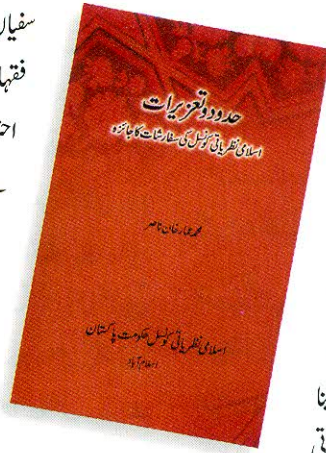
۲۔ داخلی تقاضوں، ضروریات اور مشکلات کا جائزہ لینے اور اسلامی قوانین کے مسودات کی خامیوں کی نشان دہی کے لیے ایک ''ورکنگ گروپ'' قائم ہونا چاہیے جس میں سیشن کورٹس کی سطح کے جج صاحبان، دینی مدارس میں فقہ وحدیث کا کم از کم بیس سالہ تجربہ رکھنے والے مدرسین اور اسی سطح کے وکلا صاحبان کو شامل کیا جائے جو متعلقہ قوانین کا تفصیلی اور شق وار جائزہ لے کر انہیں موثر بنانے کے لیے تجاویز دیں۔ آزاد کشمیر میں چونکہ سیشن جج اور ضلع قاضی مل کر مقدمات کا فیصلہ کرتے ہیں، اس لیے ان کا عملی تجربہ زیادہ ہے اور ''ورکنگ گروپ'' میں ایسے جج صاحبان اور قاضی حضرات کی شمولیت زیادہ مفید ہو سکتی ہے۔

۳۔ دور جدید میں اسلامی احکام وقوانین کی تعبیر وتشریح کے حوالے سے دنیا کے مختلف اسلامی ممالک میں مسلسل کام ہو رہا ہے اور بہت سے تحفظات کے باوجود اس سلسلے میں پیش رفت جاری ہے۔ اس امر کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ دنیائے اسلام کے مختلف حصوں میں ''اجتہاد'' کے عنوان سے ہونے والے کام سے پاکستان کے اہل علم ودانش کو آگاہ کیا جائے۔ ایک دوسرے کے نقطہ نظر سے واقفیت کے ساتھ ساتھ مختلف جہات سے ہونے والی اجتہادی کاوشوں کے نتائج بھی ہمارے سامنے ہونے چاہییں۔ اتفاق یا اختلاف اس سے بعد کا مرحلہ ہے کہ ہم کس بات کو قبول کرتے ہیں اور کون سی بات ہمارے نزدیک قبولیت کے معیار پر پوری نہیں اترتی، مگر اس سے پہلے ان کاوشوں سے اور ان کے دلائل ونتائج سے واقفیت ناگزیر ہے کیونکہ اس کے بعد ہی کسی بات سے اتفاق یا اختلاف کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ جہاں تک کسی تعبیر وتشریح کو قانون سازی کے دائرے میں عملاً قبول کرنے یا نہ کرنے کا تعلق ہے تو اس کے لیے صرف کسی صاحب علم یا مکتب فکر کا اسے پیش کر دینا اور اس پر اپنے خیال میں دلائل قائم کر دینا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ امت میں اسے قبولیت حاصل ہونا بھی ضروری ہے۔ امت میں حسن بصریؒ، سفیان ثوریؒ، لیث بن سعدؒ اور امام بخاریؒ کے درجے کے بیسیوں فقہائے کرام موجود ہیں جن کے علم وفضل اور کردار وتقویٰ کے تمام تر احترام کے باوجود ان کی فقہی آرا اور تعبیرات وتشریحات کو امت نے قبول نہیں کیا، اسی لیے ان پر عمل بھی نہیں ہو رہا تو آج بھی کسی صاحب علم کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ان کی تعبیر وتشریح کو امت میں قبولیت کا درجہ حاصل ہوئے بغیر واجب العمل سمجھ لیا جائے گا۔

صدر محمد ایوب خان کے دور میں عائلی قوانین کے نام سے نکاح، طلاق اور وراثت کے شرعی قوانین کو ردوبدل کا نشانہ بنایا گیا تھا اور حکومت نے دینی وعلمی حلقوں کے اختلاف کو نظر انداز کرتے ہوئے قانون اور حکومت کے زور پر عائلی قوانین ملک میں نافذ کر دیے تھے، مگر ساری دنیا اس حقیقت کا مشاہدہ کر رہی ہے کہ نصف صدی کے قریب عرصہ گزر جانے کے باوجود یہ قوانین اب بھی قوم میں متنازعہ ہیں۔ جہاں تک قانون کا جبر کام کرتا ہے، اس سے زیادہ عائلی قوانین کا کوئی اثر معاشرے میں نہیں ہے۔ لوگ اب بھی نکاح، طلاق اور وراثت کے احکام میں مسائل علمائے کرام ہی سے پوچھتے ہیں اور انہی پر عمل کرتے ہیں۔ قوم نے ان قوانین کو آج تک سنجیدگی سے نہیں لیا اور نہ ہی انہیں ذہنی طور پر قبول کیا ہے۔

اس کے اسباب پر نظر ڈالی جائے تو دو باتیں بطور خاص سامنے آتی ہیں۔ ایک کی طرف ہم سطور بالا میں اشارہ کر چکے ہیں کہ ہمارے ہاں عام طور پر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ شرعی احکام وقوانین میں ردوبدل کی کوئی بات سرکاری حلقوں کی طرف سے سامنے آئے تو اس کا داعیہ داخلی ضروریات نہیں بلکہ خارجی دباؤ اور مغرب کے مطالبات ہوتے ہیں اور یہ بات کسی بھی مسلمان کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ جبکہ دوسری وجہ

یہ ہے کہ ایسے مواقع پر شرعی احکام وقوانین کی تعبیر وتشریح میں عام مسلمانوں اور جمہور اہل علم کے مسلمات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر حدود وتعزیرات کے بارے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی زیر نظر سفارشات کو ہی دیکھ لیا جائے۔ کونسل نے ان سفارشات میں صرف قرآن کریم کو

> اسلامی قوانین پر نظر ثانی کے خارجی دباؤ یعنی بین الاقوامی تقاضوں کا جائزہ لینے کے لیے ایک الگ ”ورکنگ گروپ“ قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

بنیاد بنایا ہے اور شرعی احکام کے باقی تینوں مسلمہ مآخذ: سنت، اجماع اور قیاس سے صرف نظر کیا ہے۔ چنانچہ رجم کے شرعی حد ہونے اور ارتداد کی شرعی سزا سے انکار اور سفارشات میں شامل دیگر بہت سی باتوں کا ہمارے نزدیک پس منظر یہی ہے۔ جبکہ معروضی صورت حال یہ ہے کہ ملک کی آبادی کی غالب اکثریت اہل السنۃ والجماعۃ پر مشتمل ہے، جن کا تعارف ہی سنت اور جماعت کے حوالہ سے ہے کہ وہ قرآن کریم کی تشریح اور احکام شرعیہ کی تعبیر میں سنت رسولؐ اور جماعت صحابہ کو معیار سمجھتے ہیں اور اہل السنۃ والجماعۃ کے جمہور اہل علم کے نزدیک احکام شرعیہ اور اسلامی قوانین کی بنیاد چار مآخذ پر ہے: قرآن کریم، سنت رسولؐ، اجماع اور قیاس۔ مگر اسلامی نظریاتی کونسل کی ان سفارشات میں قرآن کریم کو بطور ماخذ اپنایا گیا ہے اور اس کی تشریح و تعبیر میں قیاس محض یعنی عقل عام کو ذریعہ کے طور پر اختیار کیا گیا ہے جس سے سنت رسولؐ، اجماع اور قیاس شرعی تینوں اس معاملہ سے بے دخل ہو گئے ہیں۔

سنت رسولؐ کے اسلامی قوانین کا بنیادی ماخذ ہونے کی حیثیت کو نظر انداز کرتے ہوئے کونسل اس بات کو بھی بھول گئی ہے کہ قیام پاکستان کے بعد سنت رسولؐ کی اس حیثیت کا بعض حلقوں کی طرف سے شد ومد کے ساتھ انکار ہوا تھا اور اس پر بہت دیر تک بحث ومباحثہ کا بازار گرم رہا تھا مگر ملک کی رائے عامہ نے اسے سختی کے ساتھ مسترد کر دیا اور قوم کے منتخب نمائندوں نے جب ۱۹۷۳ء کا دستور ترتیب دیا تو اس میں صرف قرآن کریم کو قانون سازی کی بنیاد نہیں بنایا بلکہ سنت کو اس کے ساتھ شامل کر کے قرآن و سنت کو دستور اور قانون کے معاملات میں مشترکہ معیار اور ماخذ قرار دیا تھا۔

ان تحفظات کے ساتھ ساتھ بہرحال یہ بات اطمینان کا باعث ہے کہ دینی، علمی اور ملی مسائل پر باہمی تبادلہ خیالات اور مکالمہ کی ضرورت کا احساس بڑھتا جا رہا ہے اور اس پس منظر میں عزیزم حافظ محمد عمار خان ناصر سلمہ اللہ تعالیٰ نے حدود وتعزیرات کے بارے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کا فقہی اصول اور دلائل کی روشنی میں جائزہ لیا ہے جو اس بحث ومباحثہ کو علمی انداز میں آگے بڑھانے کی ایک مفید کوشش ہے۔ آج کے ایسے نوجوان اصحاب علم کو جو علمی استعداد اور وسعت مطالعہ کے ساتھ ساتھ معروضی حالات ومسائل اور پیش آمدہ علمی وفکری مشکلات کا کسی حد تک ادراک بھی رکھتے ہیں، فکری وفقہی جمود اور مطلق آزادیٔ فکر کی دو انتہاؤں کے درمیان متوازن راستہ تلاش کرنے میں جن دشواریوں کا سامنا ہے، مجھے پوری طرح ان کا احساس ہے، اس لیے اہل السنۃ والجماعۃ کے علمی مسلمات کے دائرہ میں رہتے ہوئے ان کے لیے آزادانہ بحث ومباحثہ اور تحقیق وتمحیص کا حق تسلیم کرتا ہوں اور ہمیشہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں۔ اس کی کچھ جھلک اس جائزہ میں بھی قارئین کو نظر آئے گی مگر میرے نزدیک یہ علمی مباحثہ ومکالمہ کا ناگزیر حصہ ہے اور ان مراحل سے گزرے بغیر کسی مسئلہ کے صحیح حل تک پہنچنا عام طور پر ممکن نہیں ہوتا۔

ضروری نہیں ہے کہ اس جائزہ کی ہر بات سے اتفاق کیا جائے لیکن یہ ضروری ہے کہ اس کا توجہ کے ساتھ مطالعہ کیا جائے اور دور حاضر کے وسیع عالمی تناظر میں اسلامی احکام وقوانین کی تعبیر وتشریح کے حوالہ سے جو مشکلات وضروریات اسلامی نظریاتی کونسل کی ان سفارشات اور ان پر عزیزم حافظ محمد عمار خان ناصر سلمہ کے اس تبصرہ سے ظاہراً یا بین السطور جھلکتی دکھائی دے رہی ہیں، علمی رسوخ واعتماد سے بہرہ ور شخصیات اور ادارے ان کی طرف سنجیدگی کے ساتھ متوجہ ہو کر اس سلسلے میں امت مسلمہ کی راہ نمائی کا فرض ادا کریں کہ یہی وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔

مغرب میں اسلامی تہذیب کے مطالعے کم وبیش چار نقطہ ہائے نظر سے کیے گئے ہیں جن سے چار گروہ پیدا ہوئے ہیں:

۱۔ ماہرین فلسفہء تاریخ جو عالمی تہذیب کا جائزہ لیتے ہیں اور اس ضمن میں اسلام اور اس کے تہذیبی منظر نامے کا مطالعہ کرتے ہیں۔

۲۔ وہ مستشرقین جو بطور خاص اسلامی تہذیب کے مظاہر کا مطالعہ کرتے ہیں۔

۳۔ تاریخ فلسفہ وعلوم پر لکھنے والے جو فلسفہ وتاریخ کی عالمی حرکت میں، مغرب کے نقطہء نظر سے اسلامی تہذیب کے اس پہلو کو مطالعے کا موضوع بناتے ہیں۔

۴۔ ماضی قریب میں پیدا ہونے والا گروہ جو اسلامی دنیا کے موجود ڈھانچے کو سیاسی اور معاشی پس منظر میں سمجھنے کو کوشش کرتا ہے۔

اسلامی دنیا میں ان موضوعات پر لکھنے والے دو گروہوں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں۔ ایک وہ جو کسی نہ کسی طور ان میں سے کسی ایک کے زیر اثر ہے، اور دوسرا وہ جو عصر حاضر کے علمیاتی چیلنج کی روشنی میں اسلامی تہذیب کے مطالعے کی وہ منہاج دریافت کرنا چاہتا ہے جس سے اس کی وقت محترکہ کا اندازہ ہو سکے اور اس کی تاریخ کے موثرات پر نتیجہ خیز گرفت حاصل کی جاسکے۔

(ملت اسلامیہ: تہذیب وتقدیر، سراج منیر)

اسلامی نظریاتی کونسل کی دو اہم کاوشیں

مولانا زاہد الراشدی، ڈائریکٹر الشریعہ اکیڈمی، گوجرانوالہ

۲ راگست کو اسلامی نظریاتی کونسل نے اسلام آباد میں ایک مجلس کا اہتمام کیا۔ یہ علمی اور فکری نشست دو حوالوں سے تھی۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے ''اجتہاد'' کے عنوان سے ایک علمی وفکری سہ ماہی مجلّہ کا اجرا کیا ہے جس کا پہلا شمارہ منظر عام پر آ چکا ہے، جبکہ خواتین کے حقوق کے حوالے سے نامور عرب عالم دین اور دانش ور الاستاذ عبد الحلیم ابوشقہ کی ایک معرکہ آرا کتاب کا اردو ترجمہ اسلامی نظریاتی کونسل نے شائع کیا ہے۔ یہ تقریب مجلّہ ''اجتہاد'' اور ''آزادی نسواں، عہد رسالت میں'' کے نام سے شائع ہونے والی اس کتاب کی رونمائی کے لیے منعقد ہوئی اور کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر خالد مسعود صاحب نے مجھے بطور خاص اس میں شرکت کی دعوت دی۔ دونوں موضوع میری خصوصی دلچسپی کے ہیں، اس لیے حاضری ضروری تھی۔ اجتہاد کی ضرورت اور حدود وکار پر گزشتہ ربع صدی سے مسلسل لکھتا آ رہا ہوں۔ مذکورہ مجلّہ میں بھی مفکر پاکستان علامہ محمد اقبال کے تصور اجتہاد پر میرا ایک مضمون شامل اشاعت ہے اور شاید میری اسی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے سہ ماہی ''اجتہاد'' کی مجلس مشاورت میں میرا نام بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

اجتہاد کے بارے میں ہم اس وقت دو انتہا پسندانہ رویوں سے دوچار ہیں۔ ایک طرف سے سرے سے اجتہاد کی ضرورت سے انکار کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف اجتہاد کے نام پر امت کے چودہ سو سالہ علمی مسلمات اور اجماعی اصولوں کا دائرہ توڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے جبکہ حق ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے اور اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ امت مسلمہ کے اجماعی اصولوں اور علمی مسلمات کے دائرے میں رہتے ہوئے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں امت مسلمہ کے مسائل ومشکلات کا حل پیش کیا جائے اور خاص طور پر نئے پیش آمدہ مسائل کے قابل قبول دینی وعلمی حل کی کوئی صورت نکالی جائے۔ دنیا کے مختلف اسلامی ممالک میں اس پر مسلسل کام ہو رہا ہے اور بہت سے تحفظات کے باوجود اس سلسلے میں پیش رفت جاری ہے۔ میں خود اس امر کی ضرورت محسوس کر رہا تھا کہ دنیائے اسلام کے مختلف حصوں میں ''اجتہاد'' کے عنوان سے ہونے والے کام سے پاکستان کے اہل علم ودانش کا آگاہ ہونا ضروری ہے۔ اتفاق یا اختلاف اس کے بعد کا مرحلہ ہے کہ ہم کس بات کو قبول کرتے ہیں اور کون سی بات ہمارے نزدیک قبولیت کے معیار پر پوری نہیں اترتی، مگر اس سے پہلے ان کاوشوں سے اور ان کے دلائل ونتائج سے واقفیت ناگزیر ہے کیونکہ اس کے بعد ہی کسی بات سے اتفاق یا اختلاف کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنے سہ ماہی مجلّہ ''اجتہاد'' کا دائرۂ کار یہی طے کیا ہے اور اس کی ادارتی ذمہ داری ہمارے ایک فاضل دوست خورشید احمد ندیم کے سپرد کی ہے، جو بعض مسائل میں اختلاف واتفاق کے تحفظات سے قطع نظر اپنی استعداد، اہلیت اور ذوق کے حوالے سے اس کام کے لیے موزوں ہیں اور اسے بہتر طریقے سے آگے بڑھا سکتے ہیں۔

الاستاذ عبد الحلیم محمد ابوشقہ کی کتاب ''تحریر المرأۃ فی عصر الرسالۃ'' میں نے کوئی دس برس قبل لندن میں ورلڈ اسلامک فورم کے سیکرٹری جنرل مولانا مفتی برکت اللہ کی لائبریری میں دیکھی تھی اور صرف دیکھی نہیں بلکہ پڑھی بھی تھی۔ یہ کتاب چار جلدوں میں ہے اور اس میں مصنف نے اس بات پر بحث کی ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے معاشرے میں عورتوں کے حقوق اور آزادی کے حوالے سے کیا عملی تبدیلیاں پیدا کی تھیں اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے اسلامی معاشرہ میں عورتوں کو کون کون سے شعبوں میں کیا کیا آزادیاں حاصل تھیں۔ مصنف نے اس کتاب میں قرآن کریم کے بعد حدیث نبوی کی دو مستند ترین کتابوں بخاری شریف اور مسلم شریف کو حوالوں کے لیے بنیاد بنایا ہے اور تمام معلومات قرآن کریم، بخاری شریف اور مسلم شریف کے دائرے میں رہتے ہوئے پیش کی ہیں۔ ان کے بعض استدلالات اور نتائج فکر سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن مصنف کی یہ محنت واقعتاً قابل داد ہے کہ انھوں نے عورتوں کے حقوق اور آزادی کے حوالے سے مباحثہ ومکالمہ کے لیے قرآن وسنت کا مستند ترین مواد یکجا کر دیا ہے۔ میری ایک عرصہ سے خواہش تھی کہ اس کتاب کا اردو ترجمہ ہو جائے تاکہ پاکستان کے دینی حلقے بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے یہ کام کر دیا ہے اور اپنے وسائل اور دائرۂ کار کی مناسبت سے وہی یہ کام بہتر طور پر کر سکتی تھی، جس پر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی موجودہ ہیئت سے ملک کے روایتی دینی حلقوں کو بہت سی شکایات ہیں اور کونسل کا غیر متوازن ڈھانچہ اور بعض فیصلے ان شکایات کا جواز بھی فراہم کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود سہ ماہی مجلّہ ''اجتہاد'' کا آغاز اور ''تحریر المراۃ فی عصر الرسالۃ'' کے اردو ترجمہ کی اشاعت کو اسلامی نظریاتی کونسل کی اچھی کوششوں میں ہی شمار کیا جانا چاہیے۔ (روزنامہ ''اسلام'' اسلام آباد)

دنیائے اسلام کے مختلف حصوں میں ''اجتہاد'' کے عنوان سے ہونے والے کام سے پاکستان کے اہل علم ودانش کا آگاہ ہونا ضروری ہے۔

○ ''اجتہاد'' مل گیا ہے۔ بہت شکریہ، میں ان شاءاللہ اس سے استفادہ کروں گا۔

جناب ڈاکٹر صفدر محمود

لاہور

○ اگرچہ ہر روز بہت سی کتب اور رسائل کا مشاہدہ ہوتا ہے مگر بہت عرصہ بعد ایسا جاذب نظر اور تحقیق سے بھرپور رسالہ دیکھنے کو ملا۔ مجلس ادارت اور مضمون نویس حضرات کی فہرست میں ملک کے مشہور اور بڑے نام ہیں، جو تحقیق بالخصوص اقبالیات کے حوالے سے مستند تصور کیے جاتے ہیں، ان کا نام اور کاوش دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

جناب سید فیضان عباس

نائب مدیر ''راوی''

گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

○ میگزین کے بعض مضامین فکر انگیز اور بعض معلوماتی حیثیت کے حامل ہیں، امید ہے کہ یہ میگزین قومی و دینی روایات کے فروغ اور ان کے صحت بخش رجحانات کو متعین کرنے کا باعث ہوگا۔

جناب پروفیسر ڈاکٹر سعید الرحمٰن

چیئرمین ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک سٹڈیز

بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

○ اسلام کی اجتہادی روایت کی ترجمانی کے حامل اس مجلّے کا اجراء ایک عصری تقاضے کی تکمیل کے مترادف ہے۔ آج ہم قومی اور عالمی سطح پر جن متنوع مسائل سے دوچار ہیں، نہ صرف عالم اسلام میں جاری اجتہادی کاوشوں سے آگہی ضروری ہے، بلکہ ٹھوس علمی بنیادوں پر پیش رفت بھی اس کا ایک اہم تقاضا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کا تحقیقی مجلّہ اس باب میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ ہم اس علمی و فکری پیش رفت پر آپ کو اور سہ ماہی ''اجتہاد'' کے ادارتی بورڈ کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

جناب ڈاکٹر طاہر حمید تنولی

معاون ناظم (ادبیات) اقبال اکادمی پاکستان

○ اس نئے تحقیقی مجلّے ''اجتہاد'' کے جاری کرنے پر مبارک باد قبول فرمائیں۔ یہ مجلّہ ہمارے ادارے کے سکالرز کے لیے بہت دلچسپی کا باعث ہے۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کے سہ ماہی مجلّہ ''فکر ونظر'' کے ساتھ آپ کے مجلّہ کے تبادلہ کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

جناب ایس ایم اے اقبال

ایڈیٹنگ اینڈ پبلشنگ بیورو

ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد

○ رسالہ ''اجتہاد'' سے یقیناً ان لوگوں کی خوشیاں دو چند ہوئی ہیں، جو مدتوں سے (اپنی محدود صلاحیتوں کے ساتھ) ''عمل اجتہاد'' میں مصروف ہیں اور چاہتے ہیں کہ ملت اسلامیہ بحیثیت مجموعی دین کی روح کو سمجھے اور فکر جامد سے نکل کر ''تقلید متحرک'' کو اپنا شعار بنائے کیونکہ ترک اجتہاد سے دین کی جوئے رواں جوہڑ بن گئی ہے اور اپنے پیاسوں کو صاف وشفاف پانی مہیا کرنے سے قاصر ہے۔ اب صرف عمل اجتہاد سے ہی تشنہ لبوں کو صاف وشفاف پانی فراہم کیا جاسکتا ہے۔ دین اسلام قیامت تک کے لیے ہدایت کی جو ضمانت فراہم کرتا ہے، وہ دراصل اجتہاد کی صورت میں ہی ممکن ہے۔ کاش یہ حقیقت کما حقہ ہمارے اہل دانش بھی سمجھ سکیں۔

جناب ڈاکٹر محمد شکیل اوج

مدیر اعلیٰ سہ ماہی التفسیر، کراچی

جرائد و رسائل کے تبصرے

○ اسلامی نظریاتی کونسل کی جانب سے 'اجتہاد' کے نام سے شائع ہونے والے مجلّے میں مفکر پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کے تصورِ اجتہاد کو زور وشور سے پیش کیا گیا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی جانب سے 'اجتہاد' جیسے اہم موضوع پر کام کا آغاز نہایت قابل قدر ہے اور یہ کام جسے کونسل نے آج شروع کیا ہے، برسوں پہلے ہو جانا چاہئے تھا۔ بہر حال

دیر آید.........................

ہر صاحب عقل، ذی شعور اور روشن دماغ عالم 'اجتہاد' کی اہمیت بخوبی سمجھتا ہے اور اسے ہی دین اسلام کی اکملیت، ہر دور میں قرآن وسنت کی تازگی وشادابی اور قیامت تک کے مسائل کا حل گردانتا ہے اور یہ جانتا ہے کہ جمود زدہ معاشرے میں یہی روشنی کی کرن ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی شخصیات اور ان کی فقہی آراء کو حتمی وابدی جاننے سے گھٹن اور جمود پیدا ہوا، خدائے باری تعالیٰ نے حفاظت شرع کے ذمہ کی پاسداری کے پیش نظر ایسی شخصیات کو بھیج دیا، جنہوں نے قرآن وسنت کے احیاء کا نعرہ بلند کیا۔ قابل غور بات یہ ہے کہ انہوں نے احیاء کے اس بابرکت کام کا آغاز 'اجتہاد' کو زندہ کرنے سے کیا۔

اجتہاد کی نام لیوا تمام شخصیات قابل قدر ہیں اور انہی میں ایک روشن نام علامہ محمد اقبالؒ کا بھی ہے۔ چونکہ اقبالؒ کے اندر ملت اسلامیہ کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، اس لیے وہ ملت اسلامیہ کو ترقیوں اور رفعتوں کی بلندیوں پر دیکھنا چاہتے تھے۔ یاد رہے جب وہ عظمتوں اور سطوتوں کی کنہہ تک پہنچے تو انہیں ترقی کا جو واحد راستہ دکھائی دیا، وہ اجتہاد ہی کا تھا۔ اقبالؒ نے اسی لیے اجتہاد کو زندہ کرنے پر بے حد زور دیا ہے۔ اس مفکر اعظم کا یہی میدان تھا کہ وہ اجتہاد کو زندہ کرنے کی فکر کے حامل تھے اور چوک ہوئی ہے ان لوگوں سے، جنہوں نے حضرت اقبالؒ کو 'مفکر' سے بڑھا کر 'مجتہد' کا درجہ دیا۔ مزید یہ کہ ان کے دیے گئے اجتہاد کے طریقہ کار کو حتمی سمجھنے کے ساتھ ساتھ ترقی دینا بھی شروع کردی۔ یہ نہ صرف اسلامی تعلیمات کے منافی ہے بلکہ روحِ اقبال سے بھی مذاق ہے، کیونکہ کسی بھی شخص کو اس کے مقام ومرتبہ سے کم تر سمجھنا اس کی توہین ہے اور اسے حقیقی مقام ومرتبہ سے اعلیٰ وافضل قرار دینا اس کی شان میں گستاخی ہے۔ جیسے سید الانبیاء جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کو ان کی حیثیت سے کم کرنا پامالی حرمت رسول ﷺ ہے، اسی طرح ان کو ان کے رتبے سے بڑھا کر اللہ رب العزت کے برابر یا قریب لے جانا گستاخی ہے۔ کسی صوبیدار کو کرنل کہہ کر پکارنا توہین ہے اور اس کو چپڑاسی کہنا بھی تحقیر ہے۔ یہی حال علامہ اقبالؒ کا ہے، انہوں نے تو یہ فکر دی کہ جدت وترقی کی چابی اجتہاد میں پنہاں ہے۔ اس لیے ان کو فکر اجتہاد کا علم بلند کرنے والا مردِ قلندر قرار دینا ہی ان کا مقام ومرتبہ ہے، لیکن ان کے اجتہاد کرنے کے طریقہ کار کو اپنانا (اگر اس کی نسبت ان کی طرف صحیح ہے اور یہ بھی ثابت شدہ ہو کہ انہوں نے اس سے رجوع نہیں کیا تھا) یا ان کو مجتہد گرداننا اور اس کی اشاعت کرنا ان کی روح سے مذاق ہے، کیونکہ یہ ان کا میدان نہیں تھا۔ اس میدان کے شہسوار تو وہ لوگ ہیں جو قرآن وسنت، اس کی زبان، اس کی باریکیوں، اس سے استنباط مسائل کے اصول، انطباق کے طریقے اور حالات حاضرہ سے مکمل واقف ہوں۔ وہ فقہ الاحکام اور فقہ الواقعہ کے بھرپور عالم ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے انطباق کے اصولوں سے بخوبی آگاہ ہوں۔

رہا سوال دورِ حاضر کی قحط الرجال کی کیفیت کا، تو آج کے دور میں اس کی ممکنہ شکل اجتماعی اجتہاد کی ہے۔ چونکہ آج Specialization کا دور ہے، اس لیے پیش آمدہ مسئلہ کی جمیع ابعاد سے متعلقہ افراد کو اکٹھا کر کے ان کی آراء لے لی جائیں اور اس مسئلے کے حل تک پہنچا جائے۔ یہی آج کے حالات میں بہترین، اعلیٰ اور قابل عمل صورت ہے۔

سلف صالحین کے متفقہ اسالیب اور شرائط اجتہاد ومجتہد کے پیش نظر ہمارا بھرپور مطالبہ ہے کہ روحِ اقبالؒ سے کیے جانے والے توہین آمیز مذاق بند کیے جائیں، جو مفکر اعظم کی شان میں گستاخی اور ان کی تحقیر ہے۔

الاحیاء، اگست ۲۰۰۷ء

○ اسلامی نظریاتی کونسل حکومت پاکستان کا ایک ایسا ادارہ ہے، جو دینی ومذہبی معاملات میں بطور مشاورت کے قومی اسمبلی کی مطلوب رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ اس کونسل میں صاحبانِ علم اور اربابِ فکر ونظر کو تین سال کے لیے بطور رکن نامزد کیا جاتا ہے اور ان کے فہم وفراست اور تحقیق ومطالعہ سے فائدہ اٹھایا

جاتا ہے۔ پچھلے دنوں (۱۵ر جون ۲۰۰۷ء) کونسل نے اپنے تین سال مکمل کر لیے ہیں اور ایک غیر سرکاری خبر کے مطابق اب نئی کونسل کی تشکیل مزید تین سال کے لیے کر دی گئی ہے گو یہ کونسل ابھی نا تمام ہے لیکن توقع ہے کہ بہت جلد اسے مکمل کر لیا جائے گا۔

کونسل کے چیئر مین معروف دینی سکالر ڈاکٹر محمد خالد مسعود ہیں، جو دوسری بار چیئر مین نامزد ہوئے ہیں۔ اس منصب پر ڈاکٹر صاحب کا انتخاب دراصل حسن انتخاب ہے۔ کونسل کا چیئر مین ایسے ہی صاحب فکر ونظر کو ہونا چاہئے تھا، جیسا کہ ڈاکٹر صاحب ہیں۔ اس تقرر کو ہم حکومت پاکستان کے ''اعمال صالحہ'' میں شمار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر خالد مسعود ایک سرگرم، فعال اور پر مغز شخصیت کے حامل ہیں انہوں نے گزشتہ تین سالوں میں اسلامی قانون سازی میں اچھی پیش رفت کی ہے۔ سر دست ہم فقط اس سہ ماہی مجلّہ اجتہاد کا ذکر کرنا چاہتے ہیں، جو انہوں نے حال ہی میں کونسل کی جانب سے جاری کیا ہے۔ یہ مجلّہ اپنے نام سے اپنے کام کو متعین کرتا ہے۔ جہازی سائز کے ۱۶۰ صفحات پر مشتمل مجلّہ کی پہلی کاپی میرے پیش نظر ہے۔

مجلّہ کے مدیر مسئول ڈاکٹر خالد مسعود نے تقدیم کے زیر عنوان لکھا ہے کہ ''رسالہ اجتہاد کا مقصد اجتہاد پیش کرنا نہیں، بلکہ اسلامی دنیا میں جاری فکری عمل کا جائزہ پیش کر کے دعوت فکر و عمل دینا ہے۔ عالم اسلام نہ تو کسی فکری پسماندگی کا شکار ہے اور نہ ہی تنگ نظری، رجعت پسندی اور مغرب زدگی کا یرغمال ہے۔ یہ رسالہ اسلام اور عالم اسلام کے بارے میں مثبت تاثر پیش کر کے پاکستان کے قارئین کو اس پیش رفت سے آگاہی فراہم کرے گا، جو پاکستان میں آسانی سے دستیاب نہیں''۔

سہ ماہی مجلّہ اجتہاد سے یقیناً ان لوگوں کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے، جو اپنی اپنی بساط کے مطابق مدتوں سے ''عمل اجتہاد'' میں مصروف ہیں اور چاہتے ہیں کہ ملت اسلامیہ بحیثیت مجموعی دین کی روح کو سمجھے اور تقلید جامد سے نکل کر فکر متحرک کو اپنا شعار بنائے۔ کیونکہ ترک اجتہاد سے دین کی جوئے رواں جوہڑ بن گئی ہے، جو اپنے پیاسوں کو صاف وشفاف پانی مہیا کرنے سے قاصر ہے۔ اب صرف اجتہاد کے ذریعے ہی ایسا ممکن ہے کہ تشنہ لبوں کی سیرابی کا انتظام کیا جائے۔ اسلام قیامت تک کے لیے انسانی ہدایت کی جو ضمانت فراہم کرتا ہے، وہ بھی عمل اجتہاد کی صورت میں ممکن ہے، کاش! یہ حقیقت ہمارے اہل دانش بھی باور کر سکیں۔

ع اہل دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہل نظر

ہمارا خیال ہے کہ مجلّہ اجتہاد کو سدا اسم با مسمّیٰ رکھنے کی ضرورت ہے۔ صاحبان فکر ونظر کی جانب سے گاہ بگاہ جو اجتہادی کاوشیں دیکھنے میں آتی ہیں، انہیں باایں طور سراہا جائے کہ انہیں اس مجلّہ کی زینت بنایا جائے تاکہ اجتہادی فکر پروان چڑھتی رہے اور نئے نئے ''مجتہدین'' پیدا ہوتے رہیں۔ جی ہاں! مجتہدین اسی طرح پیدا ہو سکتے ہیں۔ کسی نے علامہ اقبال سے کہا تھا کہ آپ Back to the Holy Quran کا تذکرہ بار بار کرتے ہیں، قرآن پڑھانے اور اس کے سمجھانے والے کہاں سے آئیں گے؟ جواباً اقبال نے کہا آپ قرآن قرآن کرتے رہئے، قرآن اپنے مفسرین خود پیدا کر لے گا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئر مین ڈاکٹر خالد مسعود نے بڑی جرأت سے نعرہ اجتہاد بلند کیا ہے، جو انشاء اللہ ہر سہ ماہی کو اجتہادی افکار ونظریات کے ساتھ نہ صرف پاکستان بلکہ پورے عالم اسلام میں شدت کے ساتھ صدائے بازگشت کی صورت گونجتا رہے گا اور دنیائے علم وفضل میں فکری ارتعاش پیدا کرتا رہے گا۔ ہمیں اجتہاد اجتہاد کرتے رہنا چاہئے۔ باقی رہا یہ کہ اجتہاد کرنے والے کہاں سے آئیں، گے تو ہم سمجھتے ہیں کہ وہ اسی راستے سے آئیں گے، جس راستے کو ڈاکٹر خالد مسعود نے اختیار کیا ہے۔ ہماری دعاء ہے کہ مجلّہ اجتہاد، اسلام کی اجتہادی روایت کا ترجمان بن کر آسمان علم وفضل پر ہمیشہ جگمگاتا رہے۔ آمین۔

سہ ماہی التفسیر، جولائی تا ستمبر اگست ۲۰۰۷ء

- خاکسار کے پاس بے شمار ماہنامے، سہ ماہی اور ششماہی وسالنامے آتے ہیں، مگر پاکستان کی حد تک اردو تو کیا انگریزی میں بھی کوئی مجلّہ اس سج دھج، ترتیب و تہذیب، حسن وخوبی اور اعلیٰ ودلکش معیار وانداز میں فدوی کی نظر سے نہیں گزرا۔

سہ ماہی اجتہاد بلاشبہ حسن وخوبی کا مرقع ہے۔ اللہ پاک اس میں اسی طرح صحیح و راسخ دینی افکار ونظریات اور اصل روح اسلام کو بھی اجاگر فرمائیں، اگر مجلّہ ہٰذا کے حسن وخوبصورتی سے مسحور ومبہوت ہو کر ہم یہ کہہ اٹھیں کہ یہ واقعتاً ایک قابل تحسین ہی نہیں بلکہ قابل تقلید عمل ہے تو پھر شاید مجلّہ کی پہلی خصوصی اشاعت کی روح کے بھی منافی ہو کیونکہ یہ مشتمل ہی اجتہاد واجتہادی افکار پر ہے اور اجتہاد محض کسی ایک مخصوص شعبہ میں تبدیلی واتھل پتھل کا نام نہیں، بلکہ پوری حیاتِ انسانی پر محیط فکر وعمل کا نام ہے۔ حرکت وارتقاء میں اجتہاد بلاشبہ ایک کلیدی Tool کی حیثیت رکھتا ہے''۔

تنویر احمد بٹ، کراچی

- اجتہاد کا اجرا رپاکستان کے علمی اُفق پر ایک خوشگوار اضافہ ہے، مدت سے ایک ایسے جرائے کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جو مذہبی موضوعات پر آزادانہ غور وفکر کا پلیٹ فارم بن سکے، جو فقہی اور مسلکی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر معاشرے کے علمی ارتقاء میں ایک مثبت کردار ادا کرے۔

سرفراز احمد، فیصل آباد

فہرست مطبوعات

اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد
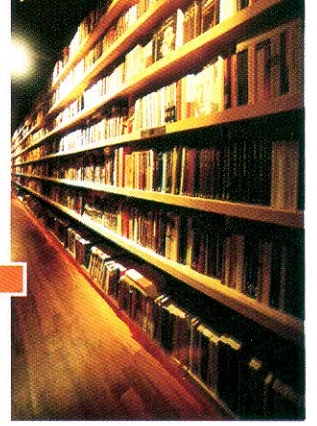
سالانہ رپورٹیں

	رپورٹ	سن طباعت
1.	دس سالہ رپورٹ ۱۹۶۲ء تا ۱۹۷۳ء	۱۹۹۲ء
2.	سہ سالہ رپورٹ ۱۹۷۴ء تا ۱۹۷۷ء	جولائی ۱۹۸۶ء
3.	سالانہ رپورٹ ۱۹۷۸-۱۹۷۷ء	فروری ۱۹۷۹ء
4.	سالانہ رپورٹ ۱۹۷۹-۱۹۷۸ء	جنوری ۱۹۸۰ء
5.	سالانہ رپورٹ ۱۹۸۱-۱۹۸۰ء	مئی ۱۹۸۱ء
6.	سالانہ رپورٹ ۱۹۸۲-۱۹۸۱ء	ستمبر ۱۹۸۳ء
7.	سالانہ رپورٹ ۱۹۸۳-۱۹۸۲ء	ستمبر ۱۹۸۳ء
8.	سالانہ رپورٹ ۱۹۸۴-۱۹۸۳ء	مئی ۱۹۸۴ء
9.	سالانہ رپورٹ ۱۹۸۷-۱۹۸۶ء	۱۹۸۸ء
10.	سالانہ رپورٹ ۱۹۸۸-۱۹۸۷ء	جون ۱۹۸۸ء
11.	سالانہ رپورٹ ۱۹۸۹-۱۹۸۸ء	مئی ۱۹۸۹ء
12.	سالانہ رپورٹ ۱۹۹۱-۱۹۹۰ء	مئی ۱۹۹۱ء
13.	سالانہ رپورٹ ۱۹۹۲-۱۹۹۱ء	مارچ ۱۹۹۲ء
14.	سالانہ رپورٹ ۱۹۹۳-۱۹۹۲ء	۱۹۹۳ء
15.	سالانہ رپورٹ ۱۹۹۸-۱۹۹۷ء	جون ۲۰۰۰ء
16.	سالانہ رپورٹ ۱۹۹۹-۱۹۹۸ء	جون ۲۰۰۰ء
17.	سالانہ رپورٹ ۲۰۰۰-۱۹۹۹ء	مئی ۲۰۰۰ء
18.	سالانہ رپورٹ ۲۰۰۱-۲۰۰۰ء	اکتوبر ۲۰۰۲ء
19.	سالانہ رپورٹ ۲۰۰۲-۲۰۰۱ء	جولائی ۲۰۰۳ء
20.	سالانہ رپورٹ ۲۰۰۳-۲۰۰۲ء	اگست ۲۰۰۳ء
21.	سالانہ رپورٹ ۲۰۰۴-۲۰۰۳ء	جولائی ۲۰۰۵ء
22.	سالانہ رپورٹ ۲۰۰۵-۲۰۰۴ء	فروری ۲۰۰۶ء
23.	سالانہ رپورٹ (سمری) ۲۰۰۵-۲۰۰۴ء	مارچ ۲۰۰۶ء
24.	سالانہ رپورٹ ۲۰۰۶-۲۰۰۵ء	مارچ ۲۰۰۷ء
25.	سالانہ رپورٹ ۲۰۰۷-۲۰۰۶ء	دسمبر ۲۰۰۷ء

قوانین کی اسلامی تشکیل کے بارے میں رپورٹیں

	رپورٹ	سن طباعت
26.	احکام اسلام	مئی ۱۹۸۴ء
27.	اسلامی نظام عدل	فروری ۱۹۸۴ء
28.	اسلامی نظام حکومت	جون ۱۹۸۳ء
29.	رپورٹ آئینی اصلاحات	دسمبر ۱۹۹۱ء
30.	مسودہ اسلامی قانون شہادت ۱۹۸۲ء	اگست ۱۹۸۲ء
31.	رپورٹ بابت قانون شہادت ۱۸۷۲ء	جنوری ۱۹۸۲ء
32.	Islamic Criminal Laws (Part-1) (Hudood)	اپریل ۱۹۸۲ء
33.	Draft Law of Pre-emption	مئی ۱۹۸۱ء
34.	Draft Law of Qisas and Diyat	جون ۱۹۸۱ء
35.	Islamization in Pakistan	مئی ۱۹۸۴ء
36.	Three Shariah Draft Laws 1988	مئی ۱۹۸۹ء
37.	1st Report on Islamization of Laws (Vol.I)	دسمبر ۱۹۸۱ء
38.	2nd Report on Islamization of laws (Vol.II)	مارچ ۱۹۸۲ء
39.	3rd Report on Islamization of laws (Vol. III)	اپریل ۱۹۸۲ء
40.	4thReport on Islamization of laws (Vol. IV)	اپریل ۱۹۸۲ء
41.	5th Report on Islamization of laws (Vol. V)	جنوری ۱۹۸۳ء
42.	6th Report on Islamization of laws (Vol. VI)	فروری ۱۹۸۳ء
43.	7th Report on Islamization of laws (Vol.VII)	مارچ ۱۹۸۳ء
44.	8th Report on Islamization of laws (Vol.VIII)	جون ۱۹۸۳ء

45. 9th Report on Islamization of laws (Code of Criminal Procedure 1898) ستمبر۱۹۸۳ء

46. 10th Report on Islamization of laws (Muslim Family Laws) اپریل۱۹۸۳ء

47. and11th Report on Islamization of laws (Insurance Insurance Laws) مارچ۱۹۸۴ء

48. 12th Report on Islamization of laws (Fiscal System and Fiscal Laws) مارچ۱۹۸۴ء

49. 13th Report on Islamization of laws (Tax Laws) اپریل۱۹۸۴ء

50. 14th Report on Islamization of laws(Transfer of Act 1882 Contract Act 1872 Specific Relief Act Propety 1877) مئی۱۹۸۴ء

51. 15th Report on Islamization of laws مئی۱۹۸۴ء

52. فائنل رپورٹ (اردو) (۱۸۳۹ء تا ۱۴؍اگست ۱۹۷۳ء) نومبر۱۹۹۸ء

53. فائنل رپورٹ (انگریزی) دسمبر۱۹۹۶ء

54. جائزہ مجموعہ ضابطہ فوجداری، ۱۸۹۸ء۔ ملاحظات رمجوزہ ترامیم مئی۲۰۰۰ء

55. قوانین کی اسلامی تشکیل، سلسلہ دوم، جلد اول (قوانین ۱۵؍اگست ۱۹۷۳ء تا ۴؍جولائی ۱۹۷۷ء) مئی۲۰۰۰ء

56. رپورٹ جائزہ مجموعہ ضابطہ دیوانی، ۱۹۰۸ء۔ ملاحظات رمجوزہ ترامیم اگست۲۰۰۰ء

57. تطبیق الشریعة فی باکستان

58. مجلس الفکر الاسلامی بالباکستان (تقریر موجز عن اعماله) مارچ۱۹۸۰ء

59. مجلس الفکر الاسلامی بالباکستان (تعریف موجز باعماله) ۱۹۹۳ء

60. توصیات دستوریه، بخصوص نظام الحکومة ۱۹۸۳ء

61. قوانین کی اسلامی تشکیل، سلسلہ دوم، جلد چہارم (قوانین مجریہ ۱۲؍اکتوبر ۱۹۹۹ء تا ۳۱؍دسمبر ۲۰۰۲ء) اکتوبر۲۰۰۳ء

معیشت کی اسلامی تشکیل پر رپورٹیں

62. مجموعی سفارشات متعلقہ نظام معیشت (۹۳-۱۹۹۲ء) دسمبر۱۹۸۴ء

63. اسلامی نظام معیشت ستمبر۱۹۹۲ء

64. رپورٹ بلاسود بنکاری ۱۹۸۰ء

65. رپورٹ اسلامی نظام بیمہ جون۱۹۹۲ء

66. تقریر مجلس الفکر الاسلامی بشان الغاء الفائده من الاقتصاد ۱۹۸۲ء

67. Introduction of Zakat in Pakistan ۱۹۸۱ء

68. Elimination of Riba from the Economy and Islamic Modes of Financing جون۱۹۸۰ء

69. Islamic Insurance System جون۱۹۹۵ء

نظام تعلیم کے بارے میں سفارشات

70. رپورٹ تعلیمی سفارشات (۱۹۸۲ء تا ۱۹۹۳ء) جون۱۹۸۲ء

معاشرتی اصلاحات

71. رپورٹ معاشرتی اصلاحات فروری۱۹۹۳ء

72. رپورٹ خاندانی منصوبہ بندی مارچ۱۹۸۴ء

73. رپورٹ اسلامی معاشرے کی تشکیل جون۱۹۸۲ء

74. Report on Family Planning مارچ۱۹۸۴ء

ذرائع ابلاغ کی اصلاح کے بارے میں سفارشات

75. رپورٹ ذرائع ابلاغ عامہ جون۱۹۸۲ء

استفسارات (کے جوابات) پر رپورٹیں

76. رپورٹ استفسارات (۱۹۶۲ء تا ۱۹۸۹ء) مئی۱۹۸۴ء

77. رپورٹ استفسارات (۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۱ء) ستمبر۱۹۹۱ء

متفرق مطبوعات

78. اسلام اور دہشت گردی ۲۰۰۶ء

79. حدود آرڈیننس ۱۹۷۹ء فروری۲۰۰۶ء

80. آزادئ نسواں، عہد رسالت میں (ترجمہ) چار جلدیں جون۲۰۰۷ء

81. رسالہ اجتہاد (سہ ماہی): پہلا شمارہ جون۲۰۰۷ء

82. حدود و تعزیرات، اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کا جائزہ

تالیف: محمد عمار خان ناصر

حدود و تعزیرات
اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کا جائزہ
محمد عمار خان ناصر
اسلامی نظریاتی کونسل حکومت پاکستان
اسلام آباد
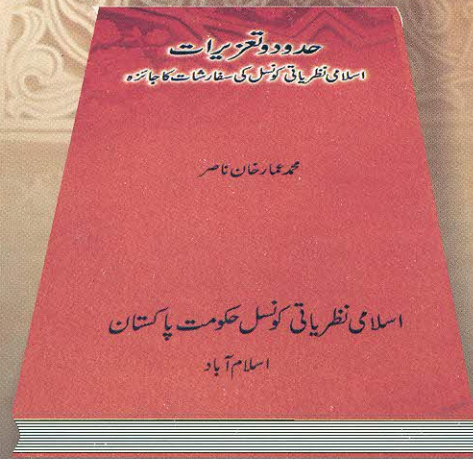
☆ اسلامی قانون میں زنا اور چوری کی انتہائی سزائیں کیا ہیں؟

☆ کیا زنا بالرضا اور زنا بالجبر (RAPE) دو الگ الگ جرم ہیں؟

☆ کیا قتل اور فساد فی الارض کے علاوہ کسی جرم میں موت کی سزا دی جا سکتی ہے؟

☆ کیا اسلامی قانون گواہی میں مسلم و غیر مسلم اور مرد و عورت میں تمیز کرتا ہے؟

☆ کیا حرابہ اور فساد فی الارض صرف ڈکیتی تک محدود ہیں؟

حدود و تعزیرات کے باب میں اُٹھنے والے اہم سوالات کا عالمانہ جائزہ

——— ناشر ———

اسلامی نظریاتی کونسل

سرورق

عالم اسلام اور مغرب کے درمیان آج ایک پل کی ضرورت ہے، باسفورس نہر پر واقع اس پل کی طرح جو یورپ اور ایشیا دوسرے لفظوں میں مغرب اور مشرق کو ایک دوسرے سے ملاتا ہے۔ باسفورس کے دونوں کناروں پر آباد ترکی کے شہر استنبول کی طرح آج اسلام کے ماننے والے مغرب میں بڑی تعداد میں موجود ہیں اور دیگر ادیان کے پیروکار ہمیں عالم اسلام میں بھی ملتے ہیں۔ دریاؤں اور نہروں پر بننے والے پل جغرافی اعتبار سے انسانوں کو ایک دوسرے سے قریب کرتے ہیں اور مکالمہ اولاد آدم کو نظری اور فکری اعتبار سے قریب لانے میں پل کا کردار ادا کرتا ہے۔ اجتہاد کا یہ شمارہ اسلام اور مغرب کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہوئے موضوع سے متعلق بہت سے سوالات کے جواب فراہم کرتا ہے۔ یہ عصر حاضر کی بہتر تفہیم اور انسانوں کے درمیان قرب پیدا کرنے کی ایک کوشش ہے۔